OSMANIA UNIVERSITY

ہند کے سیاسی مسلک کا نشو ونما

سلسلۂ نصابِ تاریخ علمیہ جامعۂ عثمانیہ

ہند کے سیاسی مسلک کا نشو و نما

(سنہ ۱۸۱۸ء تا سنہ ۱۸۵۸ء)

جی۔ انڈرسن اور ایم۔ صوبیدار کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ

از

محمد عبدالستار صاحب ایم۔ اے ایف۔ آر۔ ایس۔ اے (لندن)

(سابق صدر انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ)

رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکارِ عالی

سنہ ۱۳۵۷ھ م سنہ ۱۳۴۷ف م سنہ ۱۹۳۸ء

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکارِ عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب مسرز لانگمنس گرین اینڈ کمپنی کی
اجازت سے جن کو حقِ اشاعت حاصل ہے
اُردو میں ترجمہ کرکے طبع وشایع کی گئی ہے

ہند کے سیاسی مسلک کا نشوونما

فہرست مضامین

صفحہ

صفحہ

صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہند کے سیاسی مسلک کا نشو ونما

پہلا باب

ہند کے سیاسی مسلک کی تاسیس

۱۸۱۸ء میں مرہٹہ اور برطانوی فوجوں میں جب تک کہ طویل جنگ کا خاتمہ نہیں ہوا ہند کے سیاسی مسلک کے نشو ونما کا کوئی حقیقی موقع نہ تھا۔ اس وقت تک ہندوستان میں برطانیوں سے بیشتر یہ کام لیا جاتا تھا کہ بیرونی حملوں کے مقابلے میں وہ اپنے مقبوضات کی حفاظت کریں نیز باقاعدہ و باضابطہ حکومت قائم کریں جس کے بغیر کسی قسم کی ترقی ناممکن تھی۔ لیکن جنگ کرگی کے بعد امن و امان کا ایسا طویل دور جاری رہا کہ ہندوستان میں صدیوں تک اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا اور ۱۸۴۵ء میں سکھوں کی پہلی لڑائی کے چھڑنے تک اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ افغانستان، سندھ اور برما میں اس وقت لڑائیاں ہو رہی تھیں مگر ان سے ملک کی عام حالت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اسی زمانے میں برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان میں سیاسی مسلک کے قایم کرنے کی جانب توجہ کی جو نہ صرف اپنی ماہیت کے لحاظ سے عجیب و غریب امر تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ بہت سے ایسے آدمیوں کا کام تھا جن میں تدبّر اور علم و فضل کے جوہر موجود تھے۔ ان میں کام کرنے کی صلاحیت تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے قلم میں بھی زور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی سرکاری رُوداد یں غیر معمولی واقعات اور دانشمندانہ تجاویز سے لبریز ہیں۔ اتفاق سے اس وقت انگلستان میں ایسے مدبّر بھی موجود تھے جنھیں اصلاحات کی تجاویز پیش کرنے کی فکر لگی ہوئی تھی جو سالہا سال کی جنگ و جدل کے باعث مدّت سے ملتوی تھیں۔ دونوں ملکوں (یعنی انگلستان اور ہندوستان) کی تاریخی مشابہت کو مسٹر رومیش چندردت نے ذیل کے الفاظ میں نمایاں کیا ہے:۔

پُر امن ترقی کا دور* ماقبل کے کسی زمانے میں یورپ اور ہندوستان نے کبھی ایک پشت میں اتنی زیادہ حقیقی ترقی نہیں کی جتنی کہ جنگِ نپولین اور مرہٹوں کی آخری لڑائی کے بعد بیس سال میں رُو نما ہوئی۔

۱۸۲۲ء میں کیسل رے نے خود کو تباہ کیا۔ دارالعوام میں بہ حیثیتِ سردار اس کا جانشین بلند ہمت کیننگ ہوا جو ایک اعلیٰ مدبّر، قادر الکلام مقرر اور دل سے سچا لبرل (جدت پسند) تھا۔ لارڈ لیورپول[۱] کے تحت جو ابھی تک وزیر اعظم تھا دارالعوام کی قیادت پر کیننگ کے تقرر سے تاریخ انگلستان میں ایک جدید دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اُس حرّیت پسندی کا جو انگلستان میں پیدا ہو رہی تھی سرکاری طور پر پہلا اعتراف ہے۔ اصلاحات جو ایک مدت سے معرض التوا میں

---

* Source.—"England and India."

Romesh Chander Dutt.

(Chatto & Windus.

[۱] لارڈ لیورپول ۱۸۱۲ء سے ۱۸۲۷ء تک وزیر اعظم رہا مگر حقیقت میں اقتدار لارڈ کیسل رے کو حاصل تھا جو اپنی وفات تک دارالعوام میں اپنی جماعت کا سردار رہا۔

پڑی ہوئی تھیں جلد جلد نافذ ہونے لگیں۔ انگلستان کے وحشیانہ ضوابط فوجداری جن کی
رُو سے معمولی جرائم پر سزائے موت دی جاتی تھی بتدریج تبدیل کیے جا رہے تھے۔ اسی
طرح کے سخت قوانین جن کی بنا پر انگلستان کی مزدور پیشہ جماعتوں کی حیثیت غلاموں
کی سی تھی اور جن کے ذریعے وہ بآسانی اپنے آقاؤں کی محکوم بن گئی تھیں منسوخ
کر دیے گئے اور بہتر اجرت حاصل کرنے کے لیے مزدوروں کے اجتماع کی ممانعت
باقی نہ رہی۔ ادنیٰ ترین نہیں بلکہ آخری موضوع بحث کیتھولک فرقے کو غلامی سے نجات
دلانا تھا۔ اس فرقے کو ابھی تک دار العوام میں نشست نہیں دی گئی تھی اور نہ
تاج برطانیہ کے زیر حکومت اُسے اہم عہدے ہی حاصل تھے۔ کیننگ نے کیتھولک
فرقے کو تمام مجبوریوں سے بالکلیہ آزاد کرانے کے لیے شریفانہ سعی کی۔
مسودۂ قانون اصلاح (۱۸۳۲ء) کے سالہائے مابعد میں اصلاحات کے
نفاذ اور آزادانہ قانون سازی کا جوش وخروش پھیلا ہوا تھا۔ انگلستان میں تعلیمی حالت
پست تھی اور ۱۸۳۳ء میں آبادی کے ہر گیارہ بچوں میں سے صرف ایک مدرسے جاتا تھا۔
اس وقت قومی تعلیم کو ترقی دینے کے لیے حکومت نے تھوڑی سی رقم منظور کی۔ اسی
سال بچوں کو کارخانوں میں کام پر لگانے سے روکا گیا۔ وہ قواعد جن سے کاہل اور
پیشہ ور فقیروں کو بھیک مانگنے کی ترغیب ہوتی تھی اور جن کے باعث لوگ
حقیقی طور پر محنت ومشقت کی طرف رجوع نہیں ہوتے تھے ۱۸۳۴ء میں تبدیل ہو گئے۔
اخبار کے ہر پرچے پر چار پنس کا بھاری اور ناقابل برداشت محصول گھٹا کر صرف
ایک پینی کر دیا گیا اور اس طرح ۱۸۳۶ء میں اخبار نویسی سے متعلق قیود اٹھا دی
گئیں۔ ضوابط فوجداری کی مزید ترمیم بھی عمل میں آئی۔
اصلاحات کے اسی جوش وخروش سے نیز رعایا کی خوشحالی کو فروغ
دینے کی خواہش سے اس ترقی کے زمانے میں انگلستان اور ہندوستان کا سیاسی
مسلک ظہور پذیر ہوا۔ ہندوستان میں بھی اس وقت بلند پایہ اور فراخ حوصلہ
مدبر برسر حکومت تھے اور ان کے ساتھ انگلستان کے شریف اور آزاد خیال
مدبر جن کے ہاتھ میں حکومت انگلستان کی باگ تھی کام کر رہے تھے۔ تاریخ ہند
کو تاریخ انگلستان سے جدا کر کے پڑھنے کی کوشش کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی

چیز کے نتیجے کو بغیر اس کا سبب معلوم کیے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دونوں ملکوں کے حالات میں ایک ہی قوتِ عمل کار فرما تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کی رعایا کو حقوق عطا کرنا گویا انگلستان کے قانونِ اصلاح کا چربہ اتارنا تھا۔ کیننگ، گرے اور لارڈ جان رسل کی مانند منرو، الفنسٹن اور بنٹنک اصلاحات کے ولولے رکھتے تھے۔

اسی امن کے زمانے میں برطانوی حکمرانوں نے حکومت کو مفید بنانے کے دشوار کام کے ساتھ ساتھ سیاسی مسلک ہند کی تشکیل کی جانب بھی توجہ کی۔ اس دور میں بنٹنک، منرو، ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن اور مٹکاف کے سے مشہور لوگ تھے۔ ان لوگوں کے سامنے اس وقت ایسے لاکھوں انسانوں کے لیے اطمینان و سکون بہم پہنچانے کا اہم مسئلہ پیش تھا جو ان سے تقریباً ہر بات میں مختلف تھے اور ایسی معاشری رسوم و ملکی روایات کے تابع تھے جن کو ایک مغربی اکثر بے معنی اور بعض اوقات خارج از انسانیت سمجھتا تھا۔ انھوں نے مذہب اور معاشری نظام کے متعلق مغربی خیالات کے تسلط سے اقوام ہند میں انتشار پیدا کرنے کے تمام منصوبے یک لخت رد کر دیے یہاں تک کہ وہ تحفظ قانون و امن اور عام انتظام ملک میں بھی حزم و احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ کام کرنے لگے اور بے محل جدّت طرازی سے حتی الوسع محترز رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ایک ایسا نظام قایم کرنے کی کوشش کی جو ہندوستانی روایات سے بہت کم اختلاف رکھتا تھا اور جس کے تحت اہل ہند اپنی گزشتہ تاریخ کی روشنی میں نشو و نما پا کر ذاتی رسوم اور مذہبی اعتقادات کو بحال رکھ سکتے تھے۔ جس راستے پر ان لوگوں نے چلنے کا عزم کیا تھا وہ حقیقت میں خطرناک تھا۔ ایک طرف اندرونی بے اطمینانی کا اندیشہ تھا اور دوسری جانب لندن کی مجلس نظما یا کلکتے کے انگریز باشندوں کی لعن طعن کا خوف تھا۔ لیکن اس وقت کے برطانوی حکمران اس قسم کی مشکلات سے مرعوب نہ ہوئے اور انھوں نے اپنے نہایت بلند پایہ تدبّر کا ثبوت دیا۔ انھوں نے امن بھی برقرار رکھا، باضابطہ حکومت کا ممکن العمل نظام بھی قایم کر لیا، ملک کی

مادی ضروریات پر بھی توجہ کی اور ساتھ ہی ساتھ رعایا کے قدیم معاشری و مذہبی نظام کو بھی بحال رکھا۔ لیکن جو رسوم بدیہی طور پر ناشائستہ اور خلاف انسانیت تھیں ان کے استیصال کے لیے وہ پورے طور پر آمادہ ہو گئے۔ جب کبھی رعایا کی مرفہ الحالی معرض خطر میں ہوتی تو جرأت سے کام کرنے میں وہ پیچھے ہٹتے نہ کبھی اس عذر کی آڑ میں بزدلی سے پناہ لیتے کہ معاشری رسم و رواج میں مداخلت، برطانوی حکومت کی بقا کے لیے خطرناک ہے اور اس لیے قابل نفرین بھی۔ ان کے سیاسی مسلک کی نمایاں خصوصیات ایک طرف صبر و تحمل اور دوسری طرف ہمت و عزیمت تھیں۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ایک تیز فہم نقاد ایم چیلی نے اس سیاسی مسلک کی اصلیت کی تشریح اپنے مشاہدے کے موافق کی ہے اور سر جان میلکم نے اپنے زیردست اہل قلم ملازموں کو ہدایت کرتے ہوئے اس طریقے کا اظہار کیا ہے جس کے مطابق اس سیاسی مسلک کے بروئے عمل آنے کی اُسے توقع تھی اور مسٹر ہولٹ میکنزی نے مندرجِ ذیل اقتباس میں مسلک مذکور کے مقاصد کی توضیح کی ہے۔

ہند کے سیاسی مسلک کا مفہوم*

حکومت کو لازم ہے کہ یورپی تعصبات سے اپنے کو بری کرنے کی خواہش کے ساتھ طاقت بھی رکھے اور ملکی و انتظامی اصول جن کو وہ اب تک قبول کرتی رہی ہے غلط معلوم ہونے کی صورت میں ترک کر دے۔ اُسے عام تاویلوں کو رد کر کے غیر آزمودہ راہوں کی تلاش میں سیدھے راستے کو بھی چھوڑنے پر آمادہ رہنا چاہیے۔ نیز مقامی سیاسی مسلک کا اکثر یہ اقتضا ہوا کرتا ہے کہ حکومت دنیوی خداوند بننے کی خوش گوار روش یا سہل الحصول غرض ترک کر دے جس پر بیشمار لوگ آج کل اعتقاد رکھتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ مسلسل مداخلت کی

---

* Source.—(i) "Administrative Problems of British India."
M. Chailley.
(Macmillan & Co.)

عادت چھوڑ دے اور خواہ کتنی ہی مدت درکار کیوں نہ ہو اُس وقت کا انتظار کرے جب کہ وہ مناسب طریقے پر دخل دے سکے۔ جب لوگ کام کرتے رہیں اور واقعات رُونما ہوتے رہیں تب وہ خاموش اور بظاہر غیر متوجہ رہے، اپنے پر شبہہ کی نظر پڑنے کا موقع دے، نکتہ چینی برداشت کرے اور اُس ماں کی مانند جو اپنے شریر بچوں کو کبھی کبھی جھڑک دیتی ہے اپنے ہموطنوں کی بھی وہ وقتاً فوقتاً مخالفت کرتی رہے۔ حکومت کو جاننا چاہیے کہ قانون ناقص ہے لیکن اس علم کے باوجود وہ اس کی تبدیلی کے جذبے کو رُو کے، اُسے کچھ مدت تک ناقابل اعتماد اور نااہل عہدہ داروں کے ساتھ ہی نبھانا چاہیے۔ پھر بھی اُسے عدم مداخلت کو ایک مقررہ قاعدہ نہ بنا لینا چاہیے، ضروری تبدیلیوں کو بروئے کار لانے کا مناسب موقع ڈھونڈنا چاہیے۔ اُسے معلوم ہوگا کہ رعایا اپنی قدیم رسوم اور ادارات کے ساتھ بڑی وابستگی رکھتی ہے اور ہماری تہذیب و تمدن کو قابل کشش اور خوش گوار نہیں پاتی لہذا اس کی طرف آہستہ آہستہ صبر و سہولت کے ساتھ اسی کی روایتوں کو نتیجہ خیز بناتے ہوئے اُسے لے چلنا چاہیے۔ اُس کی آنکھیں جبر سے نہیں کھولی جا سکتیں، اُس کو بطورِ خود دیکھنے کی ترغیب دینی چاہیے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف انگریز ہی پہلے لوگ ہیں جنھوں نے اس قسم کے مقامی سیاسی مسلک کی ضرورت کو محسوس کیا ہے نہ میں یہ کہتا ہوں کہ انھوں نے اس خطرناک زمین پر قدم رکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے، اُن کی تاریخ غلطیوں سے پُر ہے لیکن انھوں نے اصول بھی قایم کیے ہیں اور ان پر عمل بھی کیا ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں مسلسل طور پر اور بہ حیثیتِ مجموعی ایک صدی سے زاید مدت تک مختلف اوقات میں وہ ایک خاص مقامی سیاسی مسلک پر جیسا کہ اس کا مفہوم میرے ذہن میں ہے عمل پیرا رہے ہیں۔

چوں کہ وہ خود امیر تھے اس لیے ہندوستان میں پہلے پہل اُن کے روابط نوابوں اور امیروں سے قایم ہوئے لیکن جتنا جتنا انہیں تجربہ

۱۔ جیسا کہ لارڈ بنٹنک نے رسمِ ستی کے انسداد میں کیا تھا۔

حاصل ہوتا گیا اور وہ ہندوستانی سوسائٹی کی تنظیم کو سمجھنے لگے وہ عام طور پر رعایا سے ملنے جلنے لگے۔ بہرحال اس نئے میل جول کے بعد انھوں نے اپنے پرانے روابط منقطع نہ کیے۔ ایسے موقعوں پر بھی جب کہ ہندوستانی فرماں رواان کے نزدیک ناکارہ ثابت ہوئے انہیں بحال رکھا گیا، اُن کی حفاظت کی گئی اور اکثر وہ ممالک انہیں واپس کیے گئے جو انھوں نے کھو دیے تھے۔ ان انگریزوں نے اُن دشمنوں سے بھی کام لیا جو حال میں مغلوب ہوئے تھے مثلاً برما میں شاہ تھیبا کے وزرا سے جدید برطانوی حکومت نے فایدہ اٹھایا اور ان میں سے جو لوگ ابھی تک زندہ ہیں وہ وظیفے پاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان سے مشورے طلب کیے جاتے ہیں۔

مذکورِ بالا سیاسی مسلک بار آور ہوا۔ بے شبہ اس کی سخت آزمائش ۱۸۵۷ء میں غدر کے وقت ہوئی تھی لیکن فوجی اور سیاسی غلطیاں اس واقعۂ ہائلہ کی تشریح کرتی ہیں اور اگرچہ انگریز اُس وقت مایوس ہو گئے تھے تاہم دسیول اور فوجی عہدہ داروں کو اپنے آدمیوں کے متعلق اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ انھوں نے ایک مرتبہ اور یہ رائے قایم کی کہ ہندوستانیوں کے دل ہاتھ میں لے لینا ممکنات سے ہے اور اس طرح اپنا سابق مسلک دوبارہ اختیار کیا۔ فی الحقیقت انھوں نے اس مسلک کو ایک عظیم تر رقبے پر جاری کر کے ترقی دی اور اسے زیادہ باقاعدہ اور مہر آمیز بنا دیا۔

ہند کے سیاسی مسلک کے طریقے*

تقریباً ایسے تمام اشخاص جو اپنے تجارب اور معلومات کی مدد سے مخصوص مسایل پر رائے زنی کرنے کے قابل ہیں اس امر سے اتفاق رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ہماری قوت کا انحصار اُن ہندوستانیوں کی رائے عامہ پر ہے

---

* Source —Sir J. Malcolm, "Instructions to Officers acting under his orders in Central India"
(W. K. Allen & Co. 1821.)

جن کے دلوں میں اپنے حکمرانوں کی طاقت و دانشمندی اور اعتماد و صداقت کی وقعت نسبتہً زیادہ ہے۔ اگر ہم ہندوستانیوں کی عادات، ادارات اور ان کے مذہب کا لحاظ کرتے رہینگے اور ان کے ساتھ اعتدال پسندی، نیک مزاجی اور مہربانی سے پیش آتے رہینگے تو ان کے اس اہم خیال میں اضافہ ہوتا رہیگا اور ہمارے ہر ایسے فعل سے اس میں کمی واقع ہوگی جو اُن کے اعتقادات یا توہمات کے خلاف ہو یا جس سے افراد یا کسی فرقے کے ساتھ ہماری غفلت یا بے اعتنائی ظاہر ہو یا یہ مترشح ہو کہ ہم میں وہ نخوت پیدا ہو گئی ہے جو عموماً فاتحین میں پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے ہم اُن اصول کو فراموش کر رہے ہیں جن کے ذریعے اس عظیم الشان سلطنت کا قیام عمل میں آیا ہے اور جن کی پابندی ہی سے وہ مامون و محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہماری کامیابی اور میانہ روی کی بدولت اُس بد انتظامی اور چیرہ دستی کے مقابلے میں جس کا اثر ہندوستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے پر ایک صدی سے زیادہ مدت تک رہا ہے برطانوی قوم کی شہرت اس وقت اس قدر بلند ہے کہ لوگوں نے اجنبی حکمرانوں کے تحت سلامتی و خوش حالی کی دھن میں حُب وطن کے جذبات کو فراموش کر دیا ہے لیکن یہ ایسے جذبات ہیں جن کا اس علم کے ساتھ ہی کہ اُن کا پیدا کرنا ہمارا فرض ہے اُبھر آنا اور بروئے عمل ہونا ناگزیر ہے۔ باشندگانِ ہند کو غیر ملکی آقاؤں کی مسلسل محکومیت میں رہنے کی ذلت کا معاوضہ اس احساس پیہم سے ملنا چاہیے کہ انہیں فوائد پہنچ رہے ہیں اور یہ محض اُن افراد کی متحدہ مساعی کے ذریعے ممکن ہے جو اعتماد و ذمہ داری کی خدمت پر اس لیے مامور ہوں کہ ایک ایسی حکومت کو ہر دل عزیز بنائیں جو اگرچہ قومی حکومت نہیں ہے لیکن اس کی بنیاد رواداری، انصاف اور حکمت کے اصول پر مضبوطی کے ساتھ رکھی گئی ہے۔ حکومت کے ہر کارکن کو چاہیے کہ مذکورِ بالا امور پر غور و فکر کرے اور اُن کو سمجھے۔ جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اُن کی رسموں اور زبانوں سے واقفیت حاصل کرنے پر اُسے قانع نہ رہنا چاہیے۔ اُسے ہماری حکومت کی بنیادوں کی جانب رجوع ہو کر اپنی تمام

مخصوص کارروائیوں کو (نیز اپنے طریقِ کار کو) باقاعدہ ترتیب دینا چاہیے اور اُن اصول کا احتیاط سے مشاہدہ کرنا چاہیے جن کے ذریعے حکومت قائم کی گئی ہے اور جو تنہا اس کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس معاملے کی اہمیت کے متعلق میں کوئی رائے اپنے اس یقینِ کامل کے اظہار سے بڑھ کر نہیں دے سکتا کہ ہر لائق عہدہ دار کے مقرر فرائض کی انجام دہی سے قطع نظر کوئی ذی رتبہ شخص ایسا نہیں ہے جو ظاہری و باطنی طور پر اپنی روزانہ زندگی کے کاروبار میں کچھ نہ کچھ نہ کرتا ہو اور اس کا یہ فعل جب اس کے محکوم حلقے کے خیالات کے ساتھ ساتھ سلطنت کے عام مفاد پر عمل کرنے لگتا ہے تب اُس حکومت کو جہاں وہ مامور ہے قوی بنانے یا کمزور کرنے میں غیر محسوس اثر رکھتا ہے۔

آپ سے معمولی امور کے انجام دینے کی درخواست نہیں کی جاتی ہے بلکہ یہ کہ آپ اختیارات رکھیں مگر شاذ و نادر ہی ان کا استعمال کریں، اُن خرابیوں کا مطالعہ کریں جو آپ کے خیال میں قابلِ اصلاح ہوں، تعصبات و توہمات سے متعلق غلطیوں پر خواہ وہ جرائم نہ ہوں نظر رکھیں اور بدانتظامی کی مصائب بھی پیشِ نظر رہیں۔ بایں ہمہ محترز رہیں کہ مبادا آپ اپنے محدود فرائض کے دائرے سے باہر اکر ملکی مفاد کو عظیم تر مضرت پہنچائیں اور غیر واجب تغیر اور جدید دستور کے ذریعے جس سے مقامی فلاح و بہبود کا امکان ہو عام ترقی کی دھیمی مگر یقینی رفتار میں رکاوٹ یا دقت پیدا کریں۔ کوئی شے آپ کو ان تمام باتوں پر ثابت قدم نہیں رکھ سکتی بجز اُن لگاتار کوششوں کے جن سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہو اور آپ کے دل و دماغ کو ہندوستان میں برطانوی طاقت کی نوعیت اور اُس سلطنت کی حیثیت پر جس پر یہ طاقت مسلط ہے غور و فکر کرنے کی عادت پڑے۔

سلطنتِ ہند جو اپنے تمام علاقوں اور حکومتوں کے ساتھ متعدد فرقوں اور قوموں پر مشتمل ہے (گو بطورِ استعارہ کیوں نہ ہو) درحقیقت ایک وسیع و قدیم عمارت کی مانند خیال کی جا سکتی ہے جس میں وضع داری و خوبصورتی تو ہے لیکن اس کے اکثر حصے شکستہ حالت میں ہیں اور کم و بیش سب ویران ہو گئے ہیں تاہم یہ ایک مکمل عمارت ہے اور اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے متصل ہیں،

اس کی بنیادیں مستحکم ہیں اور محرابیں عین چوٹی تک ایک دوسرے پر قایم ہیں۔ ہم اب اس کے مالک ہیں اور اگر ہماری یہ خواہش ہو کہ ہم اس میں اضافہ کریں اور اسے برقرار بھی رکھیں تو ہمیں اس کی وضع اور ساخت نیز اس کے ہر حصے کی خوبی اور خرابی سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی چاہیے اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا پتھر بھی نہ ہٹانا چاہیے جب تک کہ خالی شدہ جگہ کے پُر کرنے کے لیے کوئی دوسرا موزوں پتھر تیار نہ ہو ورنہ غفلت کے باعث ہم ایک ایسے ملک میں اپنے اور دوسرے کے سروں پر آفت ڈھا ئینگے جہاں ہمیں اپنی عظمت و شہرت کی یادگار قایم کرنے کی بیحد تمنا ہے۔

ہند کے سیاسی مسلک کے مقاصد*

اگر ہم کسی قوم کی تاریخ کے قریبی عہد پر انتقادی نظر ڈالیں تو میرا خیال ہے کہ ہم ملک کی دولت بڑھا سکتے ہیں یا اس کی بہتر تقسیم کر سکتے ہیں اور بالآخر حسب ذیل تدابیر میں سے چند یا تمام کے ذریعے بصورت ضرورت مالگزاری میں بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔

مالکان اراضی کے ذمے واجب الادا رقم کا بندوبست طویل مدت کے لیے اس طرح کیا جائے کہ محصول کے تعین سے سرکاری مالگزاری کے تناوبے کے علاوہ باقی زاید آمدنی مالگزاری ان کے حق میں ایک حوصلہ افزا ملکیت ثابت ہو اور یہ سب کچھ پیمائش زمین اور وثیقۂ تحریر کے ساتھ عمل میں آئے تاکہ بندوبست کی شرائط کے متعلق سارے شکوک رفع ہو جائیں۔ اہل یورپ اور ان کی اولاد کو بسانے کی کوشش کی جائے اور انہیں ترغیب دلائی جائے کہ وہ اپنی قوت قابلیت اور سرمائے کو زراعت میں صرف کریں۔ ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم اور تمدن کی تعلیم دی جائے۔

---

* Source.—Views of Holt Mackenzie in reply to questions from the Board of Control and reported to the House of Commons in 1832. Quoted in Calcutta Review, No. LVI.

ملازمت کے فواید میں ہندوستانیوں کا حصہ بڑھایا جائے۔ مسلسل مگر بتدریج
پرزور مساعی کے ذریعے ملک کے نظم ونسق کو زیادہ مقبول عام بنایا جائے۔
ملک کے اندر وسایل آمدورفت میں آسانیاں پیدا کرنے کی غرض سے معقول رقم
کفایت اور احتیاط سے خرچ کی جائے۔ ہندوستان میں یا انگلستان اور ہندوستان
کے مابین تمام غیر ضروری رکاوٹیں جو تجارت کے فروغ میں حایل ہوں
دور کی جائیں۔ ہندوستان میں سود کے قانون کو منسوخ کر کے تجارتی قانون کا
ایک عمدہ نظام عام طور پر جاری کیا جائے اور کاروبار عجلت کے ساتھ
کم مصارف میں طے پانے کے لیے عدالتیں قایم کی جائیں۔
خوبی کار کو پیش نظر رکھتے ہوئے افراد یا جماعتوں کا لحاظ کیے بغیر
عہدہ داروں کی تنخواہوں کا ان کے کام کی نوعیت کے مطابق تعین کیا جائے،
مزید برآں سیول حکومت میں انگلستان کے اقتدار اعلیٰ کو محفوظ و برقرار
رکھا جائے۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی کارکنوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور
انہیں معقول بھتہ (جو اہل یورپ کے مقابلے میں کم ہو) دیا جائے۔ بڑی بڑی تنخواہیں
پانے والے تمام یورپی عہدہ داروں کے اختیارات کو (جن میں جج، مجسٹریٹ
اور اضلاع کے کلکٹر سب کو شامل کرتا ہوں) اُن کارروائیوں تک محدود کیا جائے
جن میں ان کی مداخلت ناگزیر ہو۔ ایک یا دو غیر ملکی فرد کے بالکلیہ توسط سے
دس لاکھ مہذب انسانوں کے کاروبار چلانے کی کوشش کے لغو ہونے کا کافی
اعتراف کیا جائے اور اس اصول کو بروئے کار لایا جائے کہ ہمیں فی الواقع
سیول حکومت میں کامیابی اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہمیں
رعایا کی اعانت حاصل نہ ہو۔ اُن ملازموں کو جو عارضی طور پر انگلستان سے مستعار
لیے گئے ہیں ایسے تمام فرایض سے رفتہ رفتہ سبکدوش کیا جائے جن کی انجام وہی
انگلستان کے اقتدار اعلیٰ کے برقرار رکھنے کے لیے ضروری نہ سمجھی جاتی ہو۔ جماعتوں
کی بجائے افراد کا عام طور پر زیادہ تقرر کیا جائے۔ مقامی حکومتوں خاص کر صدر حکومت
کو اُن ذیلی امور کی ذمہ داری سے فوراً مستثنیٰ کیا جائے جن کو فی الحقیقت وہ کارآمد
طریقے پر انجام نہیں دے سکتی۔ سرکاری عہدہ داروں کی تمام جماعتوں کی جو

حقیقی ذمہ داریاں ہوں ان کی تشریح صاف طور پر کی جائے۔ سارے ہندوستان کے لیے ایک گورنر جنرل اور کونسل کا تقرر کیا جائے اور اس کے اختیارات و فرایض کی ایسی توضیح کی جائے جو درحقیقت اس کے شایان شان ہو نہ کہ برائے نام۔ تینوں احاطوں کی فوجوں کو باہم ضم کر کے ایک شخص کے تحت رکھا جائے اور اس متحدہ فوج کے نظم ونسق کو تاج برطانیہ کے حوالے کیا جائے۔ بمبئی کے بیڑے یا ہندوستانی بیڑے کی بجائے شاہی بیڑے کا ایک حصہ قایم کیا جائے۔ ہندوستانی حکومتوں کے مطلوبہ ذخیرے کی رسد کا بہتر انتظام کیا جائے۔ امور عام کے مصارف کی تنقیح زیادہ سختی سے کی جائے۔ مجلس نظما اور مجلس نگراں کے اختیارات کی علحدہ علحدہ مناسب توضیح کی جائے۔ ارباب اقتدار کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر طرح کی سرپرستی اٹھادی جائے۔

میرے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے فوجی امور میں توپ خانے کے قیام اور دیگر قومی انتظامات کے ذریعے جو انگلستان کے اکثر محکموں میں ضروری تصور کیے جاتے ہیں کفایتی اغراض کو وسیع کیا جاسکتا ہے۔ جزیرۂ لنکا میرے خیال میں حکومت ہند کا جزو ہونا چاہیے۔ سینٹ ہیلینا ایک قومی علاقہ تصور کیا جائے اور جو محاصل ہمارے قومی اقتدار اعلیٰ کی بدولت ہندوستان کی رعایا سے لیے جاتے ہیں اُن کا تعلق بے شبہ انگلستان کے محاصل ملکی سے سمجھنا چاہیے تاکہ ہمارے مصارف ملکی میں ہر بجٹ ایک قومی بجٹ اور ہماری ملکی دولت کا بیجا صَرف قوم کے سرمائے کا اتلاف خیال کیا جاسکے۔

اس زمانے کے تمام برطانوی حکمرانوں میں شاید ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن ہی ایک ایسا شخص تھا جو سیاسی مسلک کے تصور کو جس کی تشریح ایم چیلی نے اُوپر کی ہے قبول کرنے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھا۔ زمانۂ حال کے باشندگان ہند اُسے اپنے دوسرے برطانوی حکمرانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مہرآمیز احساسات کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام محرر ملازموں کی طرح وہ بھی بہت نوعمری میں ہندوستان آیا تھا۔ اس کی ملازمت کے ابتدائی سال ناگپور اور پونا کی سفارت کے دشوار کام میں ایسے وقت بسر ہوئے

تھے جب کہ مرہٹوں کی متحدہ حکومت کا آخری پرآز واقعات دور تھا اور اس سے بڑھ کر میدان جنگ کے دل سوز فرائض کی انجام دہی در پیش تھی۔ آرتھر ولزلی کے اسٹاف کی جانب سے بہ حیثیت مترجم جب وہ جنگ آسیائی میں شریک تھا تو اس کے سردار نے یہ کہا تھا کہ "تم نے اپنے پیشے کا غلط انتخاب کیا ہے، تمہیں ایک سپاہی بننا چاہیے تھا" پونا کے رزیڈنٹ کی حیثیت سے وہ ایسے تشویش انگیز زمانے میں کارفرما رہا جو پیشوا کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہوا۔ فی الحقیقت وہ ایسے نازک موقعوں پر بھی جب کہ اس کی جان سخت ترین خطرے میں پڑ جاتی تھی حتی الوسع آخر لمحے تک اپنی جگہ پر قایم رہتا اور کرکی کی برطانوی فوج میں شریک ہونے کے لیے جب سوار ہو کر چلا جا رہا تھا تو پلٹ کر کیا دیکھتا ہے کہ رزیڈنسی کی عمارت سے جیسے اس کے نکلتے ہی آگ لگا دی گئی تھی شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ جنگ میں بھی اس نے عملی طور پر انتہائی چالاکی اور بہادری کا اظہار کیا اور جو فتح بعد کو نصیب ہوئی اس کے حصول میں بڑی حد تک اسی کا ہاتھ تھا۔ دارالعوام میں کیننگ نے اس کے دلیرانہ کرتب کی ذیل کے الفاظ میں تعریف کی:۔

"مسٹر الفنسٹن نے (جس کا نام مشرق کی سیاست اور ادب میں ممتاز درجہ رکھتا ہے) ایک صبر آزما موقع پر فن حرب میں ایسی شجاعت و مہارت کا اظہار کیا جو اگرچہ قابلیت و معاملہ فہمی کے اہم جزو ہیں تاہم سیول ملازمت کے لیے ہم انہیں ضروری وصف نہیں قرار دے سکتے۔ صرف ایک ہی وقت نہیں بلکہ اس معرکہ عظیم کے دوران میں کئی موقعوں پر مسٹر الفنسٹن نے اپنے ہنر و کمال کے ایسے جوہر دکھائے جن کے ذریعے کسی ملک میں بھی جہاں سپہ سالار شہرت و فضیلت رکھتے ہیں وہ ایک اعلی سپہ سالار ہو سکتا تھا"

جنگ کے اختتام پر الفنسٹن، پونا کا کمشنر بن گیا اور ۱۸۱۹ء میں کیننگ نے اسے منرو اور میلکم پر ترجیح دے کر بمبئی کا گورنر مقرر کیا۔ یہ امر تعجب خیز ہو سکتا ہے کہ ہند کے دو فرقے سکھ اور مرہٹے جنھوں نے اپنے عروج کے زمانے میں برطانوی فوجوں کا نہایت سختی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا

شکست کھانے کے بعد بہت جلد سلطنت برطانیہ کے امن پسند شہری ہو گئے۔ برطانوی راج کو امن پسند طریقے سے سکھوں کے قبول کر لینے میں زیادہ تر سر ہنری لارنس کی سیاست دانی اور دانشمندی کا دخل تھا جس پر سابق جلد میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے اور جس تیزی اور بظاہر آسانی سے خوفناک گھاٹیوں اور ڈھلوان پہاڑوں والے ملک پر جہاں مرہٹوں کی جنگجو نسل آباد تھی برطانوی حکومت قایم ہو گئی اس میں خاص طور پر الفنسٹن کی شخصیت کا اثر تھا۔ آیندہ اقتباس میں جو مسٹر فاریسٹ کی تحریروں سے ماخوذ ہے اُن اصول کی تشریح کی جائیگی جو الفنسٹن کے سیاسی مسلک میں ایک ایسے مسئلے کے حل کرنے کے لیے رہنمائی کرتے رہے جس میں بہت زیادہ استقلال اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ اس امر کی شہادت کہ الفنسٹن بوقت ضرورت مستقل مزاج رہتا تھا ایک اور واقعے سے بھی ملتی ہے جس کا حوالہ مسٹر فاریسٹ ہی نے دیا ہے۔ جب پیشوا کی بحالی کے لیے چند برہمنوں نے سازش کا جال بچھایا تو الفنسٹن نے فوراً خود کو ایک سخت گیر شخص ثابت کر دکھایا اور اپنے حکم سے سرغنوں کو توپ کے منہ سے اڑا دیا۔ اس فعل کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھتے ہوئے گورنر بمبئی نے الفنسٹن کو مشورہ دیا کہ اُسے قانونی گرفت سے محفوظ رہنے کی درخواست کرنی چاہیے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "اگر میں نے غلطی کی ہے تو مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اگر میں حق بجانب ہوں تو قانونی گرفت کے متعلق مجھے کسی قسم کی درخواست کرنے کی ضرورت نہیں ہے"۔

الفنسٹن کی قدر و منزلت اس کے زیر حکومت ہندوستانیوں کے سپاس نامے سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے اس کی مراجعتِ وطن کے وقت اُسے پیش کیا تھا۔ مزید براں ہندوستانیوں نے بیس ہزار پونڈ چندہ دیا جو اس کی یادگار میں معلمیاں قایم کرنے کے کام آیا۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداءً دار البلدین اُن انگریز عالموں نے خطبے دیے جو اسی غرض سے ہندوستان بلائے گئے تھے لیکن بعد کو یہ سرمایہ ایک کالج کی امداد میں لگایا گیا جو آج تک الفنسٹن کے اسم گرامی سے موسوم ہے اور جہاں زمانۂ حال

کے بعض نہایت فاضل اور جمہور پسند ہندوستانیوں نے تعلیم پائی ہے۔ اس سے زیادہ موزوں یادگار ایک دور بین مدبر کے اعزاز میں جس نے ہندوستان پر حکومت کی قائم نہیں ہوسکتی تھی۔

ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن اور اس کا سیاسی مسلک*

گزشتہ شاندار اور پیچیدہ جنگ کے دوران میں جو غیر معمولی جوش وخروش اور ہنر وکمال تحمینی کے بہت سے اہل قلم اور فوجی ملازموں کی جانب سے ظاہر ہوا اور جو عجیب و غریب صورت حال اس جنگ کے نتائج سے آپ کے احاطۂ بمبئی کے معاملات میں پیدا ہوگئی ہے اس سے میرے نزدیک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عام قاعدے[1] سے انحراف کرکے آپ ہی کے ملازموں کو ترجیح دینا اس وقت مناسب اور قرین مصلحت ہوگا۔

مزید برآں یہ امر بھی میرے پیش نظر ہے کہ آپ کے ملازموں کی قدر افزائی زیادہ نمایاں ہوگی اگر حکومت انگلستان انھیں کے انتخاب سے اتفاق کرنے پر اپنی آمادگی کا اظہار پہلے ہی ایک اعلان کے ذریعہ کردے بشرطیکہ مجلس نظما ایسی تجویز کرنا نامناسب سمجھے۔

کسی ایک شخص کا نام اس قسم کے اعلان میں شامل کرلینے سے اس کے مقاصد کے غلط معنی لیے جانے کا اندیشہ باقی رہیگا لیکن اس کے ساتھ ہی کسی کا نام نہ لینے سے ہر شخص کی نامزدگی کے بارے میں اعتراض ہونے کا پورا پورا موقع برقرار رہیگا۔

وہ اصحاب[2] جن کے ناموں کا میں نے ذکر کیا ہے میرے ہی منتخب کردہ ہیں اور آپ کے زیر حکومت مختلف محکموں میں اور اس منظر کارزار میں جس کا ہم نے بہت ہی قریبی مشاہدہ کیا ہے اپنی قابلیت اور ذاتی جوہر کی بدولت

---

* Source.—(i) Letter from Mr. Canning to the Court of Directors. Dated September 21, 1818. (Parliamentary Papers.)

[1] اس موقع پر گورنر بمبئی کے تقرر کی ضرورت تھی۔

[2] ۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن، جان میلکم، تھامس منرو۔

مشہور ہیں۔ مجھے ان اصحاب کے انتخاب سے دوسروں کی اہانت مقصود نہیں ہے جن کے اعلیٰ وارفع اوصاف ان کے مقابلے میں بخوبی پیش ہو سکتے ہیں نیز میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان تینوں میں سے صرف ایک شخصیت ایسی ہے جس سے مجھے ذاتی واقفیت کا فخر حاصل ہے۔

آپ کے نزدیک ترجیح خواہ کسی کو ہو میرے لیے ہمیشہ یہ امر باعث اطمینان ہوگا کہ جن اصحاب کے نام میں نے خصوصیت کے ساتھ پیش کیے ہیں نہ صرف اُن کی لیاقت اور کارگزاری کے متعلق بلکہ آپ کے جملہ ملازموں کی عام قابلیت اور کردار کے بارے میں مجھے اپنے اعلیٰ ومنصفانہ خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔*

ایک حاکم کی حیثیت سے ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کی کامیابی کا خاکہ یہ سبب ہوا کہ وہ اس بات کو سمجھ گیا کہ سیاسی ادارات ومعاشری معمولات جو صدیوں سے قائم ہیں کلیتہً خالی از وصف نہیں ہو سکتے۔ ملک کے نظم ونسق میں اس کی بڑی کوشش یہ رہی کہ "عوام پر یہ روشن ہو جائے کہ انہیں کسی تبدیلی کا خیال دل میں نہ رکھنا چاہیے بجز اس کے کہ بہتر انتظام کی خاطر ان کے سابق قوانین میں کچھ رد و بدل ہوتا رہیگا۔" اس لئے محسوس کیا کہ لوگوں کے نہ صرف حقوق کا بلکہ ان کے تعصبات کا بھی احترام ہونا چاہیے۔ گورنر جنرل کو وہ لکھتا ہے کہ "بہرحال یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک انصاف پسند حکومت بھی منفعت بخش نہیں ہوگی اگر وہ رعایا کی خصائل وعادات کے خلاف ہو۔" ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن جانتا تھا کہ پردیسی حکومت ہمیشہ کٹھن ثابت ہوگی اور فاتح زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ کہ اس بات سے خبردار رہیں کہ جوے کا بوجھ تا حد امکان ہلکا رہے اور زخم بہت ہی کم واقع ہو۔ مارکوئیس آف ہیسٹنگز نے الفنسٹن کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ وہ ستارا کے راجہ کو ایک جاگیر دے یا کوئی چھوٹی سلطنت۔ الفنسٹن نے موخرالذکر صورت اختیار کی کیوں کہ اسے اس امر کی

*Source.—(ii) "Official Writings of Mountstuart Elphinstone." Edited by G.W. Forrest. (Richard Bentley & Son.)

اہمیت کا علم تھا کہ پیشوا کی رعایا میں سے کچھ لوگوں کے حق میں ایسی حکومت ہونی چاہیے جو اُن کے طریقوں کے مطابق اُن کی ممد و معاون ہو سکے ستارا پرراجہ کے دوبارہ برسر حکومت ہونے سے قدیم مرہٹہ سردار پیشوا کی جدید تر حکومت کو تباہی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک حد تک متحد ہو گئے۔ انگریزوں کی آیندہ جو لڑائی ہوئی وہ سیواجی کے خاندان کے خلاف نہ تھی البتہ وہ ایک بااثر حاجب سے جنگ آزما تھے۔ اگرچہ اکثر قدیم گھرانوں نے (جن کا طرز عمل شوکت نمائی کی خاطر بطور یادگار درج رہنا چاہیے) اپنے شکست خوردہ شہزادے کی مصیبت میں ہاتھ بٹانے کا قصد کیا لیکن کثیر تعداد نے فاتحین کے ساتھ وفا شعاری کا اظہار کیا۔ ان قدیم خاندانوں کو تباہی سے بچانا اور ان کے اثر و رسوخ کو بحال رکھنا مسٹر الفنسٹن نے اپنا فرض اولین سمجھا۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اسلامی حکومت کے سرداروں کی طرح دکن کے اُمرا، عوام کے نزدیک اجنبی نہیں ہیں بلکہ وہ اُن کے ہم قوم اور ہم مذہب ہیں اور انھیں کی نسل سے ہیں جو اپنی مختاری کے زمانے سے ان کے سردار رہ چکے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں مقامی شہزادوں کی جگہ اپنے نمایندے مقرر کر کے اور ملکی آئین و تنظیم کی بجائے اپنے قوانین نافذ کر کے کبھی پوری کامیابی حاصل نہیں کی، اس لیے اُس نے حتی الوسع اُس کام سے بچنے کی کوشش کی جس میں مسلمانوں کو ناکامی ہو چکی تھی۔

انسداد بغاوت کے ساتھ ساتھ مالگزاری کا بندوبست بھی ہو گیا۔ نافذ شدہ قانون اراضی فی نفسہٖ نانا فرنویس کے نظام کی ابو وتی تجویز سے مختلف نہیں تھا جس کے ذریعے سرکاری گماشتے رعایا سے بلاواسطہ معاملہ کرتے تھے۔ طریق رعیت واری کی خوبی یہ ہے کہ اس کی بدولت ہم رعیت سے اور رعیت ہم سے واقفیت حاصل کر سکتی ہے۔ باجی راؤ کے طریق اجارہ داری کی تنسیخ سے جس کی رُو سے اضلاع ٹھیکہ داروں کو پٹے پر دیے جاتے تھے بہت سی شکایتیں دور ہو گئیں۔ مسٹر الفنسٹن نے یہ محسوس کیا کہ ہر انقلاب کے ساتھ نئی نئی چیزوں کا ہونا بھی ضروری ہے اور اس نے ان کی تعداد ممکن حد تک گھٹانے کی کوشش کی۔

اس نے کلکٹروں کو حکم دیا کہ اُن قواعد کی پابندی کے سوا جو مسلّم سمجھے جائیں کسی اور دستور العمل کو سرکاری کاروبار کے اجرا میں دخل نہ ہو اور حتی المقدور اس سعی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا کہ عوام کے احساس باطنی میں وہی روح پیدا ہو جائے جس نے کسی وقت ان دیہاتی جماعتوں اور قدیم اداروں میں جان ڈال دی تھی جو ایک مدت دراز سے قایم ہیں اور جنہیں صدیوں کی لگاتار جفاکاریاں اور بداعمالیاں پوری طرح معدوم نہیں کرسکی ہیں۔ اس نے دیہات کے حکام کے ناموس و وقار کی حفاظت کی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان اور اس کے دیہاتوں اور باشندوں پر حقیقی حکمرانی کرنا ایک اجنبی حکومت کے لیے بڑا کٹھن کام ہے اور یہ مقامی حکومت اور ہندوستانی حکام ہی کے ذریعے انجام پاسکتا ہے۔ مسٹر الفنسٹن عدل گستری کے اس اہم معاملے کی نسبت انگریزی تنظیم کے نفاذ اور انگریز حکام کے تقرر میں عجلت کرنے سے باز رہا کیونکہ عوام کے متعلق اس کے علم و تجربے نے یہ اس کے ذہن نشین کر دیا تھا کہ معاشری حالت اور تمدن کے لحاظ سے جس کا ہند کے لاکھوں باشندوں سے تعلق ہے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ انتظام معدلت میں آسانی، ارزانی اور شتاب کاری ہو۔ ہندوستانی حکومت میں عدل و انصاف کا خاص آلۂ کار پنچایت، یعنی دیہات کے بزرگ افراد کی جماعت ہے۔ اس قدیم جماعت کے جہاں کئی نقایص ہیں وہاں اس کے بہت سے فوائد بھی ہیں۔ الفنسٹن لکھتا ہے: "چوں کہ اس جماعت کے ارکان اکثر مقدمات اور فریقین کے مختلف حالات سے ذاتی طور پر واقف ہوتے ہیں اس لیے ان کے فیصلے بیشتر صحیح ہونے چاہئیں، اور اس طریق تحقیقات کا ایک بہت بڑا فایدہ یہ بھی ہے کہ جو جج، عوام کے گروہ سے منتخب ہوتے ہیں وہ ایسے اصول پر کاربند نہیں ہوسکتے جو عام فہم نہ ہوں، یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو قانون کی پیچیدگی و بے اطمینانی کا سد باب کر کے مقدمہ بازی کی بیخ کنی کرتی ہے۔" مسٹر الفنسٹن کا خیال تھا کہ ملکی طریقے کو مٹانا فاتحوں کا نصب العین نہ ہونا چاہیے بلکہ انہیں ایسے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جو مذکورہ طریقے کی خرابیوں کو دور کر کے اس کی قوت کو از سر نو تازگی بخشیں۔

۱۸۲۹ء میں احاطۂ بمبئی کے مقامی باشندوں وغیرہ نے مندرجِ ذیل سپاسنامہ مسٹر الفنسٹن کو اس کی مراجعت وطن کے وقت پیش کیا۔

*ہم بمبئی اس کے ذیلی علاقوں اور متحدہ عملداریوں کے مقامی شہزادے سردار، شریف زادے اور باشندے اپنے نہایت عمیق و دیرپا رنج و ملال کو جو اس احاطے کی حکومت سے آپ کے مستعفی ہونے پر ہمارے دلوں میں جاگزیں ہوگیا ہے ظاہر کرنے کی کوشش کیے بغیر خواہ وہ کیسی ہی کمزور کیوں نہ ہو اس ملک سے آپ کی قریبی مفارقت کا خیال نہیں کر سکتے کیونکہ دکن کی کمشنری اور بمبئی کی گورنری کی خدمت پر آپ کے فایز ہونے تک ہم پہلے کبھی اس قابل نہ ہوئے تھے کہ اس بے بہا فایدہ رسانی کی صحیح طور پر قدر دانی کریں جس کا لغوذ سارے ہندوستان میں برطانوی مملکت کی بدولت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آپ نے اپنی خوش خلقی، ہمت افزا طرزِ عمل اور بے تعصبی کے ساتھ ساتھ اس ملک کے باشندوں کی فلاح و بہبود اور مفاد کی طرف ہر وقت جو توجہ فرمائی، ان کے قدیم قوانین و رسوم کی جانب جو التفات کیا، ان کے درمیان دماغی و اخلاقی ترقی کے عمدہ موقعوں کو وسعت دینے کی جو پیہم کوشش کی اور آپ نے تمام جماعتوں کی دوامی بہتری کا اطمینان دلانے اور صحیح ترین اصول پر ان کی آسودگی کو بڑھانے میں اپنی جو مستند قابلیت صرف کی ان سب اوصاف نے جن کو ہم حیرت سے بہت طویل زمانے تک دیکھ چکے ہیں اور جن سے آپ کی خانگی و سرکاری زندگی کو چار چاند لگ گئے ہیں اس خیال کے قایم کرنے میں ہماری رہنمائی کی ہے کہ برطانوی حکومت کا اثر و غلبہ ایک بڑی بھاری اور منہ مانگی رحمت الٰہی ہے جو قادرِ مطلق ہمارے وطن کو عطا کر سکتا تھا۔

اس وقت جب کہ الفنسٹن ایسے حکمران ایک خاص سیاسی مسلک کی تشکیل میں مصروف تھے جس کا مقصد ماضی کی رسوم و روایات کی حفاظت کرنا

---

* Source.—(iii) "Official Writings of Mountstuart Elphinstone." Edited by G. W. Forrest, pp. 69-70 (Bentley & Son.)

اور بتدریج ارتقائے حیات کی نئی راہوں سے موانست پیدا کرنا تھا یہ امر لازمہ ہوگیا کہ اس سیاسی مسلک کے نشوونما میں خود اہل ہند اپنے حکمرانوں کے شریک کار ہونے پر راضی ہوں کیونکہ ان کی امداد کے بغیر اس قسم کا ہر مسلک خواہ کیسی ہی اعلیٰ حوصلگی کے ساتھ اس کا تصور کیا جائے قطعی ناکام رہیگا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس زمانے میں بلند ہمت ہندوستانیوں کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جماعت اُن فواید سے آگاہ تھی جن کا مغربی اقوام سے میل جول کے ذریعے حاصل ہونا ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ملک کی قدیم روایات پر شدت سے کاربند تھی۔ اس جماعت کے سردار راجہ رام موہن رائے تھے۔ شاید یہ عظیم ترین شخصیت تھی جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دور میں گزری ہے۔

راجہ رام موہن رائے ۱۷۷۴ء میں بمقام رادھانگر بنگال کے ایک قدیم معزز برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی اور عربی زبان میں عمدہ تعلیم حاصل کی۔ کم سنی کے زمانے میں انھوں نے ایک رسالہ جس میں ہندوؤں کے طریق بت پرستی کو قابل اعتراض ٹھیرایا تھا شایع کرکے اپنی آزادخیالی کا اظہار کیا۔ یہ واقعہ مضمون زیر بحث (بت پرستی) پر ان کے مشہور خیالات کے ساتھ مل کر ان کے اور ان کے والد کے درمیان سردمہری کا باعث ہوا۔ وہ کچھ مدت تک حکومت بنگال کے تحت ایک خدمت پر مامور رہے جہاں زمینداری کے حساب و کتاب اور اراضی کی پیمائش میں ان کی اعلیٰ مہارت بڑی قدر و قیمت رکھتی تھی لیکن اپنے ہم وطنوں کی ذہنی و اخلاقی ترقی کا خیال سرکاری دفتر کے غیر دلچسپ کام کی بہ نسبت اس نوجوان مصلح پر زیادہ اثرانداز ہوا۔ لہذا انھوں نے اپنی تمام قوت اپنے ملک کی خدمت کے لیے وقف کرنے کا تہیہ کرلیا۔

ابتدا میں راجہ رام موہن رائے ایک مذہبی مصلح اعظم تھے۔ وہ ایک مدت تک مشاہدہ کرچکے تھے کہ ہندو سوسائٹی میں ان کے نزدیک بہت سے عیوب ہیں۔ مذہب میں تکلفات کی بیجا کثرت، اس کا معاشری رسوم پر مضر اثر، علم و فضل کا زوال اور رعایا کا افلاس ان سب خرابیوں کی طرف انھوں نے توجہ کی۔ ان کا مقصد عظیم اپنے ہم وطنوں کے عقاید کو پاکیزہ بناکر بلند کرنا تھا۔ وہ برہمنوں کے اصلی مذہب سے

زیادہ اس کی تحریفی صورت کے مخالف تھے جو اُن تمام مقدس کتابوں کے اصول کی منافی تھی جن کی پیروی اور تعظیم کا سب ہندو دم بھرتے تھے۔ بایں وجہ انھوں نے ہندوؤں کو ترغیب دی کہ وہ اپنشدوں کے صاف و شفاف چشموں سے سیراب ہوں اور ویدوں کی تعلیم کا عقیدۂ وحدانیت اختیار کریں۔ نیز اپنے زمانے کے نوجوانوں کو دہریت کی مضرتوں سے بچانے اور تمام اخلاقی اصول کے قطعی انکار سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ سین فورڈ ارنالٹ لکھتا ہے کہ "انھوں نے ایک جماعت کے وجود پر جو کلکتہ میں قائم ہوئی تھی اظہار تاسف کیا۔ یہ جماعت ناعاقبت اندیش نوجوان اشخاص پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بعض ہوشیار بھی تھے جنھوں نے اپنے ملحد ہونے کا لفظ ملحد کے وسیع ترین معنی میں اعلان کیا تھا۔ راجہ رام موہن رائے کے بیان کے مطابق جماعت مذکور کچھ مشرقی ہند کے لوگوں اور کچھ ہندو نوجوانوں سے مرکب تھی جن کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ کسی قسم کی تلافی کے بغیر اپنے ذاتی عقاید کو رد کر دیں۔ ان کی اس حرکت کو انھوں نے متعصب ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ ذلیل خیال کیا اور اُن کے اصول کو اخلاق و آداب کے حق میں سم قاتل ٹھیرایا۔" راجہ رام موہن رائے نے اپنے مطلب کو زیادہ زور کے ساتھ عوام کے ذہن نشین کرنے کے لیے بنگالی زبان میں ویدوں کے خاص خاص ابواب کے ترجمے کیے جن میں سے ایک کا دیباچہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو اس مصلح اعظم کے خیالات کی توضیح و تشریح کا بہترین ذریعہ ہے۔

ہندومت کی اصلاح*

انسان کی جسمانی قوتیں محدود ہیں اور جب انہیں جدا جدا دیکھا جاتا ہے تو غیر اہم محسوس ہوتی ہیں اور اسی تناسب سے اخلاقی قوتوں کی جانچ کی جائے تو ہم انہیں قابل قدر پاتے ہیں کیونکہ یہ ایک وسیع دائرہ عمل پر محیط ہیں اور ان میں تقریباً غیر محدود ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر انسانی حیات کے مختصر دور کا

*Source.—"Introduction to a Translation of the Ishopanishad." Raja Ram Mohan Roy. (Panini Press.)

دنیا کے طویل زمانے سے اور جسمانی طاقت کی محدود وسعت کا اُن متعدد اشیا سے جن کی جانب اسے مبذول کرنے کی ضرورت پڑتی ہے مقابلہ کیا جائے تو خواہ مخواہ ہم اپنی اصل حقیقت کے بارے میں نہایت حقیر رائے قائم کرنے پر مایل ہوں گے اور ہمارے اطمینان خاطر کو برقرار رکھنے کے لیے شاید کوئی شے اس قدر موزوں نہیں سمجھی جاتی ہے جیسا کہ ہماری مفرط اخلاقی قوتوں کا تصور ہے جس کے دوش بدوش وہ اعلیٰ اور نیک مقاصد بھی ہیں جو مذکورہ قوتوں کو مناسب طریقے پر کام میں لانے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس کے برخلاف رنجشیں اور خجالتیں جلد یا دیر میں اُس شخص کی زندگی کا جزو ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں جسے اپنے ہم جنسوں کو فایدہ پہنچانے کے موقعوں سے بے اعتنائی برتنے کا احساس ہو۔ اس طرح کے خیالات نے مجھ پر یہ اثر کیا کہ میں (اگرچہ ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا اور اسی خاص فرقے کے عقاید کی مجھے عالم شباب میں تعلیم دی گئی) اپنے ہم وطنوں کی قابل افسوس غلطیوں کا پورا پورا اعتراف کر کے اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ ان کے دل و دماغ کی ترقی کے لیے ممکن حد تک ہر قسم کے ذرایع کام میں لاؤں اور ایک پاکیزہ تر آئین اخلاق کے علم کی جانب اُن کی رہنمائی کروں مختلف فرقوں اور پیشوں کے ہندوؤں میں ہمیشہ رہنے سہنے سے میں اس تحقیر آمیز اوہام پرستی کا کثرت سے مشاہدہ کر چکا ہوں جس میں ان بچاروں کو ان کے خود غرض مشیروں نے مبتلا کر رکھا ہے جو قانون اور فہم عام کا مقابلہ کر کے انہیں محض بت پرستی کی طرف مایل کرنے میں خاطر خواہ کامیاب ہوئے ہیں اور جب ان لوگوں نے اخلاق کے اصلی جوہر کو ان کی نظر سے پوشیدہ رکھا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کی پرچھائیوں کی کمزور کشش ان کے سادہ تر قلوب میں ڈال دی ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ علمی اور اصولی حیثیت سے ہندومت کا جزو اعظم یہ قرار دیا جاتا ہے کہ ایک خاص قسم کی غذا اختیار کر لی جائے جس سے ذرا سا بھی انحراف (درانحالیکہ منحرف کا چلن وغیرہ اعتبارات سے عمدہ اور ناقابل گرفت ہو) نہ صرف سخت ترین لعن طعن کا باعث ہوتا ہے بلکہ اس کے رشتہ دار

اور احباب اُسے سوسائیٹی سے خارج کر کے فی الواقع سزا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اُسے وہ مصیبت برداشت کرنی پڑتی ہے جو عام طور پر مذہب سے علیحدگی کی مصیبت کہلاتی ہے۔

اس کے برعکس ہندو مت کے مذکورِ بالا رفیع الشان اصول کی شدید پابندی اس درجہ مقدس سمجھی جاتی ہے کہ اس سے ہر اخلاقی جرم کی تلافی متصور ہوتی ہے حتیٰ کہ اس کی خلاف ورزی کے الزامِ منسوب کے مقابلے میں بدترین جرائم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

قتل، سرقہ یا دروغ حلفی کا جرم باوجودیکہ عدالتی فیصلے کی بنا پر عاید کیا جاتا ہے اور جسے مذہب سے علیحدگی کی ترغیب کو بُعد کا تعلق ہے ہندوؤں کے نزدیک تذلیل و توہین کی کوئی خاص علامت نہیں خیال کیا جاتا۔

کسی برہمن کو ایک ادنیٰ تحفہ جو عموماً پرائسچت کہلاتا ہے پیش کرنا اور اس کے ساتھ ہی چند فضول رسوم ادا کرنا مذکورِ بالا تمام جرائم کا کافی کفارہ تصور کیا جاتا ہے اور مجرم کو فوراً ساری موقتی آفت نیز آئندہ پاداش کے ہر خوف و خطر سے نجات دے دی جاتی ہے۔

میں ان مذہبی حقایق پر بہت ہی درد بھرے دل سے سالہاسال تک غور و خوض کرتا رہا ہوں شدید ترین تاسفانہ جذبات کے ساتھ میں ہمیشہ اُس غیر متزلزل دلچسپی کے متعلق سوچ بچار میں پڑا رہا ہوں جو مضرت رساں طوقِ اصنام پرستی نے میرے ہموطنوں میں پیدا کر دی ہے جن کا کام اپنے فرضی دیوتاؤں کو راضی رکھنے کی خاطر ہر انسانی و اجتماعی جذبہ مٹا لینے کے لیے لوگوں کو اُکسانا ہے۔ ان کا یہ فعل مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ زیادہ تر ان خوفناک امور میں جہاں مقدس مذہبی رسوم کی پیروی کے دھوکے میں خود کی تباہی ہوتی ہے اور قریب ترین رشتہ داروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے شدید ترین تاسفانہ جذبات کے ساتھ ان رواجوں پر غور کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا ہے اور ان میں ایک ایسی قوم

کے اخلاقی زوال کا مشاہدہ کیا ہے جو میری دانست میں یقیناً بہتر افعال کی استعداد رکھتی ہے اور اس کے ضبط و تحمل، صبر و شکیب اور نرم دلی کے اوصاف اُسے اعلیٰ تر مقسوم کا اہل بنا سکتے ہیں۔ غرض اس قسم کے احساسات نے مجھے اس قوم کے افراد کے سامنے ان کی مقدس کتابوں (ویدوں) کے بعض حصوں کے صحیح ترجمے پیش کرنے پر آمادہ کیا جو نہ صرف واحد خدا کی بصیرت افروز عبادت کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ پاکیزہ اصول اخلاق کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ ان میں وہ شہادات بھی شامل ہیں جنہیں میں نے اُن دلایل کے مقابلے میں ضروری سمجھا جو برہمنوں نے اپنے مقبول رواج کے تحفظ کے لیے پیش کی ہیں۔ نہایت صدقِ دل و تمنا کے ساتھ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ سارے ترجمے عام ہندوؤں کے قلوب میں محض ذات برتر و بزرگ کی عبادت اور اس سے عقیدت کی معقولیت کا یقین پیدا کرنے میں بہ عجلت یا بہ تاخیر کارگر ثابت ہوں، نیز انہیں اس شاندار و ہمہ گیر اخلاقی اصول کو کہ "تم دوسروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو جیسا کہ تم ان کا اپنے ساتھ چاہتے ہو" پوری طرح سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب ہو۔

یہ لازمی امر تھا کہ رام موہن رائے کے گرد ایسے بلند خیال نوجوان لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو جائے جو وحشت و ظلمت کے اندر جس میں ان کی جانیں مبتلا ہو گئی تھیں روشنی کا راستہ ٹٹول رہے تھے۔ ۲۰ اگست ۱۸۲۸ء کو وہ برہمو سبھا کا افتتاح کرنے کے قابل ہوئے جس کو جلد برہمو سماج کی شکل دے دی گئی۔ اس کے دو سال بعد عام پوجا پاٹ کی رسموں کے لیے ایک عمارت مختص ہو گئی۔ مس کولٹ لکھتی ہے کہ "یہ پیش خیمہ تھا اُس مذہبی اصلاح کی تحریک کی کامیابی کا جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور جو اب تقریباً استحکام حاصل کر چکی ہے۔ اُن کی قایم کردہ سوسائٹی حقیر اشیاء کا کوئی غیر محسوس مجموعہ نہیں ظاہر کر رہی تھی بلکہ وہ ایک حقیقی پرستش گاہ بن گئی تھی۔ ابتدائی و آزمایشی مسلسل تجربوں کے بعد خواب و خیال اور امید و بیم کی منزلوں سے نکل کر وہ مجسم مادی شکل میں آ چکی تھی۔"

دوارکاناتھ ٹیگور نے سب سے پہلے اس نئے مندر کے کام میں اپنے

قدیم دوست و آقا کی اہانت کی۔ اس کے بانی کی وفات کے بعد ڈبندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر سین نے اسے جاری رکھا۔ برہمو سماج جس کی بنیاد اس طرح پڑی تھی ہندوستان میں اصلاح تمدن اور نزہت عقاید کا ایک زبردست ترین وسیلہ بن گئی۔ اس سماج نے انتشار قومیت کے خطرے کو جو معتقدات غیر کی پابندی کے باعث ظاہر ہوا کرتا تھا دور کر دیا نیز الحاد و کمزوری اخلاق سے نوجوانان وقت کو بچا لیا۔ اسی برہمو سماج نے اہل علم، ماہر موسیقی، صناع اور ماہر سائنس پیدا کیے جنھوں نے ہندوستان کی مذہبی سرگرمیوں میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔

پہلی برہمو سماج کے عبادت خانے کا وقف نامہ*

متولی، مذکورِ بالا عمارت، کے ساتھ مملوکہ و مقبوضہ زمینوں، احاطوں اور ان کے قریبی علاقوں کو بلا تفریق مذہب و ملت جمیع اوضاع و اطوار کے لوگوں کو جو باقاعدہ پرہیزگار اور عبادت گزار رہنے کا اقرار کریں استعمال کرنے، ان پر متصرف ہونے، ان سے استفادہ کرنے اور انہیں خاص اغراض کے لیے مخصوص کرنے اور عام جلسوں کے کاموں میں لانے کی ہر وقت اجازت دینگے۔

غیر متغیر، ناقابل تلاش اور لایزال ہستی کی جو خلاق و محافظ عالم ہے مقاماتِ مذکورہ پر پرستش و عبادت ہو سکے گی۔ اس کے سوا کسی اور نام، لقب یا خطاب، خاص دیوتا یا دیوتاؤں کے ساتھ کوئی شخص یا جماعت انہیں منسوب کرنے یا استعمال کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

اور یہ کہ عبادت خانے کے مکانات پائیں میں یا اس کی عمارت، اراضی، ملکیت مقبوضہ، میراث اور حدود متعلقہ کے اندر بت، مورت، تصویر یا مجسمے کا قیام یا سنگ تراشی، چوب کاری، نقاشی اور اسی نوع کا ہر فعل ممنوع ہے۔ اور یہ کہ وہاں قربانی کرنے، بھینٹ چڑھانے یا کسی قسم کی نذر و نیاز پیش کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی جا سکتی اور یہ کہ مکانات، پائیں، عمارت،

---

* Source.—"Life and Letters of Raja Ram Mohan Roy." S. D. Collet and Harold Collet. (Bucklersbury.)

اراضیٔ ملکیت مقبوضہ اور حدود متعلقہ سے متصل یا ان کے اندر کسی جانور یا زندہ مخلوق کو مذہبی رسوم ادا کرنے کے لیے یا غذا کی خاطر ذبح یا قتل نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ کہ ان مقامات کے اندر یا ان سے متصل اکل وشرب کی (بجز اس صورت کے جبکہ کسی واقعۂ ناگہانی کے باعث جان کی حفاظت ضروری سمجھی جائے) ضیافت یا رسوم وطعام کی اجازت نہیں ہے۔

اور یہ کہ مذکورہ عبادت یا پرستش کے دوران میں تلقین دین، حمد گوئی، بھجن یا اور قسم کی پوجا پاٹ کے وقت جو محول بالا مکانات یا عمارات میں انجام پائے یا عمل میں آئے ایسی ذی روح یا غیر ذی روح شے کے متعلق جو کسی شخص یا جماعت کے نزدیک قابل عبادت رہ چکی ہے یا اب ہے یا آئندہ ہونے والی یا تسلیم کی جانے والی ہو بُرا بھلا کہنا یا ذلت وحقارت کے ساتھ ذکر کرنا یا اشارہ وکنایہ سے کام لینا جائز نہیں ہے۔

اور یہ کہ اس قسم کی عبادت میں وعظ ونصیحت ہو نہ قیل وقال، مناجات یا بھجن کو عمل میں لایا جائے بجز اس کے جبکہ ان امور سے خلاق ومحافظ عالم کے ارتقائے تصور کے ساتھ زکوٰۃ وخیرات، اخلاق وپارسائی، خیر سگالی ونیکی میں نیز مختلف المذاہب ومختلف العقاید لوگوں کے درمیان رشتۂ اتحاد کی مضبوطی میں ترقی مقصود ہو۔

نیز یہ کہ کوئی شخص جو نیک نام اور اپنے علم وفضل، زہد وتقویٰ اور اخلاق وعادات میں مشہور ہو متولیانِ مذکور کی جانب سے بہ حیثیتِ مہتمم مقیم اس غرض سے مامور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ عبادت گزاری اسی طریقے پر ہو رہی ہے جس کی اوپر تصریح وتوضیح کی گئی ہے اور اس قسم کی عبادت روزانہ یا کم از کم سات روز میں ایک مرتبہ انجام پا رہی ہے۔

مصلح مذہب کی حیثیت سے رام موہن رائے نے اپنے کام پر اکتفا نہیں کیا۔ ملکی آزادی کے لیے بھی ان کا جوش وخروش کچھ کم نہ تھا۔ ان کی ہمدردی بہت عام تھی اور وہ نیپلز و آئرلینڈ کے باشندوں کے معاملے کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مذہبی، معاشری اور ملکی اصلاحات لازم وملزوم تھیں۔

مذہبی اصلاح میں ان کی سرگرمی کا زیادہ تر سبب قومی جذبات و مقاصد کے متعلق مروج مذہبی خیالات کے بُرے اثرات کا پیدا ہونا تھا۔ ایک خانگی مراسلت مورخہ ۲۸ جنوری ۱۸۲۸ء میں وہ کہتے ہیں کہ

"مذہب کا موجودہ اصول جس پر ہندو کاربند ہیں ان کے ملکی مفاد کی ترقی کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ذات پات کی تفریق نے جس سے ان کے درمیان فرقوں کی تقسیم در تقسیم ہوگئی ہے حب وطن کے جذبات سے انہیں بالکل محروم کر دیا ہے اور مذہبی طریقوں اور رسموں کی کثرت کے ساتھ تزکیۂ نفس کی جگہ تبدیلیوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی مشکل کام کو اپنے سر لینے کی قطعی صلاحیت نہیں رکھتے ...... میرے خیال میں یہ امر ناگزیر ہے کہ کم از کم ملکی فلاح اور معاشری سکون و اطمینان کی غرض سے ان کے مذہب میں کوئی تغیر واقع ہو۔"

اوائل شباب کے زمانے میں موہن رائے نے یورپیوں سے میل جول شروع کر دیا اور ان کے آئین و طرز حکومت سے واقفیت حاصل کر لی۔ خود نوشتہ سوانح حیات میں وہ کہتے ہیں کہ "جب میں نے انہیں عام طور پر زیادہ ذہین اور روشن زندگی میں زیادہ مستقل مزاج اور معتدل پایا تو ان کے متعلق اپنی بدظنی ترک کر دی اور ان کی تائید پر اس خیال سے متاثر ہو کر مائل ہو گیا کہ ان کی حکومت اگرچہ غیروں کی غلامی ہے ہندوستانی باشندوں کو یقینی طور پر تیز تر رفتار کے ساتھ بہتری کی جانب کھینچ لے جائے گی۔" مسئلہ تعلیم پر ان کے خیالات کا ذکر باب مابعد میں کیا جائے گا۔ یہ خیالات وہی ہیں جو اس زمانے میں مفکر مذہب انگلستان کے مقلد اعظم کے تھے۔ بعض پادریوں کی سخت عداوت موہن رائے کو اس اشتراک عمل سے نہ روک سکی جو الکزینڈر ڈف کے ساتھ کلکتہ میں ایک انگریزی مدرسے کے افتتاح کی مساعی میں کیا گیا تھا۔ بنگال میں جو متعدد خدمات انھوں نے انجام دی ہیں ان میں ان کی بنگالی زبان کی قواعد بھی قابل ذکر ہے۔ ان کی تحریروں نے بنگالی کی سطح کو بلند کر کے اسے علمی زبان بنانے میں بہت کچھ مدد دی ہے۔ پس ماندہ عوام پر بھی ان کی بڑی دردمندانہ نظر تھی جس کا بدیہی ثبوت ان کی شہادت میں موجود ہے جو ۱۸۳۱ء میں مجلس منتخبہ کے روبرو دی گئی تھی۔ ان کے

برخلاف وہ اپنے ملک کے حکمرانوں پر جب کبھی موقع ملتا سختی سے نکتہ چینی کرتے۔ آزادی مطابع کے حقوق پر انھوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ بحث کی اور ۱۸۲۶ء کے قانون جیوری کی غیر مفید شرایط پر حرف گیری کی۔ انھوں نے اس اصول کی بھی تائید کی کہ حکومت کوئی اہم دستورالعمل نافذ کرنے کے قبل ہندوستانیوں سے مشورہ کرے۔

موہن رائے کی زندگی کے آخری تین سال انگلستان میں بسر ہوئے جہاں وہ مغل شہنشاہ اعظم کے معتبر نمایندے کی حیثیت سے گئے تھے۔ ۱۸۳۳ء میں وہیں وہ رحلت کر گئے اور برسٹل کے قریب وادی آرنو میں دفن کیے گئے۔

تاریخ میں موہن رائے کا درجہ*

ہمارا یہ فرض کرنا بجا ہے کہ موہن رائے کی عظیم الشان خدمات ہند کے پورے حالات اُس وقت مرتب ہوئے جب کہ وہ اس سرزمین سے رخصت ہوئے۔ ہندوؤں میں انھوں نے تحریک وحدانیت کا آغاز کیا تھا اور اسے مستقل علمی صورت دے دی تھی۔ انھوں نے مقدس کتابوں کا ایک ایسا نظم انتخاب کیا یا اس کا اظہار کیا تھا جو بشتر اپنی جگہ پر مخصوص تھا اور اسے آخرکار استحکام و قبول عام حاصل ہونے کا وہ مشاہدہ کر چکے تھے۔ تعلیم انگریزی کی جو تحریک انھوں نے دلیری کے ساتھ پیش کی تھی وہ اُس وقت سرکاری طور پر کامیاب ہونے کے قریب تھی اور رسم ستی کا انسداد تو وہ دیکھ ہی چکے تھے۔

لیکن مغربی ممالک میں رام موہن کی سہ سالہ خدمات سے ان کا کارنامۂ حیات، عزت و توقیر کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ وہ سب سے پہلے برہمن اور ممتاز ہندو تھے جنھوں نے سمندر عبور کر کے اُس بحری طلسم کو توڑ دیا جس میں صدیوں سے ہندوستان محصور تھا۔ ان کے سفر انگلستان کی اہمیت سرکاری طور پر کچھ کم اثر انداز نہ تھی کیونکہ اس ملک میں رام موہن رائے کی موجودگی

* Source.—"Life and Letters of Raja Ram Mohan Roy." S. D. Collet and Harold Collet. (Bucklersbury.)

نے انگریزوں کو اپنی مفتوحہ مشرقی قوم کی عظمت، تہذیب اور پارسائی سے جس کا انھیں پہلے کبھی علم نہ ہوا تھا آگاہی بخشی۔ بادشاہ کے دربار میں، جماعت مقننہ کے اجلاسوں میں، خاص خاص اشخاص کے حلقوں میں، فلسفیوں اور عالموں کے مجمعوں میں، مقرر مذہب انگلستان کے مقلدوں اور غیر مقلدوں کے جلسوں میں، متعدد مکانوں کی خلوت گاہوں میں اور لنکاشائر کے کاریگروں کے حیرت زدہ گروہوں کے روبرو رام موہن رائے کی شخصیت نے ہماری مشرقی سلطنت کا ایک جاذب نظر مجسم نمونہ پیش کیا۔ وہ انگلستان کا حال ہندوستان پر ظاہر کر چکے تھے اس لیے اب انھوں نے ہندوستان کو انگلستان پر واضح کر دیا۔

رام موہن رائے کا ورود ایسے وقت ہوا جب کہ سلطنت متحدہ (برطانیہ) کی سیاسی تاریخ کے قطعی تغیر کا زمانہ تھا۔ وہ شوق و ہمدردی کے ساتھ اس انقلاب عظیم کے تماشائی رہے جو مسودۂ قانون اصلاح اول کے ذریعے وقوع پذیر ہوا تھا۔ یہاں اپنے دوران قیام میں انھوں نے دیکھا کہ قانون کی رُو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی کاروبار سے الگ کر کے سیاسی ترکیب دی گئی تھی اور ان کے سامنے وہ قانون بھی منظور ہوا جس سے تمام برطانوی مملکت میں رسم غلامی موقوف ہو گئی۔ ان کے اسی زمانۂ قیام میں قانون کارخانہ کا نفاذ ہوا نیز مذہبی رسایل بازی کی ابتدا ہوئی۔ ہندوستان سے ان کی روانگی کے ایک یا دو مہینے قبل ہی منچسٹر اور لیورپول کی ریلوے لائن جاری کی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ یہاں اس وقت موجود تھے جب کہ جدید انگلستان قدیم انگلستان ہی کے قالب سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس جدید انگلستان میں جمہوری حکومت، صنعت و حرفت، تجارت و تمدن کی اصلاح، اینگلیکی کلیسا کی تجدید اور شاہی سیاسی مسلک کا جو منحرف کلیسا کے زیر اثر تھا دور دورہ تھا۔ اسی روشن زمانے میں رام موہن رائے کی شخصیت، جدید ہندوستان کا جو برطانوی حکومت کے تحت ترقی کر رہا تھا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کر رہی تھی جس کی بعض قومیں مقررہ وقت سے پہلے ابھر آئی تھیں۔

یہ رام موہن رائے ہی کی ذات تھی جس نے جدید انگلستان کو جدید ہندوستان سے روشناس کرایا۔ اس ملک (جدید ہندوستان) کے خیالات

کی ترجمانی اور پیام بری وہ عمر بھر کرتے رہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ان کا درجہ بہت بلند ہے مسلسل مگر غیر مکمل انقلاب سے مملو روشن زندگی کے باعث وہ اپنی جماعت کے سردار ہو گئے اور اپنے ہم وطنوں کے درمیان اسی طرح کے انقلاب کا ذریعہ بن گئے۔ رجحانات و مواقع کی گوناگونیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم و بیش سرعت کے ساتھ برادرانِ وطن ان کے نقش قدم پر چلتے دکھائی دیتے مگر ثابت قدم نہ رہ سکے کیونکہ جس منزل مقصود کی جانب وہ گامزن گرر ہے تھے بظاہر وہاں تک کبھی ان کی رسائی نہ ہوئی۔ تاریخ میں رام موہن رائے گویا ایک زندہ پل کی مانند ہیں جس پر سے ہندوستان اپنی غیر معین ماضی سے نکل کر زرین مستقبل کی طرف جارہا ہے۔ وہ مثل ایک محراب کے تھے جس نے قدیم فرقہ بندی اور جدید لوازم انسانیت، توہم اور حکمت، استبداد اور جمہوریت، غیر متغیر رواج اور سست رفتار ترقی، گمراہ کن شرک اور خالص عقیدۂ وحدانیت کی خواہ وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو درمیانی خلیج کو پاٹ دیا۔ وہ اپنی قوم کے بیچ تھے اور اکثر بذات خود مصائب جھیلتے ہوئے اپنے اندر قدیم روایت اور ناگزیر روشن خیالی کی متنافر خصوصیات کو باہم پیوستہ رکھتے تھے۔

برسٹل کے قریب وادی آرنو کے قبرستان میں رام موہن رائے کی قبر کا کتبہ:-

اس سنگ مزار کے نیچے راجہ رام موہن رائے بہادر مدفون ہیں جو خدا کی وحدانیت پر مضبوطی کے ساتھ دل سے اعتقاد رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی صرف ذات الٰہی کی پرستش کے لیے وقف کردی، بڑی خداداد استعداد کے ساتھ بہت سی زبانوں کی کامل مہارت پیدا کرلی اور بہت جلد اپنے زمانے کے ایک جلیل القدر عالم ہونے کا امتیاز حاصل کیا۔ ان کے ہم وطنوں کو بہ امتنان یاد ہے کہ انھوں نے باشندگانِ ہند کی معاشرتی، اخلاقی اور جسمانی حالت کو ترقی دینے میں ان تھک کوششیں کیں، رسم ستی اور بت پرستی کو روکنے میں خود کو

بہ دل و جان مصروف رکھا اور پیہم سرگرمی کے ساتھ ہر اُس تحریک کی تائید کی جو خدا کی عظمت اور انسان کی فلاح و بہبود کو وسعت دینے کی جانب مایل ہوتی۔

یہ لوح قبر اُس رنج اور فخر کا اظہار کرتی ہے جسے ان کے بعد کی نسلیں اپنے دل میں محفوظ رکھینگی۔

وہ ۱۷۷۲ء میں بنگال میں بمقام رادھا نگر پیدا ہوئے تھے اور ۲۷ ستمبر ۱۸۳۳ء کو برسٹل میں فوت ہوئے۔

دوسرا باب

عامل و مقنّن حکام

قانونِ منشور بابت ۱۸۳۳ء

برطانوی حکومت ہند کی نوعیت اور مقاصد کے جدید اصول جو ایک طرف رعایا کی طبیعی ترقی میں مداخلت کے انسداد اور دوسری طرف تمام مضرات و مظالم کے استیصال کی پُرجوش خواہش پر مبنی تھے ہندوستان نیز اُن اعلیٰ حکمرانوں کی کارروائیوں کے متعلق جن کا ذکر گزشتہ باب میں کیا گیا ہے برطانوی پارلیمنٹ کے طرزِ عمل پر اثر انداز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگلستان میں لوگ انفرادی زندگی اور واحد نفس پر غور و خوض کر کے اس حقیقت کو معلوم کرنے لگے تھے کہ قوم کی ترقی کا دار و مدار بیشتر فرد کی تربیت پر ہے۔ اصلاحات کے جذبات ہر سو پھیل گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ انگلستان کے سیاسی رہنماؤں نے ہندوستان کے لاکھوں باشندوں کی جانب جو اُن کی تحویل میں جا چکے

تھے اپنی ذمہ داریوں کی وسعت کا صحیح علم حاصل کرنا شروع کیا تھا۔ عہد کامرانی، اختتام کو پہنچ چکا تھا، تنظیم جدید کے دور کا آغاز ہو گیا تھا اور اس تنظیم کے کام میں نہ صرف جواب دہی کا سخت احساس اور صریح نیک نیتی پائی جاتی تھی بلکہ اس میں از حد تفکر و تفحص کی خصوصیت بھی موجود تھی۔ مشورے کو عمل پر مقدم کیا گیا۔ ۱۸۳۲ء میں دارالعوام کی ایک مجلس منتخبہ اس لیے مقرر ہوئی کہ وہ "ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاروبار کی موجودہ حالت کی تحقیقات کرے" اور آیندہ نظام العمل کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کرے۔ اس مجلس کے روبرو جو شہادت پیش کی گئی اور جس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں وہ، انصرام کار کی خوبی کے علاوہ اس حقیقت کا بھی اظہار کرتی ہے کہ فرض شناسی اور ذمہ داری کی اہمیت عظیم کو نہ صرف معدودے چند بلند خیال لوگوں نے بلکہ کمپنی کے ملازموں کی تعداد کثیر نے بھی محسوس کیا۔ حکومت ہند کے مسایل کے متعلق مجلس کی رائے کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکتا ہے:-

حکومت ہند کے مقاصد* طریق وضع قوانین ہند اور اس کی امکانی اصلاح کے متعلق وسیع النظری سے کام لیا جائے تو بلا دلیل و حجت اس امر کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی رعایا کے مفاد یورپیوں کی اغراض سے زیادہ قابل لحاظ ہیں جب کہ ان دونوں میں مقابلے کی صورت پیش آئے، اور اس سبب سے قوانین کا نفاذ یورپیوں کی بہ نسبت ہندوستانیوں کی عادات اور جذبات کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ بھی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بعض اشکال میں اگرچہ ہندوستانی اور برطانوی قانون کی یکسانی فایدے سے خالی نہیں ہوتی تاہم ضابطۂ ہند کی بنیاد برطانوی قانون کے اصول پر نہیں رکھی جا سکتی۔ غرض یہ کہ ہندوستانیوں کے حقوق کی خاطر خواہ حفاظت بجز اس طریق انضمام کے اور کسی طرح نہیں ہو سکتی کہ ہر ضلع کی عدالت پر ایک یورپی جج کا تقرر کیا جائے اور اس کے مددگار جج نیز اسیسر ہندوستانی ہوں

---

* Source.—Report of the Select Committee.

اور جماعت کی بجائے شخص واحد کی ماموری عمل میں آئے۔

ہندوستان کے لیے عمدہ حکومت کی تجاویز نیز موجودہ نظام میں اصلاحی تغیرات کے نفاذ کا ہندوستانیوں کی عادات، خصایل اور استعداد سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فی الحال مال، عدالت اور فوج کے محکموں میں محض ادنیٰ خدمات دی گئی ہیں۔ عام خیال ہے کہ انہوں نے ہمارے طریقِ حکومت کے اصلی محاسن و معائب کا کافی مشاہدہ کیا ہے اور انہیں اس بات کا احساس و ملال ہے کہ انہیں حکومت عاملہ میں زیادہ حصہ نہیں مل رہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اُس بے اطمینانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی جو سابق حکومتوں کے تحت ہر قسم کے حقوق میں پائی جاتی تھی برطانوی پناہ میں امن و امان کی ترقی سے نہیں سمجھی جاتی ہے۔ شہادت سے اس امر کی بارہا تصدیق ہو چکی ہے کہ ہندوستانیوں کی محرومی کو اس لیے روا نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ معاملہ فہم یا عامل یا قابل اعتماد نہیں ہیں بلکہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یورپی حکام کی ماتحتی و نگرانی میں اعلیٰ عہدوں پر ان کی ماموری، ان کے عام چلن کی اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کر کے مفید اثر مترتب کرے گی، برطانوی مملکت کے ساتھ ان کے خلوص کو پایدار بنائیگی، عدل گستری کے بہتر طریقے کی جانب مایل کرے گی اور حکومت ہند کے مصارف میں بڑی بچت کا باعث ہو گی۔

برطانوی پارلیمنٹ نے فکر و تامل کے بعد عمل کی طرف رخ کیا جو موثر ترین نوعیت کا عمل تھا۔ ۱۸۳۳ء کا قانون منشور، ہند کے برطانوی نظم و نسق کی تاریخ میں بدرجۂ غایت اہمیت رکھتا ہے۔ قانون کی عبارت بجائے خود اس قدر طویل ہے کہ اسے بکمال و تمام نقل کرنے کے عوض اس کی اہم تر دفعات کا خلاصہ جو سر کرٹنے البرٹ کا تیار کردہ ہے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

قانون (منشور) نافذ ہونے کے بعد نظما نے ہندوستان کو وہ مشہور مراسلہ روانہ کیا جس کی تحریر جیمس مل سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس میں نظما نے خوب واضح طور پر ذرایع اور طریقِ کار کو بیان کیا ہے جس کی مدد سے دفعات مذکورہ

بروئے عمل آنی چاہئیں۔

قانون منشور بابت ۱۸۳۳ء کی دفعات کا خلاصہ*

کمپنی کے متعلق جب تجدید منشور کا وقت آیا تو ہندوستان میں لارڈ ولیم بنٹنک کے پُرامن عہد حکومت کو پانچ سال ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں قانون اصلاح، انگلستان میں نافذ ہوا تھا اور وھگ فرقے کے اصول عروج پر تھے۔ ترتیب و وضع قوانین کے بارے میں بنتھم کے خیالات سے مصلحانِ قانون کے قلوب خوب متاثر ہو رہے تھے۔ میکالے پارلیمنٹ میں موجود تھا اور مجلس نگراں کا معتمد تھا، اور بنتھم کا شاگرد جیمس مل، دفتر ہند کی مراسلات کا تنقیح ساز تھا۔ قانون منشور بابت ۱۸۳۳ء کے نفاذ سے قبل جیسا کہ ۱۸۱۳ء میں تجدید منشور کے وقت عمل ہوا تھا ہندوستانی نظم ونسق کے متعلق احتیاط کے ساتھ تحقیقات کی گئی۔ اس قانون کی رُو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دستور اور ہندوستان کے طریق نظام میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔

کمپنی کے ملکی مقبوضات کو آئندہ اور بیس سال کی مدت تک کمپنی ہی کے زیرحکومت رہنے کی اجازت دی گئی مگر یہ مقبوضات ملک معظم، ان کے وارثوں اور جانشینوں کی امانت کے طور پر حکومت ہند کی خدمت کے لیے کمپنی کے تفویض کیے گئے۔

کمپنی کا اجارہ جو چاء اور چین کی تجارت سے متعلق تھا قطعی طور پر منسوخ ہو گیا۔

کمپنی کو تجارتی کاروبار بند کرنے اور اپنے معاملات کا بعجلت ممکنہ تصفیہ کرنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ اس کے تمام قرضے جو ملکی مقبوضات اور دیگر امور سے متعلق تھے مالیۂ ہند پر عاید کیے گئے جس میں اس کا سالانہ نفع اصل سرمائے کی کل رقم (یعنی چھ لاکھ تیس ہزار پونڈ) پر فی صد دس پونڈ دس شلنگ کی شرح

---

* Source.—Historical Introduction, "Government of India." Sir Courtenay Ilbert. (Clarendon Press.)

سے مقرر ہوا مگر شرط یہ تھی کہ پارلیمنٹ ہر سو پونڈ کے حصے کے عوض دو سو پونڈ نقد دے کر اس حصے کو سوخت کر دے اور اس غرض کے لیے کمپنی قومی قرضے کی مد میں تیس لاکھ پونڈ ادا کرے اور یہ سود در سود کے حساب سے جمع ہوتے رہیں تا آنکہ یہ رقم ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہنچ جائے۔

کمپنی باوجودیکہ تجارتی کاروبار سے محروم کر دی گئی تھی تاہم سابق قوانین کے قایم کردہ آئین حکومت دوعملی کے تحت اس کے انتظامی و ملکی اختیارات برقرار رہے اور وہ خاصکر تقررات ہند میں اپنے مربیانہ حقوق کو کام میں لاتی رہی۔ مجلس نگران کے دستور میں ترمیم کی گئی مگر اس مجلس کے اختیارات کا بروئے عمل آنا اس کے صدر پر موقوف تھا اس لیے ترمیمات سے کوئی مفید اثر مترتب نہ ہوا۔ موجودہ قانون کی رُو سے سابق قانون کی دفعات جن کا تعلق مجلس نظما کی مجلس راز سے تھا دوبارہ نافذ ہوگئیں اور موخرالذکر مجلس کے توسط سے ترسیل مراسلات کا انتظام کیا گیا اور کمپنی کے مروج خطاب کو مختصر کر کے اسے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کہلائے جانے کی اجازت دی گئی۔

ہند کی حکومت عاملہ کے نظام میں کوئی اہم تبدیلی نہیں کی گئی۔

تمام سیول اور فوجی حکومت کی سربراہی، رہنمائی اور نگرانی کے اختیارات صریح طور پر گورنر جنرل اور کونسل کے تفویض کیے گئے اور اسے گورنر جنرل ہند باجلاس کونسل کا خطاب دیا گیا۔ اس کونسل میں ایک چوتھے رکن معمولی کا اضافہ ہوا۔ یہ رکن ملازمان کمپنی میں سے تھا نہ بحثیت رکن کونسل، اغراض قانونی کے سوا اور کوئی کام کرنے کا مجاز تھا۔ یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ چوتھا رکن میکالے تھا۔

بنگال کا وسیع احاطہ دو علٰحدہ احاطوں میں جو احاطۂ فورٹ ولیم اور احاطۂ آگرہ سے موسوم ہوئے منقسم ہونے والا تھا مگر یہ انتظام کبھی عمل پذیر نہ ہوا۔ ۱۸۳۵ء کے قانونی حکم (۵ و ۶ ولیم چہارم باب ۵۲) کی بناء پر اسے ملتوی رکھا گیا اور التوا کا یہ عمل ۱۸۵۳ء کے قانون منشور (۱۶ و ۱۷ اکوئین وکٹوریہ باب ۹۵، دفعہ ۱۵) کے باعث غیر محدود طور پر جاری رہا۔

نشا یہ تھا کہ فورٹ ولیم، فورٹ سینٹ جارج، بمبئی، آگرہ چاروں احاطوں میں سے ہر ایک میں انتظامی امور کے لیے ایک خاص گورنر اور کونسل رہے لیکن، گورنر جنرل اور اس کی کونسل کو فی الحال فورٹ ولیم کے گورنر اور کونسل کے فرائض بھی انجام دینے تھے اس لیے اسے اختیار دیا گیا کہ کونسل کے ارکان کی تعداد گھٹائے یا ان کو بالکل معطل کر کے انتظامی کام محض گورنر کے حوالے کر دے۔

مسٹر کوول کہتا ہے کہ "۱۸۳۳ء میں پارلیمنٹ کی توجہ حکومت ہند کی کارروائیوں کے تین بڑے نقائص کی طرف منعطف ہوئی۔ پہلا نقص قوانین وضوابط کی نوعیت سے متعلق تھا، دوسرا ان غیر واضح اختیارات و اقتدارات سے جو ان مختلف قوانین وضوابط کے وجود میں آنے کے باعث تھے اور تیسرا یہ کہ خلاف ضابطہ اور بعض اوقات متضاد عدالتی فیصلے ہوا کرتے تھے جن کے ذریعے قانونی احکام کی تعمیل کرائی جاتی تھی"۔

۱۸۳۳ء کے قانون (منشور) کی رُو سے صرف گورنر جنرل باجلاس کونسل کو جس کی اعانت کے لیے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایک چوتھے رکن قانونی کا اضافہ ہوا تھا حکومت ہند کے قوانین وضع کرنے کا اختیار دیا گیا۔ چاروں احاطوں کی حکومتوں کو محض یہ اجازت دی گئی کہ ایسے قوانین وضوابط کے مسودات یا تجاویز جو ان کے خیال میں معقول ہوں گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش کریں جس کا فرض تھا کہ ان پر غور و خوض کرے اور انھیں اپنی تشریحات کے ساتھ اس حکومت کے پاس بھیج دے جو ان کی محرک ہو۔

گورنر جنرل باجلاس کونسل کو قوانین وضوابط بنانے کے اختیارات صریحاً حسب ذیل دیے گئے۔

ا۔ ان مختلف قوانین وضوابط کی تنسیخ یا ان میں ترمیم و تبدیلی کرنے کے لیے جو فی الوقت ہند کے علاقوں میں رائج ہیں،

ب۔ تمام اشخاص کے لیے خواہ وہ برطانوی ہوں یا ہندوستانی،

اجنبی ہوں یا غیر ملکی نیز تمام عدالتی محکموں اور ان کی اختیاری حدوں کے لیے خواہ وہ فرمان شاہی کے ذریعے یا اور کسی طرح قایم کی گئی ہوں،

ج۔ مذکور بالا جمیع علاقوں اور ان کے حصوں کے تمام مقامات اور اشیاء کے لیے خواہ وہ کسی نوع کے ہوں،

د۔ کمپنی کے اُن تمام ملازموں کے لیے جو اس کے حلیف حکمرانوں کے علاقوں اور ریاستوں میں مقیم ہوں اور

ہ۔ کمپنی کی فوجی ملازمت کے ہندوستانی عہدہ داروں اور سپاہیوں کے انتظام کے متعلق جنگی قوانین بنانے کے لیے نیز اس قسم کے عہدہ داروں اور سپاہیوں کی داد رسی کے لیے جو فوجی عدالت کے ذریعے عمل میں آئے۔

لیکن یہ اختیارات ایسے قوانین وضوابط وضع کرنے کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے تھے جو

۱۔ ۱۸۳۳ء کے قانون (منشور) کی کسی دفعہ کو یا تاج برطانیہ اور کمپنی کے محکوم عہدہ داروں اور سپاہیوں کے فرار اور سرکشی سے متعلق قوانین کی دفعات میں سے کسی کو منسوخ کریں، بدل دیں یا معرض التوا میں ڈال دیں، یا

۲۔ تاج برطانیہ کے حقوق یا پارلیمنٹ کے اختیارات پر یا کمپنی کے دستور و استحقاق یا حکومت متحدہ (برطانیہ) کے اصول قانون یا رسم و رواج کے کسی ایسے جزو پر اثر انداز ہوں جس پر تاج برطانیہ یا اقتدار اعلیٰ کے ساتھ یا ہند کے علاقوں میں مملکت تاج کے ساتھ کسی شخص کی وفاشعاری کا انحصار ہو، یا جو

۳۔ مجلس نظما کی منظوری قبل از وقت حاصل کیے بغیر کسی غیر سند یافتہ عدالت کو اس امر کا مجاز کر دیں کہ وہ ملک معظم کی یورپ نژاد رعایائے حقیقی یا اس کی اولاد کو سزائے موت دے یا کسی سند یافتہ عدالت کو برخاست کر دے۔

نیز پارلیمنٹ کا یہ حق بالکل محفوظ تھا کہ وہ ہندوستان کے لیے قوانین وضع کرے اور انہیں منسوخ کرے اور مزید براں پارلیمنٹ کو یہ حکم صادر کرنے کی قوت حاصل تھی کہ تمام قوانین ہند اس کی پیشگاہ میں پیش ہونے چاہییں۔

قانون (منشور) کے عطا کردہ اختیارات کے تحت جو قوانین بنائے جائیں

ان کو مجلس نظما، جو مجلس نگراں کے تحت کارفرما تھی نامنظور کر سکتی تھی لیکن جب وہ بن چکتے تو ان کا نفاذ مثل قوانین پارلیمنٹ کے ہوتا تھا اور کسی عدالتی محکمے میں ان کے باضابطہ اندراج یا اشاعت کی ضرورت لاحق نہ ہوتی تھی۔

۱۸۳۳ء کے قانون (منشور) کے تحت جو قوانین بنائے گئے ان کو قوانین پارلیمنٹ کا رتبہ حاصل ہوا اور ان کا نفاذ ان ضوابط کی جگہ ہوا جو سابق قوانین پارلیمنٹ کے تحت وضع ہوئے تھے۔

اجمال بالا سے قانون (منشور) کی نوعیت و اہمیت صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ جن قانونی دفعات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی حقوق سے سبکدوش کیا اور انگریزوں کو مہم عظیم کی راہ دکھائی ان پر دوسری جلد میں بحث ہوگی البتہ ان میں سے چند کا ذکر اس کتاب کے ابواب مابعد میں کیا جائیگا جن کا تعلق رائج الوقت قانون کی ترتیب، سرکاری خدمات پر ہندوستانیوں کی ماموری اور مجلس نظما کی سرپرستی سے ہے۔

قانون (منشور) کے اجرا سے قبل بوقت بحث و مباحثہ اکثر اشخاص نے قانون سازی کے معاملے میں یکسانی کی ضرورت کا اظہار کیا تھا۔ اب تک گورنر جنرل باجلاس کونسل ایسے ضوابط نافذ کر سکتا تھا جن کی تعمیل اہل بنگال پر لازم تھی بشرطیکہ ان ضوابط کا باقاعدہ اندراج صدر عدالت میں ہو گیا ہو۔ اسی طرح کے اختیارات مدراس و بمبئی کی حکومتوں کو اپنے اپنے احاطوں میں حاصل تھے۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے سرکاری حیثیت سے اپنی یہ رائے دی کہ سارے ہندوستان کے لیے قوانین وضع کرنے کا اختیار صرف ایک ہی جماعت کو ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں یورپیوں کا ملک میں آزادی کے ساتھ داخلہ (اور خاص کر دارالامارات کی حدود سے باہر مفصلات میں) جس پر قانون (منشور) کے تحت غور کیا گیا متضاد ضوابط کے قدیم نظام کے خلاف تھا۔ لہذا یہ ضروری معلوم ہوا کہ قانون سازی کے تمام فرائض کو ایک مرکزی حکومت کے تحت کر دیا جائے چنانچہ گورنر جنرل باجلاس کونسل، ہندوستان کا واحد قانون ساز قرار پایا۔ نظما نے اپنے مراسلے میں جدید قانون کی دفعات کی توضیح کرتے ہوئے وزیر قانونی کی حیثیت اور فرائض، ماتحت حکومتوں سے

مشورے کی ضرورت اور علی العموم رائے عامہ کے متعلق اُن خیالات کو تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا جن کے مطابق قانون سازی عمل میں آنی چاہیے۔

قانون سازی کے طریقے*

۱۔ پارلیمنٹ کے آخری اجلاس کے نافذ کردہ قانون کی رُو سے حکومت ہند کے دستور میں جو ترمیمیں کی گئیں ان پر غور کرنے سے ہمیں یہ بات اہم نظر آتی ہے کہ ہمارے ان خیالات کے بارے میں جو جدید مسودات قانون کے عمل پذیر ہونے کے حامی ہیں نیز اُس طریقے کے متعلق جس کے ذریعے ہم جماعت مقننہ کی سودمند اغراض کی تکمیل کے لیے مفوض اختیارات کو بہترین طور پر کام میں لا سکتے ہیں آپ کی اور ہماری حکومت کے مابین نہایت جامع مراسلت ہونی چاہیے۔

۹۔ قانون (منشور) نے پہلے پہل یورپ نژاد رعایائے برطانیہ کے لیے برطانوی ہند کے دروازے کھول دیے۔ اس وقت تک انگریز ہندوستان میں اپنے قیام کی اجازت کے محتاج تھے۔ اب انہیں یہ حق خواہ محدود ہی کیوں نہ ہو حاصل ہوگیا ہے کہ ملک میں بود و باش کریں اور اراضی پر قابض بھی ہوجائیں اور ان کی تعداد میں کثیر اضافے کی بھی ہر طرح توقع ہے۔ پس یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف برتنے میں مقامی حکومتیں نہ صرف انتہائی صورتوں میں بالاترین اختیار تمیزی سے کامل ذرایع کام میں لائیں بلکہ اپنے مروج و معمولی عملدرآمد کو پیش نظر رکھ کر ایسے قوانین کو بھی کاروبار کا وسیلہ قرار دیں جو احتیاط سے مرتب ہوکر مستعدی و غیر جانب داری کے ساتھ عمل پذیر ہوتے ہیں۔ اس صورت کے سوا یورپیوں کے بے روک ٹوک داخلے کا اور کسی طریقے پر تجربہ کرنا خالی از خطر نہیں ہو سکتا۔

۱۰۔ اب جبکہ صدر حکومت کو قانون سازی کے جدید اختیارات عطا کیے جاتے ہیں

---

* Source.—Despatch accompanying the Government of India Act, 1833. (3 & 4 Will. IV, s.5.) Dated 10 December, 1834. From the Board of Directors, East India Company, to the Government of India. (Parliamentary Papers.)

تو ذیلی حکومتوں کی قانون سازی کے اختیارات میں جو انہیں اب تک حاصل ہیں تبدیلی و تخفیف کی جانی چاہیے۔ اس موضوع پر ہیں اُن مباحثوں کا حوالہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے جو چند سال قبل دستور حکومتِ ہند کے بہترین طریق کار کے متعلق ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے ہیں۔ جماعت مقننہ کے ذہن میں غالباً فیصلہ کن خیال یہ تھا کہ اندرونِ ملک یورپیوں کے آزادانہ داخلے کے نظر کرتے صدر حکومت کو تقویت دینا ضروری ہے۔

۱۱۔ یورپی اشخاص خواہ وہ کسی طریقے سے ہند کے مختلف حصوں میں پھیل جائیں اپنے مستحکم رشتۂ ہمدردی کی بدولت باہم ملے رہیں گے اور یقیناً مسلسل آمد و رفت قائم رکھیں گے۔ اس لیے قدرت و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سب ایک ہی قسم کے قوانین کے زیر اثر بود و باش اختیار کریں ورنہ ساری جماعت کو نظر انداز کر کے اس کے ایک حصے کے لیے قانون بنانا مشکل ہوگا۔ خاصکر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں ان یورپیوں کے واسطے قانون وضع کرنا جن کو قومی و ملکی حقوق عطا کیے گئے ہوں اور جو حکومت سے بے تعلق ہوں بالکل ایک نیا اور آزمائشی کام ہوگا۔ اس کام کی مشکلات کو مبالغہ سے بیان کیا گیا ہو لیکن بلا شبہہ وہ معمولی ہیں نہ عارضی۔ ان مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا اگر مختلف حکومتوں کو قانون سازی میں مساوی اختیارات عطا کر دیے جائیں اور وہ جدا جدا اپنی صوابدید پر یا بالکل مختلف خیالات اور متغایر اصول کے ساتھ ان اختیارات کو کام میں لانے لگیں۔ اگرچہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اندرون ملک یورپیوں کے داخلے کے بارے میں ماتحت حکومتوں کے جو سلطنت کے مختلف علاقوں پر کارفرما ہیں اختیارات قانون سازی برقرار رہیں نیز یہ کہ شمالی ہند کی جانب ان کے علاقوں میں قانون سازی کی نگرانی و انتظام کے لیے ایک جدید مقام مقرر کیا جائے تاہم اس امر کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں کہ قوانین وضع کرنے کے اتمام فرائض یکجا کر کے ایک مرکزی حکومت کے تفویض کر دیے جائیں۔

۱۲۔ پہلی بات جو پیش آتی ہے اُس طریقے یا کارروائی سے متعلق ہے جس کے ذریعے آپ قوانین بنا کر ان کی اشاعت کریں گے۔ یہ اشاعت کئی طریقوں

سے ہو سکتی ہے اور اسے کارگر بنانے کے ذرائع سہل الحصول ہیں لیکن وہ طریق کار جس کی بنا پر قانون زیر اشاعت کی ابتدائی ترتیب دی جائے گی ایک نازک معاملہ ہے اور اس کی تجویز میں بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔ بہر حال اس عنوان پر آپ کی رہنمائی کے لیے خاص خاص اشکال یا تجاویز کا اظہار لازم ہے نہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جماعت مقننہ کے منشا کی بہترین تکمیل اس طرح ہو جائے گی کہ ہم وہ اصول بیان کر دیں جو زیر بحث اہم فرائض کی انجام دہی کے وقت آپ کے پیش نظر رہیں اور جنہیں ان قوانین میں جگہ ملے جو حالات و اغراض کے تحت آپ وضع کریں۔

۱۵۔ پہلا اصول یہ ہے کہ کوئی قانون بجز اتفاقی صورت یا شدید ضرورت رونما ہونے کے اس وقت تک نافذ نہ کیا جانا چاہیے جب تک کہ اس پر کامل غور و خوض اور بحث و مباحثہ نہ ہوا ہو۔

۱۶۔ ممکن ہے کہ اصول مذکور آپ کو فرسودہ نظر آئے لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ اس پر نہایت احتیاط کے ساتھ آپ کو آئینی قواعد کی ترتیب کے وقت صریحاً عمل کرنا چاہیے۔ اس ملک میں مدت و شہرت کارروائی جس کے ذریعے کوئی قانون ایک تجویز کی شکل سے مکمل مسودۂ قانون کی حیثیت اختیار کرتا ہے اور اختلاف آرا جس سے ترمیم ناگزیر ہو جاتی ہے ایسی چیزیں ہیں جو قانون سازی میں کمزوری و بے اعتنائی کو دور رکھنے کی ضامن ہیں۔ اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ بعض مستثنیٰ صورتیں بھی ہیں جہاں بلا تامل رائے عامہ کے دباؤ سے مجبوراً قانون بنانا پڑتا ہے۔ اس قسم کی کوئی دقت کم از کم کچھ مدت تک آپ کو اپنی قانونی کارروائیوں میں پیش نہیں آئیگی لیکن بحث جب ایک مجلس ہی تک محدود رہے تو اس کے متعلق ارکان کی احتیاط اور دانشمندی ہی عجلت کے مضر خطرات کو دور کر سکتی ہے۔ پس ہم یہ بہت ضروری خیال کرتے ہیں کہ آپ ایجابی قواعد کے ذریعے اس امر کا انتظام کریں کہ ہر قانونی تجویز قبل اس کے کہ وہ بالکلیہ اختیار کی جائے کونسل کے مقررہ سلسلۂ منازل سے ہو کر گزرے، ہر منزل پر اس کے متعلق کامل بحث کی جائے اور درمیانی وقفہ اتنا ہو کہ کونسل کے ہر رکن کو

غور و خوض اور تحقیقات کا مناسب موقع مل سکے .... اس غرض کی تکمیل
کے لیے زیادہ تر دقیق، مفصل اور جامع قواعد کی ضرورت ہے۔

۱۸۔ اس قسم کے قواعد بنانے میں انتہائی صورتوں کو یقیناً ملحوظ رکھنا چاہیے
اور شدید ترین ضرورت کے وقت آپ کو جدید قانون (منشور) کی دفعہ ۴۹ سے مدد
ملیگی جس میں گورنر جنرل کو تنہا اپنی ذمہ داری پر کام کر کے غیر سنجیدہ مشوروں اور
کمزور تحریکوں کی ممکنہ خرابیوں سے بچنے کا موقع دیا گیا ہے۔ لیکن اس قسم کے مواقع
جہاں انتہائی علاج کی ضرورت لاحق ہو باضابطہ و شائستہ سلطنتوں میں
شاذونادر ہی پیش آتے ہیں، اور علی العموم ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر آپ پابندی،
ثابت قدمی نیز باریک بینی کے ساتھ حسب عملدرآمد اپنے معمولی قواعد سے
وابستہ رہیں تو نہ صرف خوبی کار کے متعلق بلکہ قانونی کارروائیوں کے طے کرنے میں بھی
آپ کو خاطر خواہ اطمینان حاصل رہیگا۔

۱۹۔ آپ کے فرائض کے غور طلب حصے پر یوں اظہار خیال کرتے ہوئے
ہماری توجہ خواہ مخواہ ایک اہم ترمیم کی جانب منعطف ہو جاتی ہے جو قانون (منشور)
نے مجلس اعلیٰ کے دستور میں کی ہے۔ ہمارا اشارہ بحوالہٗ دفعہ ۔ ۹ مجلس مذکور کے چوتھے
رکن معمولی کے تقرر کی طرف ہے۔

۲۰۔ جب ہماری ابتدائی اور نہایت اجمالی نظر اس قابل یادگار انتظام پر
پڑتی ہے تو چوتھے رکن کونسل کی اعانت و موجودگی گویا بدل معلوم ہوتی ہے عدالت عظمیٰ
کی اس منظوری کا جو احاطوں کے باشندوں سے متعلق ضوابط کے جواز کے لیے
اب تک لازم رہی ہے مگر جس کی ضرورت آیندہ جدید نظام کے تحت نہ ہوگی۔
بہر صورت یہ ظاہر ہے کہ جماعت مقننہ کا منشا اس قسم کا محض بدل مہیا کرنے سے
بالاتر ہے۔

۲۱۔ کسی قانون کے بارے میں کونسل کا چوتھا رکن متفق نہ ہو تو بھی قانون
مکمل ہو سکتا ہے نیز بوقت نفاذ اس کی غیر موجودگی قانون کو باطل نہیں کریگی
مگر پارلیمنٹ کی علانیہ غرض و غایت یہ ہے کہ رکن مذکور کا سارا وقت، پوری توجہ
اور علم و کمال کے وہ تمام قیمتی ذرائع جو اسے حاصل ہیں سب کے سب کونسل کے

فرائض قانون سازی کی ٹھیک ٹھیک انجام دہی میں سرگرمی کے ساتھ کام میں لائے جائیں۔ فی الحقیقت وہ اس محکمے کی کارروائیوں میں کوئی اعلیٰ اقتدار نہیں رکھتا ہے مگر خاص طور پر تمام فروعات میں ایسے ذمہ دار گردانا گیا ہے۔ اس کی رائے کو نہ صرف مختلف قوانین کی تدوین و تشکیل کے کام میں جیسے جیسے کہ وہ نافذ ہوتے جائینگے لازماً بڑا دخل رہیگا بلکہ اس کار عظیم میں بھی کو ہر موقع کے لحاظ سے تمام مقامی معلومات فراہم کرنے اور جمیع خیالات عام کو پیش نظر رکھنے سے متعلق ہے یا کونسل کو اس قابل بنانے میں کہ وہ شائستہ حکومت کے عقلی و ضروری اصول کو ایسے ضوابط میں جگہ دے سکے جو کثیر و بے شمار مختلف وضع قطع کے محکوم لوگوں کے اوارات اور عجیب و غریب عادات و خصایل کے مناسب حال ہوں۔

۲۳۔ یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ چوتھے رکن کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ بجز ان اجلاسوں کے جن کا تعلق قوانین و ضوابط وضع کرنے سے ہے کونسل میں نشست پانے یا رائے زنی کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

۲۴۔ ہمارا خیال ہے کہ کونسل کے ہر رکن کو یہ آزادی ملنی چاہیے کہ وہ کوئی قانون یا ضابطہ برائے منظوری پیش کر سکے اور اس کی تجویز پر بحث و مباحثہ ہو باوجودیکہ ابتداء میں وہ اپنی رائے کا واحد موئید ہو۔ غور و فکر کی مجلسوں میں جو مختلف الخیال و کثیر التعداد لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں ایسا کوئی موضوع زیر بحث نہیں لایا جا سکتا جس کی تحریک و تائید نہ ہوئی ہو۔ اس قاعدے کی معقولیت عیاں ہے لیکن ایک مختصر و منتخب جماعت کے کاروبار میں ہمارے نزدیک یہ شرط لازم نہیں ہونی چاہیے۔

۲۵۔ آپ اصحاب کی ناگزیر مشاورت کے بارے میں اب ہم کچھ زیادہ نہ کہینگے۔ اسی قدر اہم دوسری بات جس کے لیے آپ کو آمادہ کرنا ہے یہ ہے کہ قانون سازی کے کام میں عملی طور پر جہاں تک ممکن ہو آپ بیرونی امداد سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ ایسے اشخاص جو آپ کی جماعت کے ارکان نہیں ہیں ضروری قوانین پیش کر کے یا زیر غور قوانین کی تجاویز یا مسودات میں قابل اعتراض یا مشکل امور کو ظاہر کر کے آپ کو بیش بہا امداد دے سکتے ہیں۔

۲۶۔ جدید قوانین کے پیش ہونے سے متعلق قانون (منشور) کا حسب دفعہ ۶۶ علانیہ یہ مطالبہ ہے کہ آپ قوانین یا ضوابط کے اُن مسودات یا تجاویز پر غور کریں جو کسی ماتحت حکومت کی جانب سے آپ کی خدمت میں پیش ہوں، لیکن اس بحث پر زیادہ تفصیل کے ساتھ ہم بعد کو کسی دوسرے موقع پر اظہار خیال کریں گے۔ قانون (منشور) کا یہ منشا بھی ہے کہ کمشنر ان قانون سے پیہم مراسلت کی جائے جس کا مقصد قانون سازی کے لیے اسباب یا مواد فراہم کرنا ہو۔ مفید معلومات سرکاری محکموں اور صدر عدالتوں کے ججوں سے، اُن تمام ہندوستانی یا یورپی اشخاص سے جن کے ذمے عدالتی کام ہے یا جو سرکاری اعلیٰ خدمات پر مامور ہیں، تمام کالجوں اور دیگر آئینی جماعتوں سے اور غالباً دیہات کے ہندوستانی چودھریوں سے یا ذی اثر یا با اثر خانگی افراد سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

۲۷۔ دوسری بات جس کی جانب ہم نے توجہ کی ہے کچھ کم اہم نہیں ہے یعنی زیر غور قانونی تجاویز پر عوام یا با اثر اشخاص کی رائے حاصل کیجائے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو انگلستان میں پارلیمنٹ کے مباحثوں کی شہرت اور اُس مدت کے وسیلے سے جو ایک قانون کے منظور ہونے کے لیے درکار ہوتی ہے ہاتھ آجاتی ہے، لیکن ہندوستان میں اس کے حاصل کرنے کے لیے خاص انتظام کرنا پڑتا ہے۔

۳۰۔ قوانین کی اشاعت کے متعلق ہماری خاص ہدایت یہ ہے کہ فی الوقت آپ کا جو طریق عمل ہے اسی پر آپ قایم رہیں کیوں کہ وہ بہ حیثیت مجموعی موزوں اور کارگر ہے لیکن ہم آپ کی توجہ ایک ایسے امر کی جانب معطوف کرانا چاہتے ہیں جس کے لیے طریق مذکور کافی نہیں سمجھا جاتا۔ فی الحال قوانین، انگریزی زبان میں، عدالتوں کی زبان میں اور ملک کی مروج زبان میں خواہ وہ کوئی زبان ہو طبع کیے جاتے ہیں اور ان کی نقول متعدد کارپردازانِ حکومت کو بھیجی جاتی ہیں۔ یہ امر زیادہ پسندیدہ ہو گا کہ قوانین سے رعایا کو عام طور پر زیادہ واقف کرایا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں یہ سوال آپ کی التفات کا طالب ہے۔ بہرکیف ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ملک کی زبان میں طبع کی ہوئی نقول قوانین ارزاں قیمت پر ہر جگہ ان تمام اشخاص کے لیے بغرض فروخت تیار رہنی چاہییں جو انہیں

خریدنے کے خواہش مند ہوں۔

۴۶۔ اب تک محکوم احاطوں کی قانون سازی میں آپ کے وسیع اختیاراتِ نگرانی کو دخل رہا ہے لیکن ان احاطوں کو بطور خود قوانین وضع کرنے کا حق حاصل ہے اس لیے خاص خاص غیر معمولی موقعوں ہی پر آپ کی نگرانی رہی ہے۔ اب قانون سازی کا تمام کام چند مستثنیٰ صورتوں کے سوا صدر حکومت کے تابع رہیگا۔ اس کی ساری ذمہ داری آپ ہی پر عاید ہوتی ہے اور ہر قانون پر جو ان احاطوں میں سے کسی احاطے کے مقامی مفاد سے متعلق ہو نیز ہر عام قانون پر جو اپنی نوعیت و عمل کے لحاظ سے اس قسم کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو آپ کو قبل از وقت عمیق و غور و آمیز توجہ کے ساتھ اس طرح غور کر لینا چاہیے گویا وہ محض اُس احاطے کی فلاح و بہبود پر اثر انداز ہو رہا ہے جس میں آپ مقیم ہیں۔ آپ بے شبہ اپنے محکوم احاطوں سے قوانین کے مسودات یا تحریکات حاصل کر سکتے ہیں اور اکثر ان کے مطالبے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن کسی حالت میں بھی آپ اس فرض سے سبکدوش نہ ہو سکینگے کہ صورت حال کی کافی واقفیت پیدا کر کے ہر قانونی تجویز پر اس طرح غور کیا جائے گویا وہ درحقیقت آپ ہی کی تجویز ہے اور آپ ہی کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے۔ ہم یہ اس لیے کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ ایک کام کو دوسرے کے حوالے کرنے کا اختیار بہت آسانی کے ساتھ اس سے تغافل برتنے کی عادت میں خفیہ ہو جاتا ہے اور ہمیں یہ خوف بھی ہے کہ مبادا کسی آیندہ زمانے میں محکوم احاطے قانونی مسودات پیش کرتے کرتے خود اپنے لیے قوانین بنا لینے میں آزاد نہ ہو جائیں اور انہیں صدر حکومت کی دانشمندانہ امداد بہت ہی کم لینے کی ضرورت ہو مثل اس زمانے کے جبکہ قانون سازی کا اختیار صریح طور پر ان کے ہاتھوں میں تھا۔

۴۷۔ جب ہم قانون سازی کے ان وسیع اختیارات پر غور کرتے ہیں جو اس طرح ہماری صدر حکومت کو اور بعد ازاں ہمیں عطا کیے گئے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے استعمال ہی پر بہترین اور بدترین حکومتوں کا امتیاز قائم ہوتا ہے اور جب اس امر پر غور کرتے ہیں کہ لاکھوں انسان اس طریقے سے جس کے

ذریعے ان اختیارات کو بحالت موجودہ کام میں لایا جائیگا آسودہ یا تباہ ہو سکتے ہیں نیز جب ہم بے شمار مختلف اغراض و مفاد کا مطالعہ کرنے اور اُس اہم فرض کی انجام دہی میں مشکلات پر غلبہ پانے کی جانب توجہ کرتے ہیں تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ذمہ داری کے بارے جو بالاشتراک ہم پر اور آپ پر رکھا جاتا ہے ہم تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خواہ کوئی ذرایع یا مساعی بر موقع کام میں لائی جائیں، خواہ کوئی نتائج حقیقی و سرگرم بحث و تمحیص یا عمیق و صداقت آمیز غور و خوض کے بعد نکالے جائیں اور خواہ کیسی ہی امداد بیرونی مشوروں یا اطلاعوں سے حاصل کی جائے ان سب امور یا دیگر ممکنہ اشکال کو اُس دائرۂ عمل کی وسعت سے جس کا احاطہ کرنا اور اُس خدمت کی اہمیت سے جس کا انجام دینا ضروری ہے مشکل کوئی مناسبت ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ ان امور پر آپ مستقل مزاجی کے ساتھ فوراً اپنی توجہ مبذول کرینگے اور ان پر کامل غور کرینگے۔ ہم اس بارے میں آپ کے مستقل خیالات پورے طور پر بہ عجلت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور اپنی حد تک یہ ظاہر کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ آپ کے خیالات کو تقویت دینے اور آپ کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ دیگر اشخاص جو مشوروں یا کوششوں سے اس کام میں ہاتھ بٹانے کے قابل ہیں اپنی امکانی قوت کے ساتھ ہمارے شریک کار ہونگے اور ہم اعتماد رکھتے ہیں کہ ہماری متحدہ مساعی کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی عنایت شامل رہتے اس ملک کے وہ جائز و مفید مقاصد خیر و خوبی کے ساتھ پورے ہونگے جن کی بنا پر اس کے سمندر پار قوی ترین، اہم ترین اور مرغوب ترین مقبوضات کے قانونی و عاملانہ نظم و نسق کو ہمارے ہاتھوں میں دیا گیا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے عام نظم و نسق کے متعلق گورنر جنرل با اجلاس کونسل کے اختیارات کی توضیح کی جائے۔ یہ سچ ہے کہ پارلیمنٹ کے سابق قوانین نے حکومت بنگال کو دیگر احاطوں پر ایسا کامل اقتدار عطا کیا تھا جیسا کہ حیطۂ تحریر میں آ سکتا تھا مگر یہ اقتدار از روئے عمل برائے نام ہی تھا اور اس کی زیادہ اصلیت نہ تھی۔ دوسرا تصفیہ طلب مسئلہ یہ تھا کہ آیا صدر حکومت کے فرائض

تحفظ عام نگرانی اور مطلق العنانی پر مشتمل رہینگے" یا مزید براں اسے بنگال پر براہ راست نگرانی رکھنی چاہیے اور اگر یہ صورت پیش آوے تو کیا ایک علحدہ احاطۂ آگرہ کی تشکیل سے بنگال کے وسیع احاطے کو دو احاطوں میں تقسیم کیا جائے۔ ان مسئلوں پر مدبروں کی رائیں مختلف تھیں۔ لارڈ ولیم بنٹنک[1] اور اس کے رفقائے کار نے اس اصول کو پسند کیا کہ ماتحت حکومتیں، صدر حکومت کے زیر اقتدار رہیں لیکن گورنر جنرل اپنی بحث میں اپنی کونسل کو اس امر پر متفق نہ کرسکا کہ بنگال[1] پر صدر حکومت کی براہ راست نگرانی حسب حال جاری رہے اور بنگال کی تقسیم عمل میں نہ آئے۔

حکومت ہند کے فرایض*

ارکان مجلس نیز میرے دو رفیق مسٹر بیلی اور سر چارلس مٹکاف اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ صدر حکومت کا وقت مقامی حکومت کے ذیلی امور میں ضایع ہونے کی وجہ سے وہ بالاتر و اہم تر امور مفوض کی انجام دہی سے کلیۃً قاصر رہتی ہے۔ میں بھی اس رائے سے پورے طور پر متفق ہوں۔

یہی اتفاق آرا اس ضرورت کے متعلق بھی ہے کہ صدر حکومت کو ہر قسم کی مقامی ذمہ داری سے سبکدوش کیا جائے، اور یہ کہ اس کے فرایض محکوم احاطوں کی عام نگرانی تک محدود کر دیے جائیں اور بالائی صوبوں کے لیے ایک علحدہ چوتھی حکومت قایم کی جائے۔

مغربی صوبوں کے نظم و نسق کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے جو حکومت کلکتہ میں قایم ہوئی ہے اس کی اکمل غیر موزونیت پر مجھے اکثر اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملا ہے اور تحقیقات سے اس رائے کی قطعی طور پر توثیق بھی ہو چکی ہے۔

---

[1] "مجھے اس رائے کے ساتھ کامل اتفاق ہے کہ ہندوستان کی صدر حکومت پر مختلف احاطوں میں سے کسی احاطے کے مقامی نظم و نسق کا آیندہ کوئی بار نہ پڑنا چاہیے۔" ڈبلیو۔ بی۔ بیلی۔

"یہ امر ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ صدر حکومت مقامی نظم و نسق کے بار سے آزاد رہے" سر چارلس مٹکاف۔

* Source.—Minute of Lord William Bentinck.

Dated September 14, 1831. (Parliamentary Papers.)

اس امر کے بارے میں کہ صدر حکومت دیگر احاطوں پر اپنی نگرانی کو صرف اس حد تک کام میں لائے جو اس کے حق میں مفید ترین ثابت ہو کوئی بڑا اختلاف آرا نہیں پایا جاتا ہے۔ اب تک یہ نگرانی حقیقی ہونے کی بجائے برائے نام رہی ہے اور حکومت کے عام امور، سیاسی گفت و شنید، عہد ناموں کی ترتیب، اعلان جنگ، اہم مالی انتظامات اور بزمانہ حال تمام ضوابط کی توثیق تک محدود رہی ہے۔

محکوم احاطوں کے نظم و نسق کے ذیلی امور میں صدر حکومت کی کوئی مداخلت نہیں ہے۔ اسلئے ان احاطوں کی کارروائیوں کا علم صرف ان کے مراسلوں کی نقلوں سے جو مجلس نظما کو روانہ کیجاتی ہیں نیز حکومت و سپہ سالار اعظم کے شایع کردہ احکام سے ہوتا ہے۔ اگر صدر حکومت کو ان مراسلوں میں کوئی ایسی بات نظر آئے جو سخت اعتراض کے قابل ہو تو یقیناً اسے احکام کے اجرا کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن یہ نہایت نامناسب ہوگا کہ انتہائی ضرورت کے بغیر اس اختیار کو کام میں لایا جائے کیوں کہ فعل سرزد ہونے کے بعد اس کی عام تردید سے ماتحت حکومت کسی قدر پریشانی و پشیمانی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جب تجویز فیصلہ مجلس نظما کے زیر غور ہو تو صدر حکومت بھی اپنے بالادستوں کے روبرو اسی قسم کی قابل اعتراض حیثیت میں پائی جاسکتی ہے اور متضاد احکام و آرا کے سرکاری اعلان سے لازماً زیادہ دقت پیدا ہوگی۔

ماتحت حکومتیں فطری طور پر اپنی کامل آزادی کے لیے خوب جھگڑتی ہیں۔ ان کے ضوابط کو صدر حکومت کی منظوری کا محتاج بنانے پر انھوں نے شد و مد کے ساتھ اعتراضات کیے حالانکہ اس امر کا سمجھنا مشکل معلوم ہوگا کہ عام خوف و خطر یا کسی دوسری شدید ناگہانی ضرورت کے موقع کے سوا قانون سازی میں مزید بحث و مباحثہ غور و خوض اور وسیع تر تجربے سے نیز ان تدابیر کی کامیابیوں کے باہم مقابلے سے جو ایک ہی قسم کی خرابیوں کے ازالے کے لیے استعمال کی گئی ہوں فایدہ اٹھانے کی بجائے اور کیا صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ اسی نظریے کی بنا پر اپنی فہم و فراست سے معزز مجلس نظما نے فیصلہ صادر کیا ہے۔ لیکن نظم و نسق سے متعلق دیگر تمام کارروائیوں میں کیا خرابی پیدا ہو سکتی ہے اگر قانون کی یکسانی سے

کنارہ کشی اور حکام انگلستان کے احکام سے رُوگردانی کا (جن سے گریز اختیار کرنے میں بڑی سہولت دُنزغیب کا سامان اس قدر دُور دراز منقدر حکومت سے متواتر استمزاج کرنے کے باعث غیر محدود تاخیر کی بنا پر مہیا ہوتا ہے) اور یا ایں ہمہ مصارف کی فراوانی کا ستعدی کے ساتھ فوری انسداد کیا جائے ؛ محکمۂ فوج میں ایسی مثالیں روزانہ ملتی ہیں کہ ایک فوج کو مراعات خاص عطا کی گئی ہے جس کے لیے دوسری فوج کے عہدہ دار و سپاہی خواہ یورپی ہوں یا ہندوستانی یکساں حق جتا سکتے ہیں۔

مذکورۂ بالا خیالات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مجلس اور میرے رفیقوں کے تائیدی بیان کے بموجب میں صدر حکومت کا حامی ہوں جس کے فرائض محض عام نگرانی و سربراہی تک محدود ہونے چاہئیں لیکن میری یہ حمایت دیگر احاطوں پر صدر حکومت کا اقتدار موثر تر ہونے کی ضرورت سے متعلق ہے اور میں اسے ممکن العمل خیال کرتا ہوں بشرطیکہ بنگال کو دو احاطوں میں تقسیم کرنے کی مجوزہ تبدیلیٔ عظیم جس پر مقامی و عملی اہم اعتراضات وارد ہیں عمل میں نہ آئے اور وہ مصارفِ گراں برداشت نہ کیے جائیں جو اس تجویز عظیم کے باعث عاید ہوں گے، اگرچہ میں اس بارے میں مسٹر بیلی کا بالکل ہم خیال ہوں کہ ایسے اعلیٰ مقصد کے مقابلے میں جیسا کہ ایک وسیع سلطنت (بنگال) کی حکومت کا زیادہ ترقی یافتہ ہونا ہے بڑے سے بڑے پیمانے پر بھی مزید مصارف کا بار ایک لمحے کے لیے قابلِ غور نہیں ہے۔

میرا پہلا اعتراض احاطۂ بنگال کو دو علیحدہ حکومتوں میں منقسم کرنے پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بالائی اور نشیبی صوبوں کے درمیان تفریق کرنے والی ایک حدِ فاصل موجود ہے اور یہ صوبے آب و ہوا، خصوصیات اور سیاسی حالات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دونوں صوبوں کی حدود میں مال اور عدالت کے حکام کا ہونا ضروری ہے جن پر دراصل ان کے حقوق و اغراض کا انحصار ہے۔ لیکن دیگر اعتبارات سے ان صوبوں کے عام مفاد میں بڑا باہمی تعلق ہے چنانچہ ایک ہی دریا مغرب سے مشرق تک تمام مملکت پر محیط ہے، ایک ہی بندرگاہ میں اس کی تمام پیداوار وصول ہوتی ہے، کلکتہ مبادلے کا بڑا مقام ہے جہاں سارا بیوپار اور روپیے کا لین دین ہوتا ہے۔

ہو گی۔ ان اسباب نیز دیگر متعدد وجوہ کی بنا پر حکومت کی تقسیم نہایت نامناسب ہو گی۔
پس احاطۂ بنگال کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ وہ تمام علاقے جن پر اس وقت وہ مشتمل ہے حسب حال گورنر جنرل باجلاس کونسل کے تحت رہیں لیکن دار الحکومت بالائی صوبوں میں قایم کیا جائے جہاں وہ تمام اہم ترین مالی، فوجی اور سیاسی معاملات کا مرکز ہو کیونکہ براہ راست نگرانی کے علاوہ بعید ترین صوبوں سے فوری مراسلت اور جملہ کاروبار کی انجام دہی کے لیے جتنی زیادہ آسانیاں الہ آباد میں موجود ہیں وہ اور کسی جگہ نہیں ہیں اس یادداشت کے ساتھ ایک نقشہ منسلک کرتا ہوں جس سے ہمارے اہم ترین کاروبار کے ساتھ اس شہر کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اودھ، ساگر اور نربدا کے علاقوں سے نیز بندیل کھنڈ سے بالکل متصل ہے اور اس کے زیر نگرانی بالائی صوبوں کا بندوبست مالگزاری ہے جس کی حکومت اور رعایا کے نزدیک بڑی اہمیت ہے اور جو آیندہ اپنی مذموم حالت پر برقرار نہیں رہ سکتا۔ گوالیار، مالوہ اور راجپوتانہ کے علاقوں پر براہ راست نگرانی کے آسان ذرایع پوری طرح مہیا ہو سکتے ہیں اور بشرط ضرورت وہاں ذاتی طور پر آمد و رفت بھی ہو سکتی ہے۔ الہ آباد سے ایک دخانی کشتی دریائے جمنا کے کنارے آگرہ یا دلی اور اسی قدر فاصلے کے کسی مقام پر جو دریائے گنگا سے متصل ہو چار یا پانچ روز میں پہنچ جاتی ہے۔ نیز الہ آباد میں حکومت کو جیسا کہ جماعت مقننہ کا منشا ہے کونسل میں سپہ سالار اعظم سے مشورہ کرنے کا موقع مل سکتا ہے جس کا صدر مستقر آیندہ ہمیشہ بالائی صوبوں میں ہونا چاہیے اور میں اس پیش گوئی کی جرأت کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ وہیں رہیگا۔

لیکن صدر حکومت کو جزدی امور کے بارے سے جس کے باعث اب تک اس کا قیمتی وقت نامناسب طریقے پر صرف ہوتا رہا ہے سبکدوش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک ماتحت حکومت ان اختیارات کے ساتھ جو کونسل کے نائب صدر کو حاصل ہیں احاطۂ بنگال میں قایم ہو اور گورنر جنرل باجلاس کونسل کے احکام کی تابع ہو اور وہ نشیبی صوبوں اور ہمارے تمام مشرقی علاقوں میں مال، عدالت کے نظم و نسق کی نگرانی کرے اور کلکتہ میں ہر کام انجام دے۔ اب چونکہ

اکتوبر سے کلکتہ میں میری غیر حاضری رہی ہے اور میں نے احاطۂ بنگال کی تمام کارروائیوں کی سماعت ونگرانی کا کامل اختیار اپنے لیے بعینہ اسی طریق عمل کے محفوظ کرلیا تھا جو گورنر جنرل باجلاس کونسل کا تصورت قیام الٰہ آباد ہونا چاہیے اس لیے میں اس حقیقی تجربے کی بنا پر اس خیال کی جانب مایل ہوں کہ صدر حکومت احاطۂ بنگال کے براہ راست انتظام سے دست بردار ہوئے بغیر سلطنت کے عام معاملات پر کافی توجہ مبذول کرسکتی ہے۔

یہ امر بھی پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا کہ ماتحت حکومتوں کے نظم ونسق میں گہری مداخلت واقع ہو، مداخلت میں تیزی اور رخنہ اندازی کی بجائے تنقیح روک تھام اور انسداد کا پہلو ہونا چاہیے۔ صدر حکومت کو اپنے وطن کے احکام کی تائید کرنی چاہیے نہ کہ ان کی تنسیخ۔ وطن کی ہدایات میں جو نقایص اور کمزوریاں، بعدِ مسافت، اجرائے احکام میں تاخیر اور بے شمار مسایل کے عام حالات واصلی واقعات کی پوری پوری واقفیت نہ ہونے کے سبب سے پیدا ہوں ان کی وہ تلافی کرے۔ اس کا فرض ہوگا کہ جدید دستور کی حالیہ منظوری کے مطابق قانون کی پابندی کرے، تمام نئے مصارف کو روکے، فوجی عملے سے متعلق مختلف امور میں ان تمام تغیرات کا سد باب کرے جو مجلس نظما کے احکام کے باوجود واقع ہو رہے ہیں اور خاصکر تمام احاطوں کی فوجوں کی عام تقسیم کا اس طرح بندوبست کرے کہ یہ ساری تنظیم متحدہ طور پر عام مدافعت کے کام آئے۔ لیکن صدر حکومت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ ان فرائض کا قلیل ترین حصہ بھی دوسری حکومتوں کے مقاصد قبل از وقت معلوم کیے بغیر ادا کرسکے اور اس کی انجام دہی کے واسطے یہ ضرورت داعی ہوگی کہ ان کی کارروائیوں کی تمام رُوداویں جیسا کہ کل ماتحت حکومتوں کا معمول ہے اول راست صدر حکومت کو بھیجی جائیں اور بعد ازاں ان کی نقلیں معزز مجلس نظما کی آگاہی کے لیے روانہ کی جائیں۔

صدر حکومت کے دستور کے متعلق یہ طے ہوسکتا ہے کہ اسے حسب حال برقرار رکھا جائے یا اس لحاظ سے کہ اب چوں کہ سارا ہندوستان، برطانوی حکومت کے زیر نگین ہے اس لیے اس کے طرز حکومت میں یکسانی پیدا کرنے کی ضرورت ہے

یہ امر قابل ترجیح سمجھا جائے کہ دستور مذکور کی ترتیب ایسی ہو کہ گورنر جنرل کے ساتھ تینوں احاطوں سے ایک ایک رکن کونسل منتخب کیا جائے۔ اس طرح ان سب کا علم و تجربہ عام اغراض ترقی کے لیے منتج ہوگا۔ اس قسم کے ذرایع کی بدولت اگر سر تھامس منرو کی اعلیٰ انتظامی قوت کو بنگال کے بندوبست مالگزاری میں دخل ہوتا اور ہمارے نظم و نسق کے اس شعبے سے عملی طور پر اس کا تعلق قایم کیا جاتا تو بندوبست مذکور میں کس قدر ترقی ہو جاتی؟

۱۸۳۳ء کے قانون (منشور) سے جیساکہ مندرجِ بالا اجمال سے ظاہر ہو چکا ہے یہ طے پایا کہ احاطۂ بنگال، صدر حکومت ہی کی راست نگرانی میں رہے لہذا جب تک کہ ۱۸۳۳ء میں جدید قانون (منشور) نافذ نہ ہوا اس صوبے کے لیے کوئی لفٹنٹ گورنر مقرر نہیں کیا گیا۔ اگرچہ ایک نیا صوبہ بنایا گیا مگر بعد کو اس کی بجائے ایک لفٹنٹ گورنری کے قیام کی تجویز قرار پائی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں کمپنی کے علاقوں کی ساری سیول اور فوجی حکومت کی سربراہی، رہنمائی اور نگرانی کے اختیارات گورنر جنرل باجلاس کونسل کے تفویض کیے گئے۔ مجلس نظما نے اپنے مراسلہ محولِ بالا میں چند اصول پیش کیے جن کے زیر عمل صدر حکومت سے ماتحت حکومتوں کے روابط رہنے چاہییں۔

صدر حکومت سے ماتحت حکومتوں کے روابط*

اب ہم آپ کے اُن جدید روابط پر جو ماتحت حکومتوں سے قایم ہوں گے قانون سازی میں آپ کی برتری کے لحاظ سے نہیں بلکہ دیگر اعتبارات سے غور کریں گے۔

۷۷۔ دفعہ ۳۹ کے (حسب ذیل) الفاظ نہایت جامع ہیں:

"ہندوستان میں کمپنی کے مالی حلقوں اور دیگر تمام علاقوں کی ساری سیول اور

---

* Source.—Despatch accompanying the Goverment of India Act, 1833 (3 & 4 Will. IV, s. 5). Dated 10 December, 1834. From the Board of Directors, East India Company, to the Government of India. (Parliamentary Papers.).

فوجی حکومت کی سربراہی، رہنمائی اور نگرانی کے اختیارات گورنر جنرل باجلاس کونسل کے تفویض کیے جائینگے"۔

۷۸۔ جو اختیارات یہاں بیان کیے گئے ہیں ان کے الفاظ کی تصریح جب پوری وسعت کے ساتھ کی جاتی ہے تو وہ حکومت کے سارے اختیارات پر حاوی ہوجاتے ہیں اور یہ امر بدرجۂ غایت ضروری ہے کہ آپ اس وسیع ذمہ داری کو جو اس طرح آپ پر عاید کی جاتی ہے بخوبی سوچیں اور ذہن نشین کریں۔ ہندوستان کی تمام سیول اور فوجی حکومت آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اس کے نظم و نسق کی خوبی یا خرابی کے متعلق مدح یا مذمت آپ پر اثر انداز ہوگی۔

۷۹۔ مختلف احاطوں میں آپ کے اختیارات قانون سازی سے متعلق موضوع پر ہم نے عام نظایر کے جو حوالے دیے ہیں وہ فی الحال کافی ہونگے۔

۸۰۔ دیگر اختیارات کے بارے میں جن کے استعمال کی جانب آپ کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے آپ پر لازم ہوگا کہ جو امور مقامی اور ماتحت حکومت سے واقعی تعلق رکھتے ہیں اور جو صدر حکومت سے متعلق ہیں جس کی حکمرانی یا نگرانی تمام ماتحت حکومتوں پر ہے ان کے درمیان زیادہ جانچ اور غور و فکر کے ساتھ ایک صحیح حد تفریق قایم کریں۔

۸۱۔ یہ حد تفریق جب نامناسب طور پر قایم کی جاتی ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر حکومت، مقامی حکومت کے صوبے میں مداخلت کرکے تفصیلات میں پڑ جاتی ہے جن پر وہ قابو نہیں پا سکتی اور جو اُسے اپنے اہم ترین فرایض پر غور کرنے سے باز رکھتی ہیں یا یہ کہ وہ اپنی توجہ کو متعدد شہادت طلب واقعات سے پھیر لیتی ہے جو مقامی حکومت کے عام طریقے کی بنا پر صحیح یا غلط ہو سکتے ہیں اور اس طرح سلطنت، صدر حکومت کی سربراہی و نگرانی کے فواید سے جزوی طور پر محروم ہو جاتی ہے۔

۸۲۔ یہ سچ ہے کہ پارلیمنٹ کے سابق قوانین نے جن کی رو سے بنگال کی مقامی حکومت کو صدر حکومت کی حیثیت حاصل ہوئی گورنر جنرل باجلاس کونسل کو دیگر احاطوں کی سربراہی و نگرانی کا ایسا عظیم و کامل اختیار عطا کیا تھا جیسا کہ حیطۂ تحریر میں آسکتا تھا اور ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ امر جماعت مقننہ کے منشا کے مطابق تھا۔

لیکن عملاً صدر حکومت نے اپنے اس اختیار سے بہت کم کام لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا تھوڑا سا استعمال بھی علی العموم ایسے مواقع پر کیا گیا جب کہ اس سے مفید اثرات مترتب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا مثلاً ایسے موقع پر جب کہ ماتحت حکومت آزادی سے اپنا کام کر سکتی تھی، اس طرح صدر حکومت نگرانی و ذمہ داری کی خصوصیت سے مداخلت قایم رکھتی۔ اس قسم کی مداخلت ہمیشہ وسعت کش ہو کر محض فعل مابعد سے قریب وہ ہوتی اور اکثر صورتوں میں تو اس سے قریب ہی قریب ظاہر ہوتا کیونکہ جو فعل پہلے سرزد ہو چکا ہو اس پر خواہ کتنی ہی ملامت کیوں نہ کیجائے اس کا پلٹ کر اصلاح پذیر ہونا امکان سے باہر ہے۔

۴۲۔ حال کے قانون کا صریحاً یہ منشا ہے کہ جماعت مقننہ کے اُس مقصد کو عمل میں لائے جس کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے۔ چونکہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں حکومت کے جملہ اختیارات آپ ہی کو دیے گئے ہیں اور آپ ان تمام علاقوں میں عمدہ حکومت کے ذمہ دار ہیں اس لیے آپ کو غور کرنا چاہیے کہ ان اختیارات کا استعمال مقامی حکام سے یا اس وقت جبکہ انہیں آپ کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے کس حد تک اور کن شعبوں میں بہترین طور پر ہو سکتا ہے۔ حکومت کے فروعی امور کے بارے میں جنہیں آپ بالکلیہ مقامی حکام پر چھوڑتے ہیں اور جن میں آپ کی گہری مداخلت بے سود ہے آپ کا یہ فرض ہوگا کہ ہمیشہ اپنے سامنے کافی ثبوت مہیا رکھیں جو اس امر کی تنقیح میں مدد دے سکے کہ آیا عام کاروبار کی رفتار ٹھیک ہے یا نہیں اور اس ثبوت کی جانب ایسی عاجلانہ توجہ مبذول کریں جس سے آپ کو ضرورت کے وقت فوری مداخلت کا موقع یقینی طور پر مل سکے۔

۴۳۔ علی العموم یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُن تمام صورتوں میں جہاں حکومت کے مختلف مدارج ہوں صحیح طریق کار کا انحصار بیشتر صدر حکومت نیز ماتحت حکومتوں کی دانشمندی و اعتدال پسندی پر ہوتا ہے۔ یہ اصول خاص طور پر ایک ایسے عجیب و غریب طریق حکومت پر صادق آتا ہے جیسا کہ ہماری سلطنت ہند کا ہے۔ جماعت مقننہ کی طرح ہمارے لیے بھی یہ ناممکن تھا کہ جائز نگرانی اور غیر اہم جزئیات کی بیجا مداخلت کے درمیان ٹھیک ٹھیک حدود کو بیان کیا جائے۔ ہم اپنے گورنر جنرل

باجلاس کونسل اور دیگر گورنروں کی معاملہ فہمی پر بھروسا کرتے ہیں کہ قانون کے نفاذ کا جو طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ اس کے اصلی منشا کے مطابق ہوگا اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اعلیٰ ترین حکومت کو نقصان پہنچائے یا اس کی طرف داری سے باز رہے بغیر ہر ماتحت حکومت کی واجبی عظمت و قوت کے تحفظ کے امکان پر شک و شبہہ کریں۔

۹۲۔ احاطۂ بنگال کو دو احاطوں میں تقسیم کرنے کے لیے خاص نوعیت کی کارروائیاں عارضی طور پر درکار ہوں گی۔ حکومت آگرہ جب ایک مرتبہ قایم ہو جائے اور اس کا نظم و نسق چلانے کے انتظامات مکمل ہو جائیں تو یہ حکومت وہی راستہ اختیار کرے گی جس پر دوسری حکومتیں گامزن ہیں مگر اس دوران میں ان انتظامات پر آپ کی زیادہ توجہ کی ضرورت ہوگی۔

۹۳۔ نیز ہم نے آپ کو مطلع کر دیا ہے کہ احاطۂ فورٹ ولیم کے مقامی نظم و نسق میں گورنر جنرل کی اعانت کے لیے ایک علیحدہ کونسل کا قیام ہمارے پسند خاطر ہے نہ وہ ہمارے خیال میں لازم ہے۔ اس اعتبار سے گورنر جنرل کو بنگال کے بارے میں دو قسم کے فرایض انجام دینے ہیں: اول حکومت بنگال پر نگرانی رکھنے میں اپنی کونسل کے ساتھ اشتراک عمل کرے، اور دوم کونسل کے بغیر یا اگر کوئی کونسل ہو تو اس کے صدر کی حیثیت سے صرف اسی حکومت کا کام جاری رکھے۔

۹۴۔ بالکل بدیہی بات ہے کہ ایک نہایت اہم فرض ایسی تجویز کے مستحکم کرنے میں آپ کو انجام دینا ہوگا جس کے ذریعے گورنر جنرل کے مختلف فرایض باہم ایک دوسرے پر ذرا سا بھی مضر اثر ڈالے بغیر ادا ہو سکیں۔ وہ ایک طرح کے فرایض پر جو وقت صرف کرتا ہے اسے یقیناً دوسری نوع کے فرایض پر نہیں لگایا جا سکتا ہے اور آپ پر لازم ہوگا کہ بدرجۂ غایت محنت و مستعدی کے ساتھ غور کریں کہ گورنر جنرل کے وقت اور توجہ کی تقسیم اور ان دونوں چیزوں کے اس محدود حصے کے باعث جسے وہ اپنے ہر دو قسم کے فرایض کے لیے وقف کر سکتا ہے قبیح نتائج کے برآمد ہونے کا انسداد کس طور پر ہو سکتا ہے۔

۹۵۔ حکومت بنگال پر نگرانی اور اس کی دیکھ بھال کے بارے میں آپ کی جو حیثیت قرار پائیگی اس میں بھی ایک انوکھی چیز موجود ہے۔ یہ صورت حال آپ ہی کے صدر سے متعلق ہے جس پر آپ کو قابو پانا ہوگا اور شاید معاملات کا رُخ اس طرح پلٹے کہ بعض حالات میں سراسیمگی واقع ہو جائے۔ جس خرابی کا امکان ہو اُسے دفع کرنے کے لیے مناسب ہوگا کہ آپ نازک وقت پیش آنے سے قبل ہی اس کے مقابلے کا بندوبست کرلیں۔ ایسی صورت میں بہت کچھ مشکلات دور ہوجائینگی کیونکہ سابق قواعد نافذہ کی پابندی سے ہر قسم کے فریب کا ازالہ ہو جائیگا۔

۹۷۔ جماعت مقننہ نے صدر حکومت کے مستقل و عارضی مرکز کا مقام اُسی کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن گورنر جنرل کو بنگال کا مقامی گورنر بھی بنالنے کی ناگزیر صورت کے باعث یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کا معمولی مستقر ایسی جگہ رہے جہاں وہ اپنے دونوں قسم کے فرایض باحسن وجوہ انجام دے سکے یعنی یہ مستقر بنگال میں ہو۔ پس ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے اس خیال سے اتفاق کرینگے کہ صدر حکومت کا مرکز کلکتہ میں ہونا چاہیے جہاں اب آپ کی رُوداویں جمع کی جاتی ہیں اور جہاں سرکاری و خانگی ضروری عمارتیں بھی پہلے سے موجود ہیں۔

۱۰۱۔ پس ہم نے آپ کی قانون سازی اور نگرانی کے وسیع تر فرایض پر اظہار خیال کر دیا ہے اور آپ کی توجہ اُن امور پر منعطف کرائی ہے جن کے لیے ہمارے خیال میں غور و خوص اور انتظام کی فوری ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ ہم نے اس امید پر کیا ہے کہ ہماری تجاویز سریع الفہم ہو جائیں اور یہ واضح ہو جائے کہ اس طرح کن کن امور پر ہم آپ کے انکار سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔

تیسرا باب

انتظام معدلت

ہند کے سیاسی مسلک کے نشو و نما میں قانون کی اہمیت*

ہمارے زیر غور ہند کے سیاسی مسلک کے وسیع میدان میں قانون ہی کا ایک ایسا دایرہ ہے جس میں انگریزوں نے باریک بینی، دانائی اور ثابت قدمی کی اعلٰی ترین مثال پیش کی ہے اور جہاں قارئین کو جو عملی تعلیم کے خواہاں ہیں بہت سی باتیں سیکھنے کے قابل معلوم ہونگی۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ کام نہایت اطمینان بخش رہا ہے۔ یا بڑی بڑی غلطیاں سرزد نہیں ہوئی ہیں بلکہ یہ کہ انگریز کسی کام کو ادھورا نہیں چھوڑتے ہیں۔ لیکن ان سے جو غلطیاں واقع ہوئیں اور جو متواتر خیالات انہیں متاثر کرتے رہے وہ بجائے خود سبق آموز ہیں اور میں اس بارے میں اتنا اضافہ کرونگا کہ انگلستان سے

---

*Source.—"Administrative Problems of British India."

M. Chailley. (Macmillan.)

قوانین ہند پر جو تنقید ہوتی رہی ہے اس کی جانچ اگر غیر جانب داری سے کی جائے تو ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ آیا کوئی دوسری قوم بہتر تنقید کر سکتی یا انگریزوں نے جو غلطیاں کیں ان سے بچنے کی کوئی صورت بھی وہ نکال سکتی تھی۔
کام پیچیدہ تھا۔" اس میں یہ تردد مضمر تھا کہ جو ہو چکا ہے اس کا ایک جزو قایم رکھا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ فیاضانہ خواہش شامل رہے کہ جو ہونا چاہیے اس کا ایک جزو بھی رائج کر دیا جائے۔" اس قسم کی مرکب آرزو کی تکمیل میں اکثر بھاری غلطیاں وقوع میں آسکتی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی قابل احترام ہے۔ جو کچھ لوگوں کے امکان میں تھا وہ انھوں نے کیا ہے اور باقی کو زمانے پر چھوڑ دیا۔ گاہ بگاہ یہ ہو سکتا ہے کہ قانون لوگوں سے آگے نکل گیا ہو لیکن اگر ایسی صورت پیش آئے تو لوگ تیز رفتاری سے قانون تک پہنچ جاتے ہیں۔

کلائیو جو ہند کی برطانوی مملکت کا حقیقی بانی ہے تجارتی نو آبادیوں کو ملکی علاقوں میں تبدیل کر چکا تھا اور اس وقت سے ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی اغراض کی بہ نسبت حکومتی کاروبار کی جانب زیادہ متوجہ تھی۔ اسے ایک وفادار قوم کی رہنمائی حفاظت اور نگہبانی کرنی پڑی چند ہی سال میں ان جدید فرائض نے قدیم خیالات میں تغیر پیدا کر دیا۔ برطانوی کارپردازوں کی نظر میں انگلستان کے قوانین کی ہمہ گیر خاصیت باقی نہ رہی۔ لہذا مقامی قوانین و رسوم پر نہ صرف ان کی اصلی خوبیوں کے لحاظ سے وہ غور و خوض کرنے لگے بلکہ ان کی وقعت کے سبب سے بھی جو ہندوستانیوں کے نزدیک قایم تھی۔ فی الحقیقت اہل برطانیہ مقامی سیاسی مسلک کی خاصیت و ضرورت کو خاطر خواہ اہمیت دینے لگے تھے۔ وہ اپنے یورپی رقیبوں یعنی فرانسیسوں اور ولندیزیوں کو شکست دے چکے تھے لیکن اس وقت انھیں اس بات کا علم نہ ہوا کہ جو فتح انھیں حاصل ہوئی ہے وہ کس حد تک مکمل ہے۔ آیندہ پچاس سال تک انھیں فرانسیسی مداخلت کے خطرے سے پریشانی لاحق ہوتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ہند کی وسعت عظیم کا صحیح علم حاصل کرنا شروع کیا۔ ان کے لیے کلائیو نے جو علاقے فتح کیے تھے وہ باقی ماندہ دور و دراز علاقوں کے مقابلے میں ادنی تھے۔ مغل شہنشاہ کے اسم گرامی سے اس وقت

بھی احترام اور رعب و داب ہویدا تھا۔ اہل برطانیہ اپنی مفتوحہ اقوام سے پوری طرح واقف نہ تھے مگر ان کی قوت و بزرگی کو تسلیم کرتے تھے۔ انگلستان فاصلۂ دراز پر ہونے کے باعث نیز اپنی یورپی (اور ساتھ ہی امریکی) حکمت عملی کی بنا پر ہندوستان کے کاروبار سے بے خبر تھا اور اسی اثنا میں کمپنی نے یورپی رقیبوں کے خلاف اس کے رشک و حسد اور حقارت میں اضافہ کر دیا۔ اس پر یہ اعتماد نہ ہو سکتا تھا کہ ایشیا میں اس سے کوئی بڑی مدد مل سکے گی۔ اس طرح بنگال اور مدراس کے عہدہ داران کمپنی نے اپنے کو یکساں طور پر غیر مستقل حیثیت میں پایا۔ ناعاقبت اندیش طرز عمل اور مفتوحہ اقوام کو برانگیختہ کرنے والی تدابیر سے اس بات کا امکان تھا کہ یہ امن پسند لوگ محض اپنی کثیر تعداد کے ذریعے اس حکومت کا خاتمہ کر دیں جو اپنے علانیہ ضعف کی بہ نسبت فی الواقع بہت زیادہ کمزور ہے اور اس طرح ایک سو پچاس برس کی محنت ایک گھنٹے میں رائیگاں جائے۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور اسی سوال سے حقیقی معنے میں ایک مقامی سیاسی مسلک کی بنا پڑی اور اس کی بدولت کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ امر ضروری تھا کہ ہندوستانیوں میں کسی قسم کی بے اطمینانی پیدا نہ ہونے پائے لیکن اس کے ساتھ ہی یورپیوں کے وقار میں کمی واقع ہو نہ مغربی اخلاق کا جن کے وہ نمایندے ہیں ایثار کیا جائے۔" اس طرح ہمارے نزدیک مقامی سیاسی مسلک کے معنے یہ ہیں کہ ایک طرف عملی طور پر دوسروں کے عقاید کا ایسا احترام کیا جائے کہ اس سے اپنی کمزوری کا اظہار نہ ہو اور دوسری طرف اپنے خیالات کی یوں حفاظت کی جائے کہ خلاف انسانیت فعل سرزد نہ ہو۔"

پس ہند کے سیاسی مسلک کے یہ مقاصد خود اس قانون کے متعلق تھے جو برطانوی حکمرانوں نے اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ ایم۔ چلی نے بجا طور پر ان اہم غلطیوں کی جانب اشارہ کیا ہے جو منزل مقصود کی راہ معلوم کرنے میں کی گئی ہیں۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ ہم ان بے شمار مشکلات کی طرف اپنا ذہن منتقل کریں جن کا سامنا کمپنی کو اپنے ابتدائی زمانے میں کرنا پڑا تھا جبکہ چند تاجروں نے نہایت کوتہ اندیشی کے ساتھ اور "خالی الذہن" ہو کر لاکھوں انسانوں کی سیاسی ذمہ داریاں

اپنے سر لے لیں جن کو انھوں نے نہیں سمجھا اور انتظامی کل جو بہت ضروری تھی چلانے کے کوئی آثار بھی ان میں نہیں تھے۔ لہذا غلطیوں کا موجود ہونا تعجب خیز نہیں ہو سکتا۔

ان میں سب سے زیادہ منحوس کوشش وہ تھی جو ۱۷۷۳ء کے قانون تنظیم کے مطابق انگریزی قانون کو ایک ایسی قوم میں رائج کرنے کے لیے گئی جس سے اس کو سمجھنے یا اس کی خوبیوں کی قدر کرنے کی بہ مشکل توقع ہو سکتی تھی۔ کپتان کیبی لکھتا ہے کہ "ڈنیے انگریز جج" انگریزی قانون کی خوبیوں اور نرمیوں کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز خیالات اپنے ساتھ ہندوستان لے گئے۔ وہ دست گیری کی غرض سے باہر نکلے تھے مگر تباہی کا باعث ہو گئے۔ انتظام و امن کو قائم و برقرار رکھنے کی بجائے انھوں نے نظم و نسق میں انتشار پیدا کر دیا اور نہایت ناشائستہ فساد برپا کیا۔ ان کی طرف سے رعایا پر برکت کی بجائے لعنت نازل ہوئی اور اس کی حفاظت کے عوض دہشت طاری ہوئی"۔ اس صورت حال کا خاکہ میکالے نے اپنے مضمون متعلقہ وارن ہیسٹنگس میں بڑی صفائی کے ساتھ کھینچا ہے۔

اس تجربے کے نتائج اس قدر تباہ کن ثابت ہوئے کہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ انگریزی قانون کا تعلق آیندہ ملک کے مقامی باشندوں سے نہ رہے۔ پٹ نے لارڈ کارنوالس کے نام اپنی ہدایات میں یہ خواہش ظاہر کی کہ "حکومت کے خیالات و مفاد کو رعایا کے موجودہ اطوار و رسوم کے موافق ڈھالا جائے اور انہیں اُن دقیق نظریوں کے ساتھ نہ ملایا جائے جو دیگر ممالک سے اخذ کیے گئے ہوں یا مختلف حالات پر چسپاں ہوتے ہوں"۔ ہندوستانیوں کے آپس کے مقدمات میں بھی جو صدر عدالت کی اختیاری حدود میں ہوں ہندو یا مسلمان فریق کی ذات سے متعلق قانون کی جانچ ضروری تھی چنانچہ یہ اہم اصول طے پایا کہ رعایا کے عقاید و رسوم کا احترام کیا جائے لیکن وقتاً فوقتاً ترمیمات اور تغیرات ناگزیر تھے اور انہیں ضوابط کی شکل میں مدون کیا گیا۔ ان ضوابط کو گورنر جنرل با جلاس کونسل نے ۱۷۷۳ء کے قانون تنظیم کی رو سے رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بنگال میں اور مدراس و بمبئی کی حکومتوں نے جنہیں علی الترتیب ۱۸۰۰ء و ۱۸۲۳ء میں اسی قسم کے اختیارات دیے گئے تھے اپنے

اپنے علاقوں میں بذریعۂ اعلان شائع کر دیا۔

بہرکیف یہ تجربہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ جو چیز نظریے کی حیثیت سے عمدہ معلوم ہوتی تھی وہ عمل کی صورت میں ناکارہ ہو گئی۔ اس امر کے متعلق کہ کیا قانون کیا ہے اور کیا نہیں ہے غیر متوقع پریشانی اور قابل افسوس پیچیدگی موجود تھی۔ سر کرٹینے البرٹ نے اس پریشانی کو جو اس وقت پھیلی ہوئی تھی حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

اس زمانے میں قوانین موضوعہ کے پانچ مختلف مجموعے سلطنت (ہند) میں نافذ تھے۔ پہلا مجموعۂ قوانین موضوعہ کے اس تمام موجودہ حصے پر مشتمل تھا جو اپنی ممکنہ حد تک جاری تھا۔ اس کا نفاذ جارج اول کے منشور کے ذریعے عمل میں آیا تھا اور یہ کم از کم دارالامارات میں رائج تھا۔ دوسرے مجموعے میں زمانۂ مابعد کے وہ تمام انگریزی قوانین تھے جو صریح طور پر ہند کے مختلف علاقوں میں رائج کیے گئے تھے۔ تیسرا گورنر جنرل کی کونسل کے ضوابط کا مجموعہ تھا جس کا نفاذ ۱۷۹۳ء کے مرتبہ مجموعۂ قوانین کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ مجموعہ (جس میں گزشتہ بارہ سال کی قانون سازی کے نتائج شامل تھے) اڑتالیس ضوابط پر مشتمل تھا جو سب کے سب ایک ہی روز مرتب ہوئے تھے اور جن پر ۱۸۳۴ء تک برابر عمل ہوتا رہا۔ ان ضوابط کے زیر اثر صرف بنگال کے علاقے تھے۔ چوتھے مجموعے میں مدراس کی کونسل کے ضوابط مدون تھے جن کی اشاعت بتیس ۳۲ سال یعنی ۱۸۰۲ء سے ۱۸۳۴ء تک رہی۔ یہ ضوابط احاطۂ فورٹ سینٹ جارج میں نافذ ہوئے اور وہاں اب بھی جاری ہیں۔ پانچواں مجموعہ بمبئی کے ضوابط کا تھا جن کی ابتدا ۱۸۲۷ء میں مسٹر ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کے ترمیم شدہ مجموعۂ قوانین کے ساتھ ہوئی۔ ان ضوابط میں سابق اٹھائیس ۲۸ سال کی قانون سازی کے نتائج شامل تھے اور یہ ضوابط موثر و معقول طور پر احاطۂ بمبئی میں ۱۸۳۴ء تک جاری رہے۔

پس ۱۸۳۳ء کے قانون کے ذریعے رعایا کے حقوق و جذبات اور اس کی عجیب و غریب رسوم کا واجبی لحاظ کرتے ہوئے قوانین ہند کی کامل تدوین و ترتیب کا انتظام کیا گیا۔ اس سلسلے میں قانون کی دو ذیلی مجلسوں نے جو کام انجام دیا اس کا

حال ذیل میں درج ہے :-

*برطانوی ہند میں قوانین کی تدوین

برطانوی ہند کو مکمل و معین نظام قوانین عطا کرنے کی تجویز غالباً اُس مراسلت سے وجود میں آئی جو سر چارلس مٹکاف اور بنگال کے دو ججوں کے مابین تقریباً ۱۸۲۹ء میں واقع ہوئی۔ ۱۸۳۳ء میں اس تجویز کو ہند کے قانون منشور کی تجدید کے وقت پارلیمنٹ نے قبول کر لیا۔ قانون منشور بابت ۱۸۳۳ء کی رُو سے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے ذریعے ایک قانونی مجلس کے تقرر کا انتظام ہوا تاکہ عدالت اور کوتوالی کے موجودہ محکموں کے قواعد و اختیارات اور ان کی حدود کی تحقیقات کی جائے، قوانین کی نوعیت و دایرۂ عمل کی دریافت خواہ وہ برطانوی ہند کے کسی حصے میں رائج ہوں عمل میں آئے اور اقوام کے اختلاف مذاہب کی تفریق اور اُن رسوم و خیالات کو جو برطانوی ہند کے مختلف علاقوں اور گوناگوں فرقوں میں پھیلے ہوئے ہیں بخوبی ملحوظ رکھتے ہوئے تحقیقات مذکور کے متعلق رُوداد یں اور ان کی بنا پر ترمیمیں پیش ہوں۔

اس طرح ان اختیارات کے بموجب ہندوستان میں پہلی قانونی مجلس ۱۸۳۴ء میں مقرر ہوئی۔ یہ ابتدا میں میکالے اور کمپنی کے اُن تین سیول ملازموں پر مشتمل تھی جن میں ہر احاطے سے ایک ایک تھا۔ تقریباً دو سال کے بعد اس مجلس نے میکالے کے مجموعۂ تعزیرات ہند کا مسودہ شایع کیا۔ بعد ازاں مسٹر ڈرنک واٹر بیتھیون سر بارنس پیکاک اور دیگر اشخاص نے اس مسودے کی نظر ثانی کی اور اسے ۱۸۶۰ء تک قانونی حیثیت حاصل نہ ہوئی حالانکہ مجلسِ مذکور کو برخاست ہو کر ایک مدت گزر چکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے میکالے کی روانگی کے بعد مجلس کا بہت کچھ اثر جاتا رہا۔ یہ مجلس اپنی خستہ حالت میں بھی کئی سال تک قائم رہی اور اس نے اپنے میقاتوں میں رُودادوں کی ضخیم جلدیں شایع کیں مگر تدوین قوانین کے متعلق کسی تجویز کے عمل میں لانے کے لیے حکومت کو متاثر یا مائل کرنے میں ا سے

*Source.—"Legislative Methods and Forms," by Sir Courtenay Ilbert. (Clarendon Press, Oxford.)

کامیابی نہ ہوئی اور انجام کار مجلس برخاست کر دی گئی۔ ہند کے آخری قانون منشور بابت ۱۸۵۳ء میں ماموریں کی محنت و مشقت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ "انہوں نے مسلسل طور پر رُودادوں میں عدالتی عملے، عدالتی طریق کار اور نفاذ یافتہ و رائج شدہ قوانین ہند کے متعلق وسیع تغیرات کی سفارش کی ہے اور ان انتظامات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے جن کا اجرا ان کے نزدیک قانون کے ذریعے ہونا ضروری ہے تاکہ ان کی بعض تجاویز عملی جامہ پہن سکیں اور اس قسم کی رُودادیں وقتاً فوقتاً مجلس نظما کو ارسال کی گئی ہیں مگر ان رُودادوں اور سفارشوں کے اہم تر جزو کا کوئی قطعی تصفیہ نہیں ہوا ہے۔"[1]

بایں وجہ ۱۸۵۳ء کے قانون سے ایک جدید مجلس کے تقرر کا بندوبست ہوا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ سابق ماموریں کی تجاویز اور عدالتی عملے، عدالتی طریق کار اور قوانین ہند کی اصلاح سے متعلق ان کے مجوزہ آئینی احکام نیز مذکورہ عملے، طریق کار اور قوانین کی اصلاح کے بارے میں دیگر ایسے امور کی جو ماموریں برائے معاملات ہند کی منظوری سے بغرض مشاورت ان کے حوالے کیے گئے ہوں کامل تحقیقات، محنت و مستعدی سے عمل میں لائے اور غور و فکر کے ساتھ تمام امور کی جانچ کرے۔

اس طرح دوسری مجلس ۹ نومبر ۱۸۵۳ء کو مقرر ہوئی۔ اس میں آٹھ ارکان تھے جن میں سر جان رومیلی (جو بعد کو لارڈ ہوا) سر جان جروس، مسٹر اڈورڈ ریان اور مسٹر رابرٹ لو شامل تھے۔ ان کے تقرر کے وقت ہند کے دارالامارات میں ملکۂ انگلستان کی اور کمپنی کی عدالتوں کے (جو عدالت عظمیٰ اور صدر عدالت کے نام سے مشہور تھیں) انضمام کے منصوبے کی اطلاع پہلے ہی پارلیمنٹ کو دے دی گئی تھی، لہذا ماموریں کو حکم دیا گیا کہ وہ سب سے اول ان ابتدائی امور کی طرف متوجہ ہوں جو اس غرض کی تکمیل کے لیے اور خصوصاً ایک سادہ و یکساں ضابطۂ طریق کار کی تیاری کے لیے ضروری ہوں۔

---

[1] ہند کی قانونی مجالس کے نام مجلس ماموریں برائے معاملات ہند کا مراسلہ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۳ء۔

۱۸۵۶ء کے وسط تک لندن میں مامورین کے اجلاس ہوتے رہے۔ انھوں نے چار رُوداد یں پیش کیں جن میں عدالت عظمیٰ اور صدر عدالت کے انضمام اور دیوانی و فوجداری کے یکساں ضابطۂ طریق کار کے متعلق ایسی تجاویز درج کی تھیں جو اس انضمام کی بدولت وجود میں آنے والی برطانوی ہند کی عدالتہائے عالیہ اور عدالتہائے ادنیٰ دونوں کے مناسب حال تھیں۔ نیز انھوں نے ایک باضابطہ قانون دیوانی سے متعلق ہند کی ضرورتوں پر توجہ کی اور ان کی تکمیل کے بہترین طریقے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ان مامورین کی سفارشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ اور مجلس وضع قوانینِ ہند دونوں نے اہم قوانین بنائے۔ میکالے کے مجموعۂ تعزیرات پر غور و خوض کیا گیا اور بعد ترمیم ۱۸۶۰ء میں اسے قانون کی شکل میں نافذ کر دیا گیا۔ ۱۸۵۹ء میں ضابطۂ دیوانی کا اور ۱۸۶۱ء میں ضابطۂ فوجداری کا نفاذ عمل میں آیا۔ پارلیمنٹ کے قانون بابت ۱۸۶۱ء (دفعہ ۲۴ و ۲۵ ملکۂ وکٹوریہ باب ۱۰۴) کی بنا پر ہندوستان میں عدالتہائے عالیہ کے قیام کی غرض سے "کلکتہ کی قدیم عدالت عظمیٰ اور صدر عدالت کو حالیہ سند یافتہ عدالت ہائے عالیہ میں ضم کر دیا گیا اور شمال مغربی صوبوں میں دوسری عدالت عالیہ قایم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اس طرح ۱۸۶۱ء میں ہندوستان کو قانون تعزیرات اور ضابطۂ دیوانی و فوجداری حاصل ہو گئے۔ یہ ضابطے بے شبہ غیر سلیس تھے اور ان میں اصلاح کی زیادہ گنجایش تھی لیکن ان سے بڑی حد تک ماقبل کے غیر مربوط و غیر مکمل ضابطوں کی درستی ہو گئی۔

وارن ہیسٹنگز کے عہد حکومت میں عدالتی طریق کار کی دوسری قبیح صورت صدر عدالت اور کمپنی کی عدالتوں کے مابین رقابت کی تھی۔ صدر عدالت کی مداخلت سے کمپنی کی عدالتوں کا اقتدار زایل ہو گیا اور تحصیل مالگزاری تقریباً ناممکن ہو گئی۔ صدر عدالت نے نواب کے اختیارات کو جس کے سپرد فوجداری کا انتظام تھا تسلیم کرنے سے انکار کر کے اور ججوں کے خلاف ناواجب دست اندازی یا قید بلا اختیار قانونی کے مقدموں کی سماعت کر کے فوجداری کے عدل و انصاف کو معطل کر دیا۔ لیکن ۱۷۸۱ء کا قانون نافذ ہونے سے اس قسم کی مداخلت جماعت عاملہ

کے سرکاری فرایض میں نہ ہو سکی۔ اس قانون کی رُو سے کمپنی کی عدالتوں کو تسلیم کیا گیا اور یہ اساسی اصول قایم ہو گیا کہ ہندوستانی باشندے "اس امر کے مستحق ہیں کہ جو قانون ان کی ذات سے متعلق ہو اسی کا استعمال ان کے ساتھ کیا جائے" تاہم صورت حال نہایت غیر اطمینان بخش رہی۔ مقدمات فوجداری میں صدر عدالت نے دارالامارت کے تمام مقیم باشندوں پر نیز تمام یورپیوں پر خواہ وہ کہیں سکونت پذیر ہوں اپنے اختیارات سے کام لیا۔ پس ضلع کا ایک یورپی اگر کسی ہندوستانی کے خلاف کوئی مقدمہ دایر کرنا چاہتا تو وہ کلکتہ کی صدر عدالت میں رجوع ہوتا اور اگر ضلع کا کوئی ہندوستانی باشندہ کسی یورپی کے مقابلے میں کوئی دعویٰ کرتا تو موخر الذکر اپنا یہ حق جتا سکتا تھا کہ مقدمے کا فیصلہ صدر عدالت میں ہو۔ اس طریق کار کی بے ضابطگی ۱۸۳۳ء میں ملک کے اندر یورپیوں کے آزادانہ داخلے سے متعلق عاید کردہ قیود اٹھ جانے کے بعد بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس صورتِ حال کے تضادات کو جیمس مل نے مجلس منتخبہ کے روبرو اپنی شہادت میں بیان کیا ہے جو مندرجِ ذیل ہے۔

صدر عدالت کے متضاد کرشمے*

ہند کی موجودہ صورتِ تضاد کے ذمہ دار ملک کے لوگوں کی ایک جماعت کے غیر معمولی حالات ہیں۔ یہ جماعت فی الحقیقت غیر ملکیوں کی ہے جو بلحاظ تعداد بہت بڑی نہیں ہے مگر بعض حالات میں عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے اور ان حالات کے باعث اسے جو قوت حاصل ہے اس کی بنا پر اُس حکومت کے نافذ کردہ قوانین کی تابع نہیں ہے جس کے زیر سایہ وہ مقیم ہے۔ یہ جماعت اس حکومت کے قوانین سے آزاد رہنے کا حق جتاتی ہے اور حکومت کو اس کے لیے قوانین بنانے کا کوئی اختیار بھی نہیں ہے۔ اس جماعت سے میرا اشارہ ان انگریزوں کی طرف ہے جو ہندوستان میں مقیم ہیں۔ جو امور مدت تک ایک ہی رنگ میں

*Source.—Evidence of James Mill before the Select Committee of 1832. (Parliamentary Papers.)

پائے گئے ہیں ان کو نظر تساہل سے دیکھتے رہنے کی عادت نے ہمیں مذکورِ بالا صورتِ حال کی انوکھی نوعیت کے مشاہدے سے باز رکھا ہے۔ اس طرح کی ایک مثال مختصراً پیش کرنے سے زیرِ بحث موضوع زیادہ آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس ملک میں یعنی انگلستان میں غیر ملکیوں کی ایک جماعت ہے جسے قانون کا پابند بنانے میں بادشاہ یا پارلیمنٹ عاجز ہے اور یہ غیر ملکی رعایا اس ملک کے درمیان ہر طرف پھیل گئے ہیں مگر ہماری عدالتوں کی اختیاری حدود سے باہر ہیں اور اپنے بادشاہ کی صرف ایک ہی عدالت کی متابعت کے سوا جس کو وہ ہماری عدالتوں کے مقابلے میں بالاتر سمجھتے اور ظاہر کرتے ہیں کسی اور کی ماتحتی قبول نہیں کرتے ہیں۔ مزید براں اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ ان کی یہ واحد عدالت، دارالسلطنت میں قایم ہے تاکہ انگریز اس مضرت رسانی کے خلاف جو ان اجنبیوں کے ہاتھوں عمل میں آئے کوئی چارہ سازی نہ کر سکیں بجز اس کے کہ دارالسلطنت پہنچ کر انھیں کی عدالت میں نالش کریں علاوہ بریں یہ کہ یہ غیر ملکی لوگ اپنے عجیب و غریب حالات کے باعث اپنے اندر ایسی قوت رکھتے ہیں کہ شاہ انگلستان کی رعایا کو ان سے دوامی خطرہ لگا ہوا ہے اور وہ ان کے افعال کے خلاف دادرسی کی درخواست کرنے سے ہراساں ہے اور اگر ہم مذکورِ بالا مفروضے میں اتنا اور اضافہ کریں کہ ان کے بادشاہ کی اسی عدالت کو جو ہماری نہیں بلکہ ہمارے دارالسلطنت میں واقع ہے ہمارے تمام باشندگانِ دارالسلطنت کے متعلق عدل گستری کا کامل اختیار حاصل ہے اور اس واحد عدالت کے سوا ہمارے دارالسلطنت کی رعایا کو دادخواہی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے اور خود ہماری حکومت، بادشاہ اور پارلیمنٹ کو ان غیر ملکی ججوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر ایسے قوانین بنانے کا کوئی اختیار بھی نہیں ہے جن کی پابندی دارالسلطنت کے باشندوں پر عاید کی جا سکے تو یہ صورتِ حال اس حالت کی متوازی ہوگی جو آج کل ہندوستان میں پائی جاتی ہے اور میرے خیال میں شایستہ حکومت کے ساتھ اس کی غیر موزونیت ثابت کرنے کے لیے دلایل و براہین کی ضرورت نہیں ہے۔ صدر حکومت اور صدر عدالت کے

ججوں کی اس رائے سے مجھے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں عمدہ حکومت اس وقت تک نہیں قائم ہو سکتی جب تک کہ اس حکومت کی تمام رعایا کے ساتھ جس میں انگریز اور دیگر اقوام بھی شامل ہیں قانون کا یکساں طریق عمل نہ رکھا جائے۔

اس ناقابل اطمینان صورتِ معاملات میں قانون منشور بابت ۱۸۳۳ئہ کے نفاذ سے تغیر پیدا ہو گیا۔ ہندوستان میں یورپیوں کو جو غیر معمولی حقوق نہ صرف معاشی امور میں بلکہ قانون کے معاملے میں بھی حاصل تھے ان کی اطلاع انگلستان پہنچ چکی تھی۔ معاملات ہند کے بارے میں جہاں تک عدل گستری کا تعلق تھا ذیلی مجلس منعقدہ ۱۸۳۲ئہ کی روداد میں جو مذکور بالا شہادت پر مبنی تھی ضروری اصلاحات کی جانب اشارہ کیا گیا تھا۔ یہ رفتار واقعات کی مساعدت تھی کہ انگلستان جو ابھی ابھی پُر امن تبدیلی سے گزر کر مختلف جماعتوں کے مابین عدل گستری کو وسیع پیمانے پر لانے اور تمام مخصوص حقوق کو موقوف کرنے کی ذمہ داری کا اظہار کر چکا تھا ایک ایسی صورت حال کو برداشت نہ کرے جو انگلستان کی بدنامی اور ہندوستان کی بد اسلوبی کی باعث ہو۔ اصلاحی پارلیمنٹ نے جس نے انگلستان میں عوام کی زندگیوں کو متاثر کرتے ہوئے معاشری اصلاح کی متعدد تجاویز نافذ کیں اور قانونِ منشور کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی اجارے کا بھی خاتمہ کر دیا، ملک معظم کی برطانوی اور ہندوستانی رعایا کے درمیان عدل گستری کا بہترین انتظام کیا اور ان میں از روئے قانون مساوات بھی قائم کی۔ لیکن جیسا کہ اکثر برطانوی ہند کی تاریخ میں پیش آیا ہے پارلیمنٹ کے قوانین کی توضیحی دفعات اس وقت تک بے اثر رہیں جب تک کہ مجلس نظما کی طرف سے ان کی منظوری اور اشاعت نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے ہند کے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے نام مجلس نظما کی مراسلت کے حسب ذیل اقتباسات کو جو قانونِ منشور بابت ۱۸۳۳ئہ کے ساتھ منسلک تھے بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۴۱۔ ہندوستانیوں کے لیے اس قسم کی حفاظت کا انتظام کرنے کی جو اہمیت اور واقعی شدید ضرورت	عدالتوں میں یورپیوں اور ہندوستانیوں کے باہمی روابط*

*Source.—Despatch accompanying the Government of India Act, 1833.

تھی وہ ہمارے بیان کی محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ انگریز سرمایہ دار جو ملک میں مقیم ہیں مصالحانہ و منصفانہ طرز عمل کے ذریعے اپنے ہندوستانی ہم سایوں کا اعتماد حاصل کرنے کی اہمیت معلوم کر لینگے بشرطیکہ وہ اپنی ذاتی اغراض میں روشن خیالی سے کام لیں تاہم اس بات کا امکان ہے کہ اس طبقے کے بعض لوگ فاسد خیالات سے مغلوب ہو جائیں۔ چند عارضی فواید کی ہوس، قوت کا احساس، نسل کی فرضی برتری کا غرور، رائے عامہ کی کافی مزاحمت کا فقدان، نیز کئی صورتوں میں اس معمولی مزاحمت سے کنارہ کشی جو مذہبی رسوم کے متقر اور عام مظاہروں سے رونما ہوتی ہے یہ سب امور اور دیگر اسباب ایک منتقل باشندہ ملک کو بھی کبھی کبھی اس بات پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ وہ صورت حال کو ٹھیک طور پر پیش نظر رکھ کر لوگوں کے ساتھ مناسب برتاؤ کرنے کی بجائے بے احتیاطی و بے پروائی کا اظہار کرے۔ لیکن جبر و زیادتی کے افعال صادر ہونے کا اندیشہ اس قسم کے لوگوں سے زیادہ ہو سکتا ہے جن کا تعلق یورپ سے سابق بداطواری کے نتایج کی بنا پر منقطع ہو گیا ہے اور جو وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہتے ہیں چونکہ یہ لوگ ہر صورت میں اُن قیود سے آزاد ہو جاتے ہیں جو اس ملک میں سوسائٹی کے رعب آفریں اثر سے اُن تمام لوگوں پر عاید ہوتی ہیں جن کا تعلق یورپ سے کامل طور پر منقطع نہیں ہوتا اس لیے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے اشخاص کو دیگر قیود کے تحت رکھا جائے۔

۴۴۔ اگر مفصلات کا عدالتی انتظام مظلوم ہندوستانیوں کی واجبی و فوری دادرسی کے لیے کافی طور پر ذرایع مہیا کر دے تو آپ کی حکومت کو بہت کم دقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس غرض کے لیے صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ برطانوی رعایا کو پورے طور پر ہندوستانی عدالتوں کے تابع کر دیا جائے اور اس کے بعد تمام حالات درست ہو جائیں گے۔ لیکن اس طرح آپ کے عدالتی انتظام کو اندرون ملک موثر ہونے کے لیے کچھ مدت درکار ہوگی اور اس اثناء میں ایک طرف آپ کے لیے یہ ضروری ہے

باقی حاشیہ صفحۂ گزشتہ Dated 10 November, 1834. From the Board of Directors East India Company to the Government of India. (Parliamentary Papers.)

کہ تمام ممکن ذرایع کی مدد سے انتظام مذکور کی خاطر خواہ ترقی میں عجلت سے کام لیں اور دوسری طرف آپ پر یہ امر لازم ہوگا کہ آپ اُس کے اندرونی نقایص کی اصلاح کے لیے ایسے قوانین وضع کریں جو اُس خاص مقصد کے لیے موزوں ہوں جو آپ کے پیش نظر ہے نیز حکومت کی چشم بیدار اُن قبیح صورتوں کی جانب متوجہ کرائیں جن کا تدارک معمولی انتظام عدالت سے نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں ہماری ہدایات ضرورتہً عام ہونگی، ہم قواعد مقرر کرنے کی بجائے اصول پیش کرینگے اور انہیں پورے طور پر عملی صورت میں لانے کا کام آپ ہی کی قوت تمیزی پر چھوڑ دیا جائے گا۔

۴۳ - اتفاقی خرابیوں کے متعلق خواہ کیسا ہی انتظام کیا جائے پارلیمنٹ کی تجاویز جو اہل یورپ کے لیے ہند کا دروازہ کھولنے کے بارے میں کی گئی ہیں احتیاط کے ساتھ ذہن نشین رکھی جائیں۔ جن دفعات سے ہمارے ہند کے سیاسی مسلک میں اس قدر اہم تبدیلی ہوتی ہے ان کا منشا قیود عاید کرنا نہیں ہے بلکہ قوانین کے نفاذ میں مدد دینا ہے۔

جماعت مقننہ علانیہ اس اصول پر گامزن ہے کہ اہل یورپ کثرت سے ہندوستان میں داخل ہوں، اپنی ترقی پذیر اغراض میں ملک کے مفاد ضم کرلیں اور ہندوستانیوں کے ساتھ آزادانہ میل جول پیدا کرنے کے زیادہ مواقع بہم پہنچائیں تو عمومی و مجموعی حیثیت سے یہ صورت حال ہندوستانی رعایا کے لیے مفید اور اُن کی ترقی و خوشحالی میں معاون ثابت ہوگی۔ پس جماعت مقننہ کا جو منشا ہے وہی آپ کا اور ہمارا ہونا چاہیے۔ لہذا آپ کے قوانین وضوابط نیز ہندوستان میں یورپیوں کے داخلے اور بود و باش سے متعلق آپ کی تمام انتظامی کارروائیاں شاہی جماعت مقننہ کے اُس قانون کی مناسبت سے ہونی چاہئیں جو ان سب کا منبع ہے اور وہ عام طور پر مجموعی حیثیت سے ایسے اصول پر مبنی ہوں جس کا مقصد ان پر قیود عاید کرنا نہیں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہو۔

آپ جو قواعد وضوابط ہندوستانیوں کو بدسلوکی سے محفوظ رکھنے کے لیے منصفانہ و ہمدردانہ نیت سے بنائیں وہ ایسے نہ ہوں کہ ان سے کسی یورپی پر غیر ضروری قیود عاید ہونے کا خوف طاری ہو جائے یا اسے نامناسب بے اعتمادی

اور بدگمانی کے اظہار کے باعث بے اطمینانی پیدا ہو جائے۔ اس قسم کی نیت سے جو قوانین بنائے جاتے ہیں انھیں سے اکثر وہ فساد برپا ہو جاتا ہے جسے روکنا ان کا خاص منشا ہوتا ہے۔ ان سے بدنیت لوگ بُرے نتیجے اخذ کرتے ہیں، غیر مطمئن لوگوں کو ان سے شور و غوغا مچانے کا بہانہ یا مواد مل جاتا ہے اور امن پسند ان سے برافروختہ ہو کر مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔

۵۹۔ مذکور بالا امور سے بعض عملی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں جن کی جانب آپ کی توجہ منعطف کرانا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اولاً ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کے سارے ملک کی جملہ برطانیہ نژاد رعایا آیندہ انھیں عدالتوں کے تحت رکھی جائے جو ہندوستانیوں کے لیے قایم کی گئی ہیں۔ اس زیر بحث موضوع میں بے شبہ یہ امر مضمر ہے کہ اندرون ملک رعایائے مذکور مفصلات کی عدالتوں کے تحت رہیگی۔ جب تک اہل یورپ اندرون ملک داخل ہو کر محض منظور شدہ حق ملکیت کی بنا پر اپنے علاقوں میں مقیم رہے اور ان کی حیثیت کسی معنے میں بھی حکومت خارجہ کے وکلا کی رہی انھیں ان مقامی عدالتوں کی ماتحتی سے جن کے تحت باشندگان ملک کی بڑی جماعت رکھی گئی ہے مستثنیٰ کرنے کی کچھ وجہ ہو سکتی تھی لیکن ایسی صورت میں جبکہ ان کا شمار باشندگانِ ہند میں ہونے لگا ہے انھیں اپنی اس حیثیت کے مطابق عدالتی ذمہ داریوں اور ملکی حقوق میں یکساں شریک رہنا چاہیے۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں میں ان کی متحدہ شرکت کا آغاز ہونا چاہیے۔

۶۰۔ ہم اس نتیجے پر محض اصولی بنا پر نہیں پہنچے ہیں۔ قانون کی دفعہ ۸۵ سے جس کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے یہ بات واضح ہے کہ یوریوں کو اہل ملک کے ساتھ روابط پیدا کرنے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو رفع کرنے کے ساتھ ہی یہ امر ضروری ہو جائیگا کہ انھیں ان فسادات یا خطرات سے جو میل جول کے باعث رُونما ہو سکتے ہیں بچانے کی تدابیر بھی سوچ لی جائیں۔ اس دفعہ میں یہ ہدایت بھی موجود ہے کہ ہندوستانیوں کو توہین اور حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے آپ قوانین وضع کریں اور یہ ایک ایسا فرض ہے جسے آپ اس وقت تک

پورا نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ ہندوستانیوں اور یورپیوں دونوں کو ایک ہی عدالتی نظام کے زیر نگرانی نہ کر دیں۔ البتہ جہاں ایک ہی قسم کی شرائط پر مساویانہ حیثیت سے سب لوگوں کی دادرسی نہ ہوتی ہو وہاں ان کی حفاظت میں بھی یکساں عمل ممکن نہیں ہے۔

۶۱۔۔۔۔ لیکن اس طرح کے اختلافات کا اثر خاص اصول پر نہیں پڑتا۔ اصل اصول یہی رہتا ہے کہ ہر نسل، ہر ملت اور ہر رنگ والے لوگوں کے ساتھ مساوی طور پر انصاف کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس میں اختلافِ حالات کا لحاظ کم ہو۔

دفعات قانون منشور کے منشا کی تعمیل میں جسے نہایت قابلیت و صراحت کے ساتھ محول بالا مراسلے میں بیان کیا گیا ہے یورپی برطانوی رعایا کی مراعاتِ خصوصی سے متعلق بحث ۱۸۳۳ء میں ختم کر دی گئی۔ قانون یازدہم بابت ۱۸۳۶ء کی رُو سے رعایائے مذکور کو صدر عدالت میں مرافعہ پیش کرنے کے خاص حق سے محروم کر دیا گیا اور یہ قانون نافذ کیا گیا کہ کوئی شخص خواہ وہ کسی حسب و نسب یا نسل کا ہو کسی دیوانی کارروائی میں صدر دیوانی عدالت، عدالتہائے منصفین بلدہ و ضلع، عدالتِ صدر امین اور احاطۂ فورٹ ولیم بنگال کے محکوم علاقوں کے صدر امینوں کی اختیاری حدود سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

اس قانون کی جسے تمام صوبوں کی حکومتوں اور کمپنی کے ملازموں کی تعداد کثیر نے منظور کر لیا تھا کلکتہ کے یورپی باشندوں کی جانب سے شدید ترین مخالفت ہوئی۔ ہندوستان کی انگریزی آبادی کے ایک خاص حصے کی متعصبانہ تنگ خیالی اور خود غرضانہ روش کو میکالے اپنی مخصوص سلاست و مہارت کے ساتھ مندرجِ ذیل یادداشت میں اس طرح بیان کرتا ہے:

کلکتہ کی شورش*	پس میں خیال کرتا ہوں کہ قانون بنفسہ اچھا ہے اور اس کے

*Source.—Minute written by T. B. (afterwards Lord) Macaulay.

Reproduced in "The Public Life of Lord Macaulay," the Rev Frederick Arnold. (Tinsley Brothers.)

نفاذ کے لیے وقت کا انتخاب بھی خوب ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اس کے نافذ کرنے کی زبردست ترین وجہ وہ بنائے مخالفت تھی جس کا مقابلہ اسے کرنا پڑا۔ اس قانون کی تائید حکومتہائے مدراس، بمبئی و آگرہ نے کی ہے اور سیول سروس کی جماعت نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے البتہ انگریزوں کے اس تنہا گروہ نے جس سے اس کی دفعات کا خاص تعلق تھا مخالفت کی اور کلکتہ کے انگریز باشندوں کے ایک حصے نے تو اس قانون پر شدت کے ساتھ نکتہ چینی کی۔ اس درخواست میں تو انہوں نے ایسا قابل گرفت لہجہ اختیار نہیں کیا ہے جیسا کہ ان یادداشتوں میں ہے جو حکومت ہند کے نام لکھی گئی ہیں لیکن ان دونوں تحریروں کے طرز بیان میں قومی حمیت کی وہی قوت اور عدیدی تسلط کا وہی جذبہ پوشیدہ طور پر اس زبان میں دیکھا جا سکتا ہے جو ہم انگلستان میں نہایت سرگرم حامیان حقوق جمہور سے سننے کے عادی ہیں۔ جب یہ جوش و خروش جواب بالکل دب گیا ہے اپنی پوری قوت پر تھا اور کان مقابلہ نے ہر روز یہ شور بلند کیا کہ انگریز فاتح ہیں، انگریز ملک کے مالک ہیں، انگریزوں کی قوم زبردست ہے اور انگریز اس دارالعوام کے منتخب کرنے والے ہیں جو قانونی حیثیت سے انگلستان کی کمپنی اور یہاں کے گورنر جنرل باجلاس کونسل دونوں پر حاوی ہے۔ انہوں نے ہم سے بیان کیا کہ برطانوی جماعت مقننہ کے انتخاب کنندوں کو ان قوانین کا پابند نہیں کیا جا سکتا جنہیں کسی ادنیٰ قوت نے بنایا ہو۔ حکومت نے ان دو سو یا تین سو اشخاص کی بیہودہ چیخ پکار کا جو ایک ایسے معاملے سے متعلق تھی جس سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا مگر اسے رائے عامہ کی بیجا مخالفت سے تعبیر کیا گیا۔ انہوں نے ہم پر یہ الزام لگایا کہ ہم آزادی کے دشمن ہیں کیونکہ ہم قلیل التعداد انگریز امرا کی جماعت کو ہمارے کروڑہا نفوس پر جبری حکومت کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

درخواست گزار کہتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے آزادانہ تجارت اور ہندوستان میں انگریزوں کی بود و باش کی ہمیشہ مخالفت کی ہے اور اسی وجہ سے ان کا یہ خیال ہے کہ انہیں کمپنی کی عدالتوں کے تحت رکھنا ان پر ایک بہت

بڑی سختی ہے۔

لیکن کیا یہ امر درست یا معقول ہو سکتا ہے کہ حکومت ہند کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے اُن حالات کو پھر تازہ کیا جائے جو بالکل مٹ چکے ہیں؟ کمپنی تاجروں کے خانگی کاروبار میں آیندہ فریق متقابل کی حیثیت نہیں رکھتی ہے، وہ اب ایک تجارتی جماعت نہیں ہے بلکہ محض ایک حکمران جماعت ہے اور اس حیثیت سے اُسے کسی طبقے کے لوگوں کو بھی جو اُس کی مملکت کو یورپ کی صنعت و حرفت اور علم و ہنر کے ذریعے زیادہ خوش حال بنا سکیں اپنے علاقے سے خارج کرنے میں کوئی فایدہ نہیں ہے۔

اس اندیشے کے متعلق جو درخواست گزار ظاہر کرتے ہیں کہ اس قانون کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ اہل یورپ کا ہندوستان میں آباد ہونا بند ہو جائے میں یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ کمپنی کے ایک نہایت قابل قدر ملازم یعنی مسٹر ل آنجہانی کے الفاظ نقل کر دوں۔ مسٹر موصوف سے دارالعوام کی ذیلی مجلس نے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا اس کا یہ خیال نہیں ہے کہ شاہی عدالتوں کی کامل موقوفی سے اہل یورپ کا اندرون ملک (ہند) آباد ہونا مسدود ہو جائیگا؟ اُس نے جواب دیا کہ "یہ بات ہرگز ممکن نہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اب وہ جن اغراض کے تحت اندرون ملک داخل ہو رہے ہیں انھیں کی بنا پر وہاں آیندہ بھی ان کا داخلہ اُس وقت تک ہوتا رہیگا جب تک کہ وہ اپنے مقاصد میں نیک نیت اور حق بجانب رہیں۔ اگر وہ وہاں ظلم و تعدی کے ساتھ ناجایز فوائد حاصل کرنے کے لیے جا رہے ہوں تو یہ نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں مطلق نہ جائیں۔"

یہ ناممکن ہے کہ کوئی معقول شخص، کمپنی اور اُس کے ملازموں سے ایسا تعصب رکھ سکے کہ اسے فی الواقع اس بات کا یقین ہو جائے کہ کمپنی اور اس کے ملازم تجارت سے کامل طور پر دست بردار ہونے کے باوجود دوسرے تمام تاجروں کے ساتھ اب بھی حسد رکھتے ہیں۔

لیکن پُرانی تجارتی رقابت سے بالکل جدا ایک اور رقابت بھی ہے جس کا الزام درخواست گزار کسی بنیاد کے بغیر محض بغض و عناد کی وجہ سے کمپنی

داخل ہے جنہیں کمپنی کی ماتحتی میں کوئی عہدہ حاصل ہو۔ یہ رقابت اُس تاجر کی رقابت نہیں ہے جسے یہ اندیشہ ہو کہ اس کے مال کی قدر و قیمت گھٹ جائیگی بلکہ یہ اُس حکمران کی رقابت ہے جسے یہ خوف ہے کہ رعایا جس کی فلاح و بہبود کا وہ ذمہ وار ہے کہیں ظلم و غارتگری کا شکار نہ ہو جائے۔ ہندوستان نے انگریزوں کے ہتیاروں کے آگے سر جھکا دیا ہے اور انگریز عہدہ دار اس پر حکومت کرتے ہیں۔ پس انگریز نژاد ہونا ہندوستان میں ایک طرۂ امتیاز ہے۔ یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ ان صفات کی بدولت جن سے ہمیں فتح نصیب ہوئی اور جن کے ذریعے اب ہم ملک پر حکومت کر رہے ہیں یعنی جرأت، استقلال، ذکاوت، خلوص اتحاد اور دماغی و جسمانی دونوں قوتوں کی نمایاں برتری جس نے ہماری سلطنت کو فروغ دیا اور اسے اب تک برقرار رکھا ہے ہر انگریز ہندوستانی آبادی کی نظر میں ایک زبردست ہستی ہے۔ ان حالات کے تحت یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے صوبوں میں اہل برطانیہ کے آزادانہ داخلے سے ایک نسل دوسری نسل پر مسلط ہو جائے اور یہ ایک بدترین قسم کا تسلط ہے۔ یہ اندیشہ علانیہ برطانوی پارلیمنٹ کے پیش نظر تھا جب اس نے قانون منشور نافذ کیا تھا اور اگر کسی شخص کو یہ خیال ہو کہ اندیشۂ مذکور بے بنیاد تھا تو میں اسے ان تقریروں اور تحریروں کی طرف رجوع کروں گا جو اسی قانون منشور کے وضع ہونے کے وقت معرض بحث میں آئی تھیں۔ ان تحریروں اور تقریروں میں یہ امر شخص مذکور کے لیے دشوار نہ ہوگا کہ وہ ایسے الفاظ کے پردے میں جو انگلستان میں عام طور پر ہر گروہ عوام استعمال کرتے ہیں عدیدیت کی اُس قوت کو بھانپ لے جس سے وینِس کی طرح ایک امتیازی و خصوصی شان ظاہر ہوتی ہے۔

ہر ملک اور ہر زمانے میں کسی بڑے شہر سے جو دارالحکومت ہو امور عام پر ایسا اثر پڑ سکتا ہے جو اس کی حقیقی اہمیت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ خرابی اس وقت رونما ہوتی ہے جب کہ ایسے شہر کی آبادی کے مفاد، آرا اور جذبات، سلطنت کی آبادی کے مفاد وغیرہ کے ہم پلہ ہو جائیں لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں اگرچہ دارالحکومت کی سوسائٹی کا اثر حکومت پر کسی دوسرے ملک کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے تاہم ایسی سوسائٹی اور جمہور آبادی

کے منافع آرا اور جذبات میں باہم اکثر اختلاف کلی ہوتا ہے۔ کلکتہ مشرقی آبادی کے درمیان ایک انگریزی نوآبادی ہے۔ یہاں ہمارے اطراف ہماری ہی نسل اور رنگ کے لوگ ہوتے ہیں جو ہماری ہی زبان بولتے اور لکھتے ہیں اور جو مستقلاً اس ملک سے مراسلت کرتے ہیں جہاں ہم سب کو واپس جانے کی امید ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی موافق یا مخالف رائیں کثیر التعداد غیر ملکیوں کی رایوں کی بہ نسبت ہمیں زیادہ متاثر کرینگی۔ مفصلات کے تمام علاقوں کے زہر اگلنے کے مقابلے میں کلکتے کے کسی اخبار میں ہمارے خلاف کوئی آزار دہ مضمون شایع ہونے سے ہمارے جذبات زیادہ مجروح ہونگے اور تمام صوبوں کی دعاگوئی کے بالمقابل اپنے پچاس یا ساٹھ ہم وطنوں کے سپاس نامے سے ہم زیادہ خوش ہونگے۔ یہ صورت حال مجھے اندیشہ ہے بتقاضائے فطرت پیدا ہوگی۔ لیکن اس قسم کے جذبات پر قابو پانا یعنی اُن چند لوگوں کے مقابلے میں جن سے ہمارے بہت قریبی روابط ہیں اُن متعدد لوگوں کے معاملات میں دلچسپی لینا جن سے ہم ہرطرح مختلف ہیں نیز اُن لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے جن کی تعریفیں ہم کبھی نہ سُنینگے اپنے ہم نشینوں کی ملامت کی پروا نہ کرنا ہمارا فرض اولین ہے اور یہ ایک ایسا فرض ہے جس کی انجام وہی میں میرا خیال ہے ہم اپنے وطن کے حکام سے تائید اور ہمت افزائی کی امید خاص طور پر رکھ سکتے ہیں۔ اب ہم نے غلط بیانات دشنام آمیز کلمات اور غیر صحیح اتہامات کی پروا نہ کرکے ایک قانون نافذ کیا ہے جسے ہم سابق گورنر جنرل، مدراس کے گورنر باجلاس کونسل، بمبئی کے گورنر باجلاس کونسل اور کمپنی کے تقریباً جملہ سیول ملازمین عوام کی جماعت عظیم کے لیے منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ مفصلات میں رہنے والے انگریز اور مدراس و بمبئی کے شہروں کے انگریز اس قانون سے ہرطرح مطمئن ہیں۔ صرف کلکتہ کی انگریزی آبادی نے جس کی رہنمائی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہے جو دنیا کی بدترین عدالت کی بدترین کمزوریوں کو برداشت کرتی ہے ہمارے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اگر یہ احتجاج کامیاب ہوجائے تو اس ملک کا مستقبل بہت تاریک ہوجائیگا۔ لیکن مجھے معزز مجلس اور برطانوی جماعت مقننہ سے جو واقفیت حاصل ہے اس کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ جماعت مذکور بالا ناکام رہیگی اور مجھے یقین واثق ہے کہ ہمیں اس موقع پر ایسی تائید حاصل ہوگی جس سے

ہماری تمیز اُن لوگوں کی جو ہمارے بعد آئینگے ہمت افزائی ہوگی اور جب وہ ہندوستان کی بہتری کے لیے قانون وضع کرینگے تو اس قسم کے شور و غل کو نظر انداز کر سکینگے۔

سنہ ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے جو عدالتی نظام قایم کیا تھا اس کا ایک اہم جزو دیوانی مقدمات کی تحقیقات کے لیے ہندوستانی کمشنروں کا تقرر تھا۔ یہ واقعہ مورخین کے اس عام عقیدے کے خلاف ایک ثبوت ہے کہ لارڈ کارنوالس نے سرکاری ملازمت کے دروازے ہندوستانیوں پر بند کر دیے تھے۔ باایں ہمہ یہ صحیح ہے کہ ان کی خدمات خاص طور پر ثالثوں اور پنچوں کی حیثیت سے کام میں لائی جاتی تھیں اور لارڈ موصوف کا یہ عمل محض اس خاص رواج کا اتباع تھا جو قانون تنظیم کے نفاذ کے وقت رائج تھا۔ ۱۵ اگست سنہ ۱۷۷۲ء کے قانون تنظیم کی دفعہ ۱۱ کی رُو سے "ان تمام تنازعات ملکیت کا فیصلہ جو دس روپیوں سے زیادہ کے نہ ہوں، فریقین کے پرگنے کے چودھری کے اختیار میں تھا اور اس کا حکم قطعی ہوتا تھا۔ بعد ازاں سنہ ۱۷۸۱ء کے قانون تنظیم کے بموجب فی کس پچاس روپیہ ماہوار پر چند منصف یا سرکاری ثالث ہر ضلع کی دیوانی عدالت پر متعین ہوئے سنہ ۱۷۹۳ء کے قانون نشان سے ان کی تعداد اور ان کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔

ہند کی عدالتی خدمات کی تاریخِ مابعد بہت دلچسپ اور اہم ہے جو ذیل کے اقتباس میں واضح طور پر درج ہے:

عدالت کی ذیلی خدمات پر ہندوستانیوں کی ماموری*

سنہ ۱۸۳۱ء میں عدالتی نظام کے دیگر اجزائے قانون کے ساتھ ساتھ عدالت کے ہندوستانی عہدداروں سے متعلق قانون میں اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اراضیٔ معافی کے علاوہ ملکیت یا قبضۂ زمین یا دیگر جایداد غیر منقولہ کے مقدمات بھی اب منصفوں کے اختیار سماعت میں دے دیے گئے اور انھیں تین سو روپیوں تک کے مقدمات سماعت کرنے کا اختیار

*Source.—" Introduction to the Bengal Code. " C. D. Field.

عطا کیا گیا۔ چٹاگانگ کے منصفوں سے متعلق خاص قواعد منسوخ کر دیے گئے اور ان کی بجائے علی العموم جملہ منصفوں کی ہدایت کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ جائداد غیر منقولہ کی وراثت و جانشینی کے مقدمات کا فیصلہ مسلمانوں کے لیے شرع اسلام اور ہندوؤں کے لیے دھرم شاستر کے مطابق کیا جائے۔ اگر فریقین مختلف مذہب کے ہوں تو فیصلہ مدعا علیہ سے متعلق قانون کے بموجب کیا جائے لیکن صرف اُن صورتوں میں جبکہ مدعا علیہ ہندو یا مسلمان ہو۔ یہ قاعدہ جن صورتوں پر عاید نہ ہو وہاں منصف کو عدل، حق رسی اور نیک نیتی پر عمل کرنا چاہیے۔ جو مقدمات منصفوں کے اختیار سماعت میں ہوتے تھے وہ معمولاً انھیں کی عدالتوں میں دایر کیے جاتے تھے لیکن جج بھی ایسے مقدمات کی سماعت و دریافت کر سکتے تھے۔ منصفوں کو اب اس امر کی اجازت تھی کہ وہ اپنی جاری کردہ ڈگریوں کی تعمیل سے متعلق درخواستیں وصول کریں لیکن انہیں ان درخواستوں کو ججوں کے پاس بھیجنا پڑتا تھا جو منصفوں کو ان کی تعمیل کی ہدایت کرتے یا اپنے ہی ماتحتوں سے ان کی تعمیل کراتے تھے۔ منصفوں کو اب محنتانہ ادا نہیں ہوتا تھا بلکہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی مقرر کردہ تنخواہ انہیں ملنے لگی۔

۲۲۳۔ صوبوں کی اُن عدالتوں کی موقوفی سے جن کے ججوں نے ضلع اور بلدے کے ججوں کی سفارش پر صدر امینوں اور منصفوں کا تقرر کیا تھا یہ لازم آیا کہ اس قسم کے اختیارات کے استعمال کے لیے دیگر انتظامات کیے جائیں چنانچہ یہ طے پایا کہ ان کا استعمال آیندہ ایسے طریقے پر کیا جائے جیسے گورنر جنرل باجلاس کونسل پسند کرے۔ عدالت ہائے بلدہ و ضلع کے قانونی عہدہ دار اب باعتبار عہدہ صدر امین نہ ہو سکتے تھے بلکہ ان کا دیگر ارکان کی مانند تقرر طلب عہدے کے لیے منتخب ہونا ضروری تھا۔ ججوں کے لیے یہ جائز نہ رہا کہ وہ منصفوں کی عدالتوں سے متعلق مرافعوں کو صدر امینوں کے پاس سماعت کے واسطے بھیجیں۔ اس طرح صدر امین کے عہدے کی اہمیت کسی قدر گھٹ گئی، لیکن اس کی تلافی یوں کی گئی کہ ایک نیا عہدہ بنام صدر امین اعلیٰ قایم کیا گیا اور یہ عہدہ (بشمول عہدہ ہائے منصف و صدر امین) ہندوستان کے ہر مذہب و ملت کے باشندوں کے لیے

عام کر دیا گیا۔ ان عہدوں پر تقرر گورنر جنرل کی طرف سے ہوتا تھا اور وہی مامور شدہ افراد کا مشاہرہ بھی مقرر کرتا تھا۔

صدر امین اعلیٰ کو ابتدائی اختیارات ایسے مقدمات میں دیے گئے جو زر نقد یا ذاتی جائداد یا ملکیت یا قبضۂ زمین یا دیگر جائداد غیر منقولہ سے جس کی مالیت یا قیمت پانچ ہزار روپیوں سے زاید نہ ہو متعلق تھے۔ جو جج اس قسم کے مقدمات اپنی فہرست میں رکھ چھوڑتے انہیں اپنے اس فعل کی وجوہ درج کرنی پڑتیں۔ صدر امین اعلیٰ اپنی جاری کردہ ڈگریوں کی تعمیل کرانے کا مجاز تھا البتہ تعمیلی کارروائیوں کے متعلق اس کے نافذ کردہ احکام کا مرافعہ جج کے یہاں ہو سکتا تھا۔ اگر جج کے اجلاس پر مقدمات کی اس قدر کثرت ہوتی کہ اس کے لیے تمام زیر تجویز مرافعوں کا فیصلہ معقول مدت میں کرنا غیر ممکن ہوتا تو اسے صدر عدالت دیوانی میں کیفیت پیش کرنی پڑتی تھی جہاں سے اسے یہ اجازت مل سکتی تھی کہ وہ مرافعوں کی ایک خاص تعداد اپنے صدر امین اعلیٰ کے پاس بھیج دے۔

سنہ ۱۸۲۱ء کے ضابطۂ سوم کی دفعہ ۳ کی رو سے صدر امین کو جو معمولی فوجداری اختیارات حاصل تھے وہ صدر امین اعلیٰ کو بھی عطا کیے گئے اور مجسٹریٹوں کو اس امر کا مجاز کیا گیا کہ جو فوجداری مقدمات ان کے اختیار سماعت سے باہر ہوں انہیں وہ مذکور بالا دو عہدہ داروں میں سے جس کے پاس چاہیں بھیج دیں۔ لیکن یہ عہدہ دار مقدمات کو عدالت سیشن کے سپرد کرنے کا اختیار نہ رکھتے تھے۔ جج کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ بہ ضرورت شدید کسی صدر امین اعلیٰ، صدر امین یا منصف کو معطل کر دے۔ جب ان میں سے کسی کو برطرف کرنے یا نہ کرنے پر کمشنر اور جج میں اختلاف ہوتا تو ان دونوں کو اپنی رائیں صدر دیوانی عدالت پر بھیجنی پڑتیں۔ ایسی صورت میں جب کہ جج اپنی طرف سے کوئی تجویز نہ کرے کمشنر برطرفی کی تحریک کر سکتا تھا۔ گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر صدر امین اعلیٰ اور صدر امین اپنی اپنی خدمتوں سے برطرف نہیں کیے جا سکتے تھے۔ منصفوں کو صدر دیوانی عدالت برطرف کر سکتی تھی۔

۲۲۴۔ سنہ ۱۸۳۷ء کے قانون نشان ۲۵ کی رو سے ججوں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ

ابتدائی مقدمات خواہ وہ کسی مالیت یا قیمت کے ہوں صدر امین اعلیٰ کے پاس بھیج دیں اور صدر دیوانی عدالت کی منظوری سے وہ اس کے بھی مجاز تھے کہ دیوانی مقدمات کی متفرق و سرسری کارروائیاں بھی بھیج دیں۔ اس قسم کی کارروائیوں میں صوبوں کے صدر امین اعلیٰ جو احکام نافذ کرتے تھے ان کا مرافعہ پہلے جج کے پاس اور پھر بطور خاص صدر دیوانی عدالت میں ہوتا تھا۔ ابتدائی مقدمات میں پانچ ہزار روپیوں تک کی ڈگریوں کا مرافعہ پہلے جج کے یہاں ہوتا تھا اور پھر بطور خاص صدر دیوانی عدالت میں۔ اس سے زیادہ کی مالیت کے مقدمات کی ڈگریوں کا مرافعہ صدر دیوانی عدالت میں ہوتا تھا۔ ۱۸۴۵ء میں منصفوں کو نظارت کے فرائض کی انجام دہی سے سبکدوش کر دیا گیا اور انہیں اپنے علاقے میں ناظروں کے تقرر کا اختیار دیا گیا۔

۱۸۴۷ء میں وہ قاعدہ جس کی بنا پر جج منصفوں اور صدر امینوں پر جرمانہ کر سکتے تھے منسوخ کر دیا گیا کیونکہ قاعدہ مذکور اب ان عہدہ داروں کی اس اعلیٰ تر عدالتی حیثیت کے منافی تھا جو انہیں حاصل تھی۔ ججوں اور اعلیٰ صدر امینوں کی عدالتوں میں ابتدائی دیوانی مقدمات کے فیصلوں کی بابت جو قواعد نافذ تھے وہ بجنسہ ۱۸۵۴ء میں صدر امینوں اور منصفوں کی عدالتوں میں بھی نافذ کر دیے گئے اور صدر امینوں اور منصفوں کو پہلی مرتبہ ایسے مقدمات کی سماعت کرنے کا اختیار دیا گیا جن میں فریقین انھیں کی عدالتوں کے عہدہ دار یا وکیل ہوں۔ ۱۸۶۸ء میں جنوبی اور شمال مغربی صوبوں کے ہندوستانی ججوں سے متعلق قانون میں دوبارہ ترمیم کی گئی اور اسی سال کے قانون نشان ۱۶ کے ذریعے اس کی توثیق کی گئی۔ اس قانون کی رُو سے جو خاص تبدیلیاں عمل میں آئیں وہ یہ تھیں کہ صدر امین کا عہدہ منسوخ کر دیا گیا، صدر امین اعلیٰ کی بجائے 'ماتحت جج' نام تجویز کیا گیا اور منصف کی حد اختیار میں وہ تمام ابتدائی مقدمات دے دیے گئے جو دیوانی عدالتوں کے اختیار سماعت میں تھے اور جن کی مالیت یا قیمت ایک ہزار روپیوں سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ ۱۸۶۸ء کے قانون نشان ۱۶ کی ترمیم ۱۸۷۱ء کے قانون ۱۷ کی رُو سے عمل میں آئی اور یہ دونوں قانون ۱۸۷۱ء کے قانون ششم متعلق بہ عدالتہائے

دیوانی بنگال سے منسوخ ہو گئے اور اس قانون ششم کے ذریعے آخر اس قانون کی ترمیم و توثیق ہو گئی جو احاطۂ فورٹ ولیم واقع بنگال کے جنوبی و شمال مغربی صوبوں کے لفٹنٹ گورنروں کی حکومتوں کے زیر اثر علاقوں میں ضلع کی عدالتوں اور ماتحت دیوانی عدالتوں سے متعلق ہے۔

عدالت کی ذیلی خدمات[1] میں ہندوستانیوں کے اختیارات و فرایض کی توسیع خاص طور پر لارڈ ولیم بنٹنک کی عدالتی اصلاحات کی مرہون منت ہے۔ جس فیاضانہ جذبے پر اس سیاسی مسلک کی بنیاد رکھی گئی اس کا اندازہ ۱۸۳۱ء کے ضابطۂ پنجم، ۱۸۳۳ء[1] کے ضابطۂ نہم اور ۱۸۳۶ء[2] کے ضابطۂ ہشتم سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ عام طور پر ہندوستانیوں کے لیے قایم کیا گیا۔
۲۔ صدر امین کا عہدہ قایم کیا گیا۔

چوتھا باب

سرکاری خدمات

ہند کے سیاسی مسلک کو جیسا کہ اس زمانے کے بڑے حکمرانوں نے
تجویز کیا تھا موثر طور پر نافذ کرنے کے لیے ایک ایسی ملازمت دیوانی کا اجرا
ضروری تھا جس میں ایک طرف قابلیت و دیانت اور دوسری طرف
رعایائے ملک کے ساتھ خوب میل جول ظاہر ہو۔ اٹھارویں صدی کے
اُن ایام میں جبکہ کمپنی نے سیاسی ذمہ داریاں لینی شروع کیں کمپنی کا ایک
محرّر اپنے قلیل بھتّے میں اضافہ کرنے کے لیے ناجائز افعال بددیانتی پر اپنے کو
مجبور پاتا تھا۔ اگرچہ چند اپنے کو حرص و طمع سے دُور رکھنے میں کامیاب ہوئے
اور انھوں نے ایسی جرأت اخلاقی اور قابلیت حکمرانی کا جسے کوئی سنجیدہ نظام
تربیت بھی پیدا نہ کر سکتا تھا اظہار کیا تاہم اکثر لالچ میں آ گئے۔ بہر حال
لارڈ کارنوالس کی اصلاحات کے فواید ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس
کے زمانے سے کمپنی کے ملازموں کے مشاہرے معقول ہو گئے تھے اس
لیے ان کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا تھا۔ علاوہ بریں ایسٹ
انڈیا کمپنی کے قانون بابت ۱۷۹۳ء کی شرایط کے مطابق سرکاری ملازمت

میں وہ اہم عہدے جو کونسل کی رکنیت سے کم درجے کے تھے ملازمتِ متعہد کے عہدہ داروں کے لیے محفوظ کر دیے گئے تھے اور اس طرح حسنِ کارگزاری کا انعام، عہدے کی ترقی سے دیا جاتا تھا۔ اور وہ زمانہ تو دفتری نہیں بلکہ شخصی حکمرانی کا تھا جبکہ عہدہ دارِ ضلع بہت مقتدر ہوتا تھا اور شاذ و نادر ہی اس کے اختیارات میں صدر مستقر سے مداخلت ہوتی تھی۔ ملازمِ دیوانی کی ذمہ داریاں بہت اہم تھیں لیکن وہ محنت اور فرائض کی سخت پابندی کی طرف اسے راغب کرتی تھیں۔ ایک ملازمِ دیوانی کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس کے حلقۂ اثر کی رعایا خوش حال رہے۔ کیننگ کے علاوہ متعدد اشخاص نے اس زمانے کے ملازمانِ کمپنی کی دیانت اور حسنِ کارگزاری کی داد دی ہے، لیکن خود ان کی اعلیٰ شہرت کسی خارجی اظہارِ رائے کی محتاج نہیں ہے۔ اس کی تائید نہ صرف باشندگانِ ملک کی خوشحالی سے ہوتی ہے بلکہ ان خیالات سے بھی جو انہوں نے سرکاری یادداشتوں میں ظاہر کیے ہیں۔ ان اسناد میں سے صرف چند کا اعادہ اس کتاب میں ممکن ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں بڑی دقت اُن متعدد سرکاری تحریروں میں سے انتخاب کے وقت پیش آئی جو مواد اور طرزِ عبارت کے لحاظ سے قابلِ تعریف اور بلند پایہ ہیں۔

پس جو مسایل اس وقت حکام کے سامنے تھے وہ زمانۂ سابق کے مسایل سے مختلف تھے۔ یہ مسایل ذیلی امور کے تھے (گو یہ امور بلاشبہ اہم تھے)، اور ان کا تعلق خاص طور پر تین امور سے تھا یعنی ملازمانِ کمپنی کی تربیت، ملازمت کی تنظیم اور ملازمت میں داخلے کے طریقے۔ طریقِ تربیت کی تشریح مسٹر واراڈن[1] نے اپنی شہادت میں جو ۱۸۳۲ء کی مجلسِ منتخبہ کے روبرو دی تھی یہ کی ہے کہ اس شخص کو جو ہندوستان کی ملازمتِ دیوانی میں داخل کیا جاتا تھا علومِ قدیم کی بہترین تعلیم جو انگلستان میں

---

[1] مسٹر واراڈن، حکومت بمبئی کی کونسل کا رکن تھا۔

اس وقت دی جاتی تھی حاصل کرنے کے بعد ہیلی بری کالج میں چار میقات پورے کرنے پڑتے تھے۔ یہ کالج ۱۸۰۵ء میں اس غرض سے قایم کیا گیا تھا کہ ملازمانِ دیوانی کو اُن امور کی تعلیم دیجائے جو ان کے لیے ہندوستان کی ملازمت سرکاری کے دوران میں بہت مفید ثابت ہوسکیں۔ شخصِ مذکور کو مجلس نظما کے سامنے ہیلی بری کالج کے صدر کا ایک صداقت نامہ اس مضمون کا پیش کرنے کی ضرورت ہوتی تھی کہ وہ مقررہ میعاد تک کالج میں شریک رہا اور اس نے وہاں کے قواعد وضوابط کی پوری طرح پابندی کی ۔اس کی عمر پندرہ سال سے کم اور بائیس ۲۲ سال سے زیادہ نہیں ہے" نوجوان ملازم دیوانی کو ہندوستان پہنچتے ہی پہلے ہندوستانی زبانوں میں امتحان دینے کی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ اس غرض کے لیے کلکتہ اور مدراس کے کسی کالج میں اور بمبئی میں ہندوستانی استادوں سے وہ تعلیم حاصل کرتا تھا۔

انگلستان اور ہندوستان میں ملازمانِ کمپنی کی تربیت کے اس طریقے پر مختلف وجوہ کی بنا پر سخت اعتراضات ہوئے۔ کمپنی کے ہیلی بری کالج کی مخصوص نوعیت اور اس کی محدود تربیت پر مدراس کی ملازمت دیوانی کے مسٹر سلیوان نے پُرزور بحث کی ہے۔

تربیت ملازمانِ دیوانی بمقام ہیلی بری*

ایک ہی عمر کے ایسے نوجوانوں کی ایک تعداد کا جمع کرنا جو ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی کالج میں رکھے جائیں میرے نزدیک موجودہ نظام تعلیم کا ہمیشہ ایک بڑا بھاری نقص ثابت ہوا ہے۔ وہ نوجوانوں کو ایسے افراد سے عام واقفیت حاصل کرلنے کے مواقع سے محروم کردیتا ہے جو آیندہ اس ملک کے منظرِ عام پر نمایاں ہونے والے ہوتے ہیں۔ جو اشخاص اوایل عمر

---

*Source.—Evidence of Mr. John Sullivan, of the Madras Civil Service, before the Select Committee. Dated February 21, 1832.

کو انگلستان کے اشخاص و
ہیں ہندوستان چلے جاتے ہیں ان کی محبت کو انگلستان کے اشخاص و
اشیا کی طرف متوجہ رکھنا میرے خیال میں ہمیشہ ان کی تعلیم کا اہم مقصد
ہونا چاہیے۔ کسی قومی جامعہ سے تعلق رکھنا بجائے خود ایک اعزاز سمجھا جاتا
ہے اور ان اعزازات و انعامات میں جو ایسے ادارات سے حاصل ہوتے
ہیں حصہ لینا بھی ایک ایسا امتیاز ہے جس کی ہمیشہ بڑی وقعت کی جاتی ہے۔
ہیلی بری کے علمی اعزازات میری دانست میں کچھ زیادہ باوقعت نہیں
سمجھے جاتے ہیں۔ جو نوجوان افراد اسکول سے اس کالج میں جاتے ہیں وہ
وہاں کے قواعد کی بنا پر اس سوسائٹی کے سوا جو انہیں کالج کی چار دیواری
میں میسر آتی ہے دوسری ساری سوسائٹی سے محروم کر دیے جاتے ہیں حتیٰ کہ
ہندوستان کو ان کی روانگی کا وقت آجاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ
ہندوستان میں تقریباً اجنبی ہوتے ہیں اور ہندوستان پہنچ کر بھی وہ صرف
انھیں اشخاص سے میل جول رکھتے ہیں جو ہیلی بری میں ان کے ہم درس تھے۔

مختلف قومی جامعات کے تعلیم یافتہ نوجوان اب مفید تر حالات
کے تحت پہلی مرتبہ ہندوستان میں جمع ہوں گے۔ ان میں خیالات
کا زیادہ تنوع ہوگا، مسابقت کا زیادہ شوق ہوگا اور اس سے زیادہ اہم یہ کہ
اسراف اور بداطواری پر زیادہ موثر قیود عاید ہوں گی کیونکہ باقاعدہ جامعات
کی ہیئت کے لحاظ سے ان کی تادیب ہیلی بری کی بہ نسبت زیادہ مکمل ہوتی
ہے اور ہمیشہ اسی طرح ہونی بھی چاہیے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے نوجوان
انڈر گریجوئیٹوں کا اپنے اعلیٰ تر درجے کے افراد سے نیز ان مختلف جماعتوں
سے میل جول جن سے ان کی انجمنیں تشکیل پاتی ہیں کم تر درجے والوں کے
دماغوں پر لازماً مفید اثر پیدا کرتا ہے۔ ہیلی بری میں سب نوعمر ہوتے ہیں
اور ان میں سے اکثر تو جدید انڈر گریجوئیٹوں سے بھی کم عمر ہیں۔ نوعمروں کے اس
اجتماع کا نتیجہ شرارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ امر عام طور پر تقریباً
مسلم معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی کسی سرکاری تعلیم گاہ کی تادیب میں ایسا
تساہل جیسا ایسٹ انڈیا کالج میں موجود ہے نہیں برتا جاتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ذہن میں ہندوستان اور دولت کے مابین ایک فطری تعلق کا تصور ہے۔ یہ خیال فطرۃً ہیلی بری میں نشو و نما پاتا ہے۔ نتیجتہً وہاں اسراف کی عادتیں پیدا کر لی جاتی ہیں جن میں نوجوان اشخاص اپنی ساری ملازمت ہند میں مبتلا رہتے ہیں اور اس طرح خود ان کا نیز حکومت کا جس کے وہ ملازم ہوتے ہیں نقصان ہوتا ہے۔

لیکن مجلس منتخبہ نے اس امر پر زور دیا کہ کالج کے قیام کے وقت سے سابق کی بہ نسبت دیوانی ملازموں کی تعلیم بہتر ہوتی رہی ہے اور اس حقیقت سے کہ ہندوستان کے اہم ترعہدوں پر وہ افراد فائز ہوتے رہے جو ہیلی بری میں بہت ممتاز تھے اس استدلال کی اہمیت بڑھ گئی کہ کالج کی تربیت کا زمانہ ایک نمایاں قدر و قیمت رکھتا ہے ۱۸۵۵ء کے نافذ شدہ قانون کی دفعات کے مطابق کالج اجنوری ۱۸۵۸ء تک برخاست نہیں کیا گیا۔

ہندوستان میں ملازمان کمپنی کی تربیت کا جو طریقہ تھا اسے بہت سخت الفاظ میں ناقص گردانا گیا۔ مجلس منتخبہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ فورٹ ولیم کالج "دیوانی ملازمت کی واقفیت کو بڑھانے کی بہ نسبت قرض کو زیادہ بڑھاتا رہا ہے" اور وہ کسی طرح اس کے جاری رکھنے کی روادار نہ تھی۔ یہ امر کہ کالج مسرف نیز غیر موثر تھا ذیل کی رایوں سے واضح ہوتا ہے جو لارڈ ولیم بنٹنک اور سر چارلس مٹکاف نے ظاہر کی ہیں۔

ہندوستان میں ملازمانِ دیوانی کی تربیت*

میں اب کونسل سے اس کاغذ کی طرف متوجہ ہونے کی استدعا کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ تین سال کے دوران میں ہر محرّر کی تعلیم کا اوسط خرچ ۶۶۲۱ روپیے یا ۶۶۰ پونڈ سالانہ رہا ہے اور اس میں چار ہزار روپیوں یا چار سو پونڈوں کے اس مزید خرچ کو بھی شامل کرنا چاہیے (جسے اب نہایت بجا طور پر موقوف کر دیا گیا ہے) جو ہر محرّر کو ضروریاتِ

---

*Source.-(i) Minute of Lord William Bentinck. Dated December 27, 1828.

سفر وغیرہ کے لیے ملتا تھا اور جو ماہانہ پانچ سو روپیوں سے اوپر کی افزوں رقم سمجھتہ کی منہائی کے ذریعے واجب الادا تھا۔ یہ قرض بلاسود تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستانی تعلیم سے متعلق چھ سو ساٹھ پونڈ کا یہ بار اسی عنوان کے تحت انگلستان میں بھی کچھ کم مصارف کا باعث نہیں ہوتا۔ جو رقم اوپر ظاہر کیگئی ہے وہ ایک سال کے لیے ابھی کچھ معمولی نہیں ہے اگر اس کا مقابلہ دیگر مقامات کی تعلیم کے مصارف سے کیا جائے، لیکن جب محض کاہلی کی وجہ سے سرکاری مالیے پر اس کا بار ایک غیر معین مدت کے لیے ہو حالانکہ کالج کے قواعد کی رو سے دوز بانوں کے سیکھنے کی کافی مدت آٹھ ماہ مقرر ہے تو اس بدعنوانی کو عام طور پر ناقابل برداشت قرار دینا چاہیے۔ یہ بہ مشکل یقین کیا جائیگا کہ جن نوجوانوں کو خرچ دیا جاتا تھا اور جو بہت کاہل تھے انہیں سابق میں یہ اجازت ملتی رہی کہ وہ کالج میں چار، پانچ، چھ اور سات سال تک ملک پر بھاری بوجھ عاید کرنے کے باوجود لیاقت اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے مقیم رہیں۔ یہ مدت بعد کو کم کردی گئی لیکن اب بھی ایسے بہت سے افراد ہیں جو کالج میں ایک ایک دو دو سال رہے اور کسی زبان میں کامیاب نہ ہوئے۔

*کالج (واقع کلکتہ) کو برخاست کرنے کی رائے کا اظہار اس بنا پر کرتے ہوئے کہ وہ اسراف کے لحاظ سے جس کی وہ ترغیب دیتا ہے نیز قرض و

۱۔ ہیلی بری کالج کے خرچ کا حال مسٹر پیٹر آرچر کی شہادت میں جو ۱۸۳۲ء میں مجلس منتخبہ کے روبرو پیش ہوئی تھی حسب ذیل مندرج ہے:۔

"ہیلی بری کے ادارے کے قیام سے متعلق جملہ مصارف بشمول حسابات تعمیر سنہ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۳۰ء تک یعنی پچیس ۲۵ سال میں ۳۶۳۴۳۹ پونڈ ۷ شلنگ ۴ پنس ہوئے۔ حسابات تعمیر کو خارج کیا جائے تو مصارف مذکورہ ۲۶۷۰۰۱ پونڈ ۴ شلنگ ۱۰ پنس ہوتے ہیں۔ جو اشخاص محرر مقرر ہوئے ان کی تعداد ۹۴۰ رہی اور ہر مامور شخص پر بشمول حسابات تعمیر ۳۶۸ پونڈ ۱۲ شلنگ صرف ہوئے۔ حسابات تعمیر کو خارج کرنے پر ہر محرر کی تعلیم کا خرچ ۲۸۴ پونڈ ۲ شلنگ ۱ ۳/۴ پنس ہوتا ہے۔"

*Source.— (ii) Minute of Sir C. T. Metcalfe. Dated December 28, 1828.

پریشانی کے انجام کے نظر کرتے جو اس کے باعث ساری ملازمت دیوانی میں ظاہر ہوتا ہے ضرر رساں اور غیر ضروری ہے اور اس لیے وہ اس تعلیمی غرض کے لیے بے سود ہے جس کی تکمیل کے ادعا کے ساتھ وہ قایم کیا گیا مگر نتیجتہً اس سے سرکاری مصارف پر بیجا بار عاید ہو گیا مجھے یہ بیان کرنا لازم ہے کہ بطور تلافی نوجوانانِ ملازمت دیوانی کے ہندوستان پہنچنے پر ان کے استقبال و انتظام کے متعلق مفید طور پر میں کس قسم کا بندوبست تجویز کرنا چاہتا ہوں۔

ان نوجوانوں کے ہندوستان پہنچتے ہی ان کا ایک امتحان لیا جانا چاہیے اور جو یورپ میں یا اثنائے سفر ہندوستان میں اپنے حاصل کردہ علم کی بدولت سرکاری ملازمت میں داخل کیے جانے کے قابل قرار پائیں انہیں فوراً کسی خدمت پر اس کے پورے بھتے کے ساتھ مامور کر دیا جائے اور بتقاضائے وقت ڈاک گاڑی یا اور کسی سواری کے ذریعے اُن کے متعلقہ مستقر پر روانہ کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے سرکاری فرایض کا دور شروع کر دیں۔ جو نوجوان ناقابل قرار پائیں ان کو بھی کلکتہ سے باہر اندرون ملک کسی پُر امن مقام پر بھیج دیا جائے تاکہ وہ ایسے پسندیدہ کردار والے سرکاری عہدہ داروں کے احکام کے سخت پابند رہیں جو اپنے ماتحت نوجوانوں کو تعلیم اور مشورہ دینے میں مسرت حاصل کرینگے اور ان کے تفویض ایسا کام کرینگے جو انہیں بہت جلد سرکاری خدمت کے قابل بنا دے اور اس اثنا میں انہیں بالکل ناکارہ ثابت نہ ہونے دے۔ اس مدت نگہبانی کے دوران میں انہیں صرف اس قدر بھتہ دیا جائے جو ان کے گزارے کے لیے کافی اور سرکاری عہدہ داروں کے بھتے سے کم ہو اور جب قابل ممتحنوں کی یہ رائے ظاہر ہو کہ وہ سرکاری ملازمت کے اہل ہو گئے ہیں تو انہیں پورے بھتے کے ساتھ جو مامور ملازمین کو دیا جاتا ہے خدمتوں پر مامور کر دیا جائے اور مدت ملازمت جوان کے درجۂ مقام یا آمدنی کی تدریجی ترقی کا استحقاق پیدا کرتی ہو ہمیشہ ان کے زمانۂ اہلیت کی تاریخ سے شمار کی جائے۔

اس سے زیادہ عام تنقید مذکورِ بالا انتظام پر لارڈ ولیم بنٹنک نے کی تھی جس نے ملازمان کمپنی کی مخصوص صورت کا نیز موجودہ انتظام معاملات کو بہ اطمینانِ

تمام ملحوظ رکھنے کے میلان کا ذکر کیا تھا۔

ملازمت دیوانی* (سیول سروس) کی خوبی

جہاں میری یہ رائے ہے کہ ملازمت دیوانی سے بہتر اور کوئی نظام ملازمت قایم کرنا مشکل ہے اور جہاں میں یہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ بحیثیت جماعت اس کی قوت اور اس کے اعزاز و انعام کی یقینی توقع کو مستحکم رکھا جانا چاہیے وہاں میں چند نقایص کا حوالہ دیے بغیر نہیں رہ سکتا جو تمام "مخصوص انتظامات" کی طرح اس میں بھی ہیں۔ ہر انتظام میں موجودہ صورت معاملات کو بہ نظر اطمینان دیکھنے کا نیز ایک ہی طبقے کے ارکان کی غلطیوں کی جانب متوجہ رہنے کا عام رجحان پایا جائیگا اور اس محنت کا فقدان بھی پایا جائیگا جو صرف مقابلے اور مسابقت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ علاوہ بریں ملازمت دیوانی کے لیے بہت کم عمر اشخاص کے طریق انتخاب میں ایک ایسا سبب موجود ہے جو ایک یورپی تنظیم کے اُن فواید کو کم کر دیتا ہے جو بصورت دیگر بہتر طور پر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ نوجوان اشخاص اس قدر کم عمری میں باہر جاتے ہیں کہ وہ کاروبار حکمت یا علم کے کسی شعبے میں کوئی عملی تجربہ حاصل کرنے ہی نہیں پاتے اور اسی لیے نوواردوں کی حیثیت سے یورپ کی مہذب دنیا کی تازہ ترین ترقیاں اپنے ساتھ لا کر موجودہ خزانۂ معلومات میں اضافہ کرنے کی بجائے وہ خود قدامت پسند بن جاتے ہیں اور گزشتہ دور کے احساسات و آرا کے شکار ہو جاتے ہیں۔ میں یہ خیال کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ طویل رخصت کو ایک لازمی شئے قرار دینا عمدہ طریق عمل ہوگا لیکن صرف یہ طریق صورت مذکور کی اصلاح کے لیے کافی نہ ہوگا۔ ایک ایسے احساس اور شعور کو داخل کرنے کے لیے جو ملازمت دیوانی سے بالکل غیر متعلق ہو نیز اس میں ایسے یورپی تجربے کے فایدے کو شامل کرانے کے لیے جو پختہ فہم اور مسلمہ قابلیت و علمیت پر مشتمل ہو میری رائے میں یہ بہت مفید ہوگا کہ انتظام عدالت و کوتوالی کی ترقی اور بہتر نگرانی کی غرض سے صدر عدالتوں کے ججوں کے ساتھ ملک معظم کے مقرر کردہ ایک یا زیادہ جج شریک کر دیے جائیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان مختلف ججوں کا دخل اس حد تک نہ ہونے پائے کہ ملازمت مذکورہ کے استحکام

---

*Source.—Minute of Lord William Bentinck. Dated November 10, 1831 (Parliamentary papers.)

اور اس کی جایز و مناسب توقعات میں خلل پڑ جائے۔

* * * * * * *

ہمارے طریق نظم و نسق کے متعلق میری ساری تحقیقات سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا اصل نقص، ہر قسم کی سرکاری اطاعت کے فقدان، تمام مدارج کے درمیان موجودہ مساوات اور ہر سرکاری عہدہ دار کی شخصیت میں (اگر میں ایسا کہہ سکوں) پایا جاتا ہے۔ جس تجویز پر میں معزز مجلس سے نہایت زور کے ساتھ اصرار کرونگا وہ یہ ہے کہ وہ اس نظام کو مستقل طور پر جاری رکھیگی جس کی سفارش مدت گزری حکومت مدراس نے سر ٹامس منرو کی سند پر اس سے کی تھی یعنی یہ کہ کلکٹر اور مجسٹریٹ کے عہدوں کو ضم کردیا جائے، ایک ہی ضلع کے مامور عہدہ داروں کے مابین جو آزادی ایک کو دوسرے کے مقابلے میں حاصل ہے وہ اٹھادی جائے اور کلکٹر کے دفتر کو ایک بڑا دفتر بنادیا جائے جو ایسے ڈپٹی کلکٹروں، جائنٹ مجسٹریٹوں اور مددگاروں پر مشتمل ہو جو ایک ہی اعلیٰ عہدہ دار کے تحت ہوں اور ایک ہی نظام پر عمل کریں۔ تب عوام، اُن قبایح سے جو نظم و نسق میں مسلسل خلل واقع ہونے کے باعث پیدا ہوتی ہیں محفوظ رہینگے اور کامل اجنبیوں کے اُن متواتر تقررات سے جو ضلع کی تمام خدمات پر عمل میں آتے ہیں متاثر نہ ہوں گے نیز وہ اُن ناجایز فواید سے جو واقعی تعطل حکومت کے زمانے میں بد دیانت عملے کے لیے مہیا ہو جاتے ہیں احتراز کرینگے۔ اس انتظام سے حکومت کو یہ موقع بھی ہاتھ آتا ہے کہ کسی اعلیٰ عہدہ دار کی نااہلی کے باعث جو بے قاعدگی پیدا ہوتی ہے اسے رفع کرنے کی غرض سے اس کی امداد کے لیے بہتر قابلیت کے مددگاروں کو مقرر کرے اور ایک بڑے قابل عہدہ دار کے زیر تربیت کاہل اور کمزور اشخاص کو مامور کرے۔ اسی قسم کی درس گاہ میں نوجوانوں کی بہتر تربیت ہوسکتی ہے۔ اصول قانون کی کامل مہارت یا ایسی اعلیٰ درجے کی قابلیت جو انگلستان کے وکیلوں اور ججوں کو ممتاز بناتی ہے یہاں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے اور خواہ وہ کتنی ہی پسندیدہ ہو یہاں اس کے بغیر کام چل سکتا ہے لیکن ضروری چیز یہ ہے کہ نوجوان یا بوڑھے جن کے ذمے تصفیۂ مقدمات کا کام ہے خواہ وہ وکٹس یا ایک ہزار روپیوں

کی مالیت کے ہوں اور جنہیں جرمانہ، قید اور جسمانی سزا کا حکم دینے کے اختیارات حاصل ہیں سب پر لازم ہے کہ اپنی مدت کارگزاری کی تکمیل کریں، ملک کی رسوم اور کاروبار سے واقف ہوں اور اپنے قدیم الخدمت عہدہ داروں کے عمل اور وسیع تر تجربے کی بنا پر اپنی رائیں قایم کریں۔

کئی سال سے نظام کے طریق نامزدگی کو بُرا سمجھا جارہا ہے۔ ۱۸۳۲ء کی مجلس منتخبہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ "مخصوص نظام کی جانب سے نامزدگی کا عمل میں آنا ملازمان دیوانی کی قابلیت و اہلیت کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے کا بہترین طریقہ نہیں ہے" اور یہ کہ طریقِ مقابلہ "اہم توجہ کا مستحق ہے"۔ میکالے نے ۱۸۳۳ء کے قانون میں ایسے "فقرے شامل کردیے تھے جن سے ملازمانِ دیوانی کا طریق تقرر مبنی بر مقابلہ ہوگیا"، لیکن میکالے نظام کے اثر پر جنھوں نے رشک و احتیاط کے ساتھ اپنی سرپرستی کو محفوظ رکھا غالب نہ آسکا۔ بہرحال ۱۸۵۳ء میں سر چارلس ووڈ نے ایسا طریق مقابلہ نافذ کرنے کا تصفیہ کیا جس کی تائید میکالے نے فصاحت و بلاغت کے ساتھ کی۔ میکالے کی نظر میں دو مقصد تھے۔ اول یہ کہ ملازمت دیوانی کو رشتہ داروں کی بیجا خاطرداری اور بدعنوانی سے بچایا جائے اور اس کا اطمینان ملازمت کو محدود کرنے ہی سے ہوسکتا تھا۔ دوم یہ کہ ملازمت میں بہترین اشخاص جو دستیاب ہوسکیں داخل کیے جائیں اور یہ مقصد امتحان مقابلہ کے ذریعے بہترین طور پر حاصل ہوسکتا تھا۔

*ہند کی ملازمت دیوانی (سیول سروس) کے لیے طریقِ مقابلہ	[1] تجویز چیب زبانی پر مبنی ہے کہ آپ گورنر جنرل کو اس امر کی اجازت دیں کہ وہ لایق اشخاص کو جہاں کہیں بھی وہ مل سکیں

*Source.—(i) Speech and Memorandum, Lord Macaulay. Reproduced in "Life and Letters of Lord Macaulay." Sir G. O. Trevelyan. (Longmans Green and Co.)

[1] ۔ سر چارلس ووڈ کے پیش کردہ مسودۂ قانون ہند کی خواندگی دوم سے متعلق لارڈ میکالے کی تقریر۔

حاصل کرے۔ میری مستحکم رائے یہ ہے کہ اُس روز سے جب کہ ہند کی ملازمت دیوانی ایک محدود ملازمت نہ رہیگی دلالی کے دور کا آغاز ہوگا جو نہایت ہیبت ناک اور وسیع الاثر ہوگا اور اس دور میں سرپرستی کی بدعنوانیاں ایسے خطرناک طریقے پر پھیل جائیں گی جو کبھی ہم نے نہ دیکھا ہو۔ ہر گورنر جنرل اپنے ہمراہ بھتیجوں، بھانجوں، عم زاد بھائیوں، دوستوں، دوستوں کے بیٹوں اور سیاسی لوگوں کو لے کر روانہ ہوا کریگا یا ان سب کی روانگی متعاقب جلد عمل میں آئیگی اور ہر اُس جہاز میں جو بحیرۂ احمر سے ہندوستان پہنچیگا کوئی نہ کوئی ایسا منچلا ضرور ہوگا جس کے ساتھ انگلستان کے ذی اثر اشخاص کی سفارشیں ہونگی۔ یہ گورنر جنرل کے اختیار میں ہوگا کہ وہ رزیڈنٹ کے عہدے، کونسل بورڈ کی رکنیتیں، مجلس مالگزاری کی خدمتیں جن کی تنخواہ چار ہزار پونڈ سے چھ ہزار پونڈ سالانہ تک ہوگی ایسے اشخاص میں تقسیم کردے جو ہندوستانیوں کی خصوصیات و عادات سے مطلق واقف نہ ہوں اور ان کی زبان صرف اسقدر جانتے ہوں کہ جس سے وہ زرد شراب کی ایک مزید بوتل منگا سکیں یا اپنے ملازم سے پنکھا زیادہ تیزی کے ساتھ جھلنے کی خواہش کرسکیں۔ آپ مذکور بالا طریق عمل پر کس طرح قیود عاید کرسکیں گے؟ کیا آپ ارکان دارالعوام ان پر قابو پاسکینگے؟ کیا آپ خود اپنے گھر میں رشتہ داروں کی بیجا خاطر داریوں کو مٹا لینے اور وہائٹ ہال اور سومرسیٹ ہاؤس کی بدعنوانیوں کو دفع کر لینے میں اس قدر کامیاب ہوچکے ہیں کہ آپ یہ خیال کریں کہ آپ ایسے ممالک میں خوش اسلوبی قایم کرسکینگے جن کا صحیح محل وقوع آپ نہیں جانتے اور جن کے نام کا صحیح تلفظ بھی آپ ادا نہیں کرسکتے؟ مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان کے متعلق مذکور بالا انتظام سے خوش اسلوبی پیدا ہونے کی بجائے خود ہندوستان پر بدنمائی کا دھبہ لگیگا اور پھر کچھ مدت کے بعد ہی جب دارالعوام کے کسی متعدد رکن کا کوئی بیٹا یا بھائی اپنے ساتھ وزیر اعظم کا ایک سفارشی رقعہ گورنر جنرل کے نام لے کر کلکتہ کی راہ لیگا تو اس رقعے کی حیثیت درحقیقت ایک ہنڈی کی سی ہوگی جو محاصل ہند کے متعلق

اُس رقم کے لیے جاری کی گئی ہو جسے دار العوام کی پارلیمنٹی[1] تائید سے حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں ہم ناتجربہ کار نہیں ہیں۔ ہمیں صرف اُس شرمناک اور افسوس ناک زمانے پر نظر ڈالنی ہوگی جو بنگال میں پہلی مرتبہ ہماری قوت قایم ہونے کے بعد پیش آیا۔ اگر آپ اس زمانے کے کسی شاعر، مذمت گو یا مضمون نگار کی تحریروں کو ملاحظہ فرمائینگے تو معلوم ہوگا کہ مذکورِ بالا طریق تقرر کا اثر کس طرح مترتب ہوا تھا۔ کلکتہ میں یہ روایت مشہور تھی کہ لارڈ کلائیو کی حکومت کے دوسرے دور میں ایک شخص کسی وزیر کا پُرزور سفارشی رقعہ لے کر پہنچا۔ لارڈ کلائیو نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا "کہو بھئی! تم کتنی رقم چاہتے ہو؟" اس شخص نے جسے ایسے سادہ انداز میں مخاطب کیے جانے کا اتفاق پیش نہ آیا تھا جواب دیا کہ وہ کسی ایسے عہدے کا امیدوار ہے جس میں اس کی خدمات بکار آمد ہو سکیں۔ لارڈ کلائیو نے کہا "بھلے مانس یہ تو کوئی جواب نہیں۔ تم کتنی رقم چاہتے ہو؟ کیا ایک لاکھ پونڈ[1] کافی ہو نگے؟" شخص مذکور نے جواب دیا کہ وہ بہت خوش ہوگا اگر وہ محنت طلب خدمت کے ذریعے اس قدر رقم حاصل کر سکے۔ لارڈ کلائیو نے فوراً مذکورہ رقم کے لیے ایک حکم تحریر کیا اور درخواست گذار کو اسی جہاز سے جس میں وہ آیا تھا ہندوستان چھوڑنے کی تاکید کی اور یہ بھی کہا کہ جب واپس پہنچ جائے تو ہمیشہ انگلستان میں رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قصہ بہت قرین قیاس ہے نیز میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کو لارڈ کلائیو کے اس طریق عمل کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ اس لیے اگرچہ بنگال کی رعایا کو اس خوش قسمت منچلے کو مالدار بنانے کے لیے لوٹا لیکن اس شخص کو اگر کوئی خدمت دے دی جاتی تو رعایا نہ صرف لوٹی جاتی بلکہ اسے بد انتظامی بھی برداشت کرنی پڑتی۔ اس قسم کی خرابیوں کا ایک علاج اور مجھے یقین واثق ہے صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ ملازمت دیوانی کو مختص محدود کر دیا جائے۔

* * * * *

---

[1] یہ غالباً "روپیے" تھے۔

اگر میں آن آرا کو سمجھ سکا ہوں جو معزز لارڈ (لارڈ ایلن برو) سے منسوب کی جاتی ہیں تو لارڈ موصوف کا یہ خیال ہے کہ کسی نوجوان کا ایسے امور میں قابل ہونا جو درسی و اخلاقی تعلیم میں شامل ہیں نہ صرف اس بات کی علامت ہے کہ وہ آیندہ زندگی میں ناموری نہ حاصل کر سکیگا بلکہ اس سے لازماً یہ قیاس پیدا ہوتا ہے کہ اس پر وہ اشخاص غالب[1] آجا ئینگے جنہیں ابتدائی مراحل میں اس نے نیچا دکھایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ معزز لارڈ کی یہ رائے ہے کہ جو نوجوان امور مذکور میں امتیاز حاصل کرتے ہیں وہ ممکن ہے آگے چل کر ایسے سست اور کاہل ثابت ہوں کہ کسی جد وجہد کی زندگی کے قطعاً ناقابل ہو جائیں۔ مجھے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ معزز لارڈ نے یہ نہیں کہا کہ درسی و اخلاقی تعلیم کی بجائے ٹکا ٹکی اور کرکٹ کو معیار قابلیت قرار دینا بہتر ہوگا۔ میرے خیال میں کسی واقعے کا ثبوت اس قدر کثیر شہادت یا مستقل تجربے سے نہ مل سکیگا جس قدر اس واقعے کا کہ جو اشخاص اپنی نوعمری میں اپنے ہم عصروں کے درمیان ممتاز ثابت ہوتے ہیں وہ تقریباً ہمیشہ آخر دم تک اس امتیاز کو قایم رکھتے ہیں جو انھوں نے حاصل کیا ہے۔ کسی کتاب خانے سے کیمبرج کا سال نامہ اٹھائیے۔ اس میں آپ کو اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے والوں کی صد سالہ فہرست مل جائیگی۔ رینگلروں[2] اور جونیر آپٹیموں[3] کی فہرست پر نظر ڈالیے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرونگا کہ جونیر آپٹیموں میں سے ہر اس شخص کے مقابلے میں جس نے آیندہ زندگی میں امتیاز حاصل کیا ہو آپ بیس[4] ممتاز رینگلر پائینگے۔ کیا ہماری تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی نہیں ہے جو اس واقعے کو ثابت کرتی ہیں؟ مذہبی خدمت یا قانونی پیشے کو لیجئے۔ پارلیمنٹ کو اس وقت سے دیکھیے جب سے اس ملک میں پارلیمنٹی حکومت کی ابتدا ہوئی یعنی ماٹیگو اور سینٹ جان

---

[1] ۔میکالے یہاں سر چارلس ووڈ کی اس تجویز پر بحث کر رہا ہے کہ ہند کی ملازمت دیوانی کا داخلہ امتحان مقابلہ کے ذریعے منضبط کیا جانا چاہیے۔

[2] ۔رینگلر وہ شخص ہے جس نے کیمبرج یونیورسٹی کے امتحان ریاضی میں اعزاز کے ساتھ بدرجۂ اول کامیابی حاصل کی ہو۔

[3] آپٹیمی وہ شخص ہے جس نے کیمبرج یونیورسٹی کے امتحان ریاضی میں بدرجۂ دوم یا سوم کامیابی حاصل کی ہو۔

کے زمانے سے کیننگ اور رپیل کے زمانے تک۔ ہندوستان میں ملاحظہ فرمائیے۔ ایک قابل ترین شخص جس نے کسی زمانے میں ہندوستان پر حکومت کی وارن ہیسٹنگز تھا اور کیا وہ ویسٹ منسٹر کے اعلیٰ افراد سے نہ تھا؟ ایک قابل ترین ملازم دیوانی جسے ہم نے ہندوستان میں دیکھا سر چارلس مٹکاف تھا اور کیا وہ ایٹن کی درسگاہ میں ممتاز درجہ نہ رکھتا تھا؟ اشرافیہ کا سب سے زیادہ مشہور رکن جس نے ہندوستان پر حکومت کی لارڈ ویلزلی تھا۔ ایٹن میں اس کی شہرت کا کیا پایہ تھا؟ آکسفورڈ میں اسے کیسی شہرت حاصل تھی؟ مجھے ایک اور معزز و ممتاز گورنر جنرل کا نام بھی لینا چاہیے جس کا ذکر کیے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ چند روز قبل جب کہ وہ تقریر جس کا میں نے حوالہ دیا ہے میرے ذہن میں تازہ تھی میں نے میوزے کیمبریجنزے میں سترہ سال کے ایک نوجوان شاعر کی ایک نہایت فصیح و پاکیزہ نظم جس کی بنا پر کیمبرج یونیورسٹی نے اسے طلائی تمغہ عطا کیا تھا پڑھی تھی اور میں نے درد آمیز مسرت کے ساتھ اس نظم کے اختتام پر سینٹ جان کالج کے آنریبل ایڈورڈ لا کا نام بھی پڑھا تھا۔ اسی وقت مجھے یہ خوشگوار خیال آیا تھا کہ لارڈ ایلن برو کا نام بھی ان اشخاص کی طویل فہرست میں داخل کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنی نوعمری میں علمی کامیابیوں کے ذریعے ان اہم فرائض کے متعلق نیک شگون پیش کیا تھا جو انہیں آیندہ سرکاری زندگی میں انجام دینے تھے۔ یہ کہنا کوئی جواب نہ ہوگا کہ آپ دو تین ایسے مقتدر اشخاص بتا سکتے ہیں (جب کہ یہ بات پسندیدہ ہو کہ آپ انہیں بتا سکیں) جنہوں نے اپنی نوعمری کاہلی کے باعث تاسف اور انتہائی ندامت کی حالت میں بسر کی لیکن بعد کو اپنی محنت و مشقت سے تلافیٔ مافات کر دی۔ اس قسم کی مستثنیٰ صورتیں ضرور قابل توجہ ہیں کیونکہ ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اشخاص کی ہمت افزائی ہو جو اپنی نوعمری کو عیاشی یا بدعنوانی میں برباد کر لینے کے بعد مایوس ہو کر اپنی آیندہ عمر بھی اسی طرح گزارنے پر مائل ہوتے ہیں۔ لیکن بے شبہ عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ اشخاص جو اپنی درسگاہوں کے مقابلوں میں اول رہے تھے دنیا کے مقابلوں میں بھی اول رہے ہیں۔

(میکالے نے اس کے بعد یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس کے مخالفین کو خود اپنے استدلال پر اطمینان نہ تھا۔)

معزز لارڈ کی رائے یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم وفنون کی تحصیل کی ترغیب دینا گویا ہندوستان میں ہماری حکومت کی بربادی کی تیاری کرنا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ جس تعلیم کی وہ مذمت کرتا ہے جب وہ یورپیوں کو دی جاتی ہے اسی تعلیم سے جب وہ ہندوستانیوں کو دی جائے وہ اس قدر خوف زدہ کیوں ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ تعلیم ایک یورپی کو کرم کتاب، بیہودہ گو اور ایک ایسا شخص بنا دیتی ہے جو زندگی کے اہم فرایض کی انجام دہی کے ناقابل ہو جاتا ہے، لیکن یہی تعلیم اگر ایک ہندو کو دی جائے تو وہ اسے ایک ایسی ذہنی قوت سے مسلح کر دیتی ہے کہ ایک مستحکم حکومت اپنی دو لاکھ پچاس ہزار نفوس کی فوج کے ساتھ اور انگلستان کی تمام بری و بحری قوت کی اعانت کے باوجود اس ذہنی قوت کا قطعاً مقابلہ نہیں کر سکتی۔

زقانون کے منظور ہونے کے بعد میکالے ایک مجلس[1] کا صدر بنایا گیا جو طریق مقابلہ کے نفاذ سے متعلق ضروری انتظامات کرنے کی غرض سے قایم کی گئی تھی)۔

*ہماری خواہش کے خلاف اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ وسیع مگر سطحی علم کے لیے انعامات مقرر کیے جائیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ کسی امیدوار کی حوصلہ افزائی ایک ایسا مضمون لینے کے متعلق قطعاً نہ ہونی چاہیے جس میں وہ سرسری معلومات رکھتا ہو۔ کسی ایک زبان کی عمیق و صحیح واقفیت، چھ زبانوں کے برے تراجم یا مضامین کی بہ نسبت زیادہ قابل قدر ہونی چاہیے۔ صرف ایک پرچۂ جواب جس سے معلوم ہو کہ لکھنے والا تفرقی احصار کے اصول سے کما حقہٗ واقف ہے اُن

---

[1] ۔ اس مجلس کے دیگر ارکان لارڈ ایشبرٹن، مسٹر ہنری ملول صدر کلیۂ ہیلی بری، مسٹر جووینٹس اور سر جان شا لیفیور تھے۔

*Source.—(ii) Report of the Civil Service Committee. Repreduced in "Life and Letters of Lord Macaulay." Sir G. O. Trevelyan. (Longmans, Green & Co.)

بنیش سطحی و غیر صحیح جوابات کے بالمقابل زیادہ قابل قدر ہونا چاہیے جو کیمیا، نباتات، معدنیات، مابعد الطبیعیات، منطق اور تاریخ انگلستان کے سوالات سے متعلق ہوں۔

* * * * *

ہمارے خیال میں مضامین امتحان پر نشانات کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے کہ مملکت کا کوئی حصہ یا درسگاہوں کا کوئی خاص گروہ بلا شرکت غیرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ملازمین مہیا نہ کرے۔ مثلاً انگلستان کے بڑے علمی اداروں کے حق میں سخت ناانصافی ہوگی اگر نتیجۂ مقابلہ کے تصفیے میں یونانی یا لاطینی میں نظم لکھنے کی مہارت کا کافی لحاظ نہ کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی اور لاطینی میں نظم لکھنے کی مہارت کسی شخص کو حاکم عدالت، حاکم مالیہ یا ماہر سیاست بنانے میں بلاواسطہ کوئی دخل نہیں رکھتی، لیکن جو نوجوان ایک کام کو جسے اس کے ساتھی نہایت قابل اور بلند ہمت نوجوان بخوبی انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں بہتر طور پر انجام دیتا ہے وہ عموماً ایک اعلیٰ درجے کا آدمی ثابت ہوگا اور نہیں اس بارے میں شبہ ہو سکتا ہے کہ حصول کمال جس سے ابتدائے فاکس، کیننگ، گرینویل، ولزلی، ہینسفیلڈ اور ہنٹرڈن نے اپنے کو اپنے ساتھیوں میں ممتاز کیا تھا دل و دماغ کی ایسی قوتوں کا اظہار کرتا ہے جن کی مناسب تربیت و رہنمائی موجودہ مملکت کے بہت کام آسکتی ہیں۔ برخلاف اس کے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس جزیرے کے شمالی حصے میں قدیم السنہ میں نظم لکھنے کے فن کی بہت کم تربیت ہوتی ہے اور غالباً ڈیوگالڈ اسٹیورٹ، ہارنر، جیفری اور میکنٹوش ملک کے سے مشہور اشخاص لاطینی کی جس میں شاعر الکیس کی بحر کا رنگ پایا جاتا ہو عمدہ نقل کرنے یا شکسپیر کی دس سطور کا ترجمہ یونانی بحر میں کرنے سے قاصر تھے۔ ہم امتحان کا ایک ایسا طریقہ دیکھنا چاہتے ہیں جو کمپنی کی ملازمت سے کسی میکنٹوش یا ہنٹرڈن یا کسی کیننگ یا ہارنر کو محروم نہ کرے۔

ہم یہ توقع اور یقین بھی کرتے ہیں کہ کسی کار آموز کو سخت بداطواری یا ایسی بداعمالی کے باعث جو ایک معزز شخص کے لیے نازیبا ہو ملازمت سے خارج کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوگی۔ کار آموز اشخاص ایسے نوجوان ہوں گے جو اپنے ساتھیوں سے علوم و فنون میں بہتر ہوں گے اور ایسے نوجوانوں میں جو اپنے ساتھیوں سے علوم و

فنون میں بہتر ہوں عموماً قابل ملامت بد اخلاقی نہیں پائی جاتی۔ شاید بیس سال میں ایک مرتبہ بھی آکسفورڈ یا کیمبرج سے کوئی ایسا طالب علم جس نے اعلیٰ درجے کا علمی امتیاز حاصل کیا ہو بد نامی کے ساتھ خارج نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی زمانے میں علوم و فنون میں فوقیت کا حصول علی العموم چند ایسی صفات کا وجود ظاہر کرتا ہے جو برائی سے محفوظ رکھنے کی ضامن ہوتی ہیں مثلاً محنت، ایثار، ایسی مسرتوں کا شوق جو نفسانی نہ ہوں، اعزاز و امتیاز کی قابل تحسین خواہش اور اس سے بھی زیادہ قابل تحسین یہ خواہش کہ احباب و اقربا سے تعریف و توصیف حاصل کی جائے۔ لہٰذا ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ دماغی قابلیت کا جو معیار قایم کیا جانے والا ہے وہ عملی طور پر خاطر خواہ بہترین اخلاقی معیار بھی ثابت ہوگا۔

یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ لارڈ کارنوالس اور اس کے بعد کے حکمرانوں نے ملازمت دیوانی میں جو اصلاحیں کیں ان سے انتظام حکومت میں بہت بڑی بے لوثی اور عمدگی پیدا ہو گئی، اور دوسری طرف اس قسم کے طرز عمل کو اختیار کرنے سے کچھ مدت کے لیے ہندوستانیوں کو اعتماد و ذمہ داری کے عہدوں سے ہٹا دینا ضروری ہو گیا تھا۔ کرنیل کینی لکھتا ہے کہ "وارن ہیسٹنگز نے تجار کو محصلانِ مالگزاری بنایا تھا اور لارڈ کارنوالس نے انہیں حکام عدالت بنا دیا۔ ہندوستان کے دیسی اشخاص اس طرح اُن تمام عہدوں سے رفتہ رفتہ علٰحدہ کر دیے گئے جن پر وہ مغل دور میں مامور ہوئے تھے، اور جیسی جیسی انگریز شرفا کے اطوار میں بہ حیثیت حکام انتظامی اصلاح ہوتی گئی ہندوستان کے دیسیوں کی بے قدری زیادہ بڑھتی گئی۔"

ہند کے سیاسی مسلک کے بنیادی اصول پر غور کرتے ہوئے اس زمانے کے انگریز حکمرانوں نے صریح طور پر اس امر کی ضرورت محسوس کی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے باشندگانِ ملک کو بھی حکومت کے انتظامی کام میں شریک کرنا چاہیے۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن نے سب سے پہلے اس فرض کو جو حکمرانوں پر واجب تھا تسلیم کیا کہ "وہ تعلیم اور سرکاری اعتماد کے ذریعے ہندوستانیوں کو ان کے موجودہ حکمرانوں کے معیار پر لانا چاہیے"۔ جیسا کہ مسٹر فاریسٹ نے بتایا ہے وہ ہندوستانیوں کی ترقی و تعلیم کے منصوبوں کو اُس وقت تک اہم نہیں سمجھتا جب تک ایک ہی طریقے پر ایسی

تجاویز اختیار نہ کی جائیں جن سے ان کو اعزاز اور عہدے سے فایدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔ ان کی ماموری کے متعلق الفنسٹن نے لکھا تھا کہ "یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو رفتہ رفتہ اعلیٰ عہدوں اور بڑی تنخواہوں پر اور پھر زیادہ قابل اعتماد خدمات پر مامور کیا جائے۔ مجھے کسی ہندوستانی کے رکن بورڈ ہو جانے میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتی بلکہ میری تو یہ خواہش ہے کہ آزمایش کے طور پر ایک ہندوستانی جج کے تحت ایک ضلع دیا جائے اور دوسرا ایک ہندوستانی کلکٹر کے تحت"۔ اگرچہ اس نے یہ رائے قایم کی تھی تاہم اسے کوئی عجلت نہ تھی۔ اس نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ بہت سخت نگرانی کی ضرورت تھی تاکہ انتظام حکومت میں ایسی بد اعمالیاں نہ پیدا ہو جائیں جن کا بعد کو رفع کرنا محال ہو جائے۔ اس معاملے میں لارڈ ولیم بنٹنگ نے بھی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو مال اور عدالت کے محکموں کی اعلیٰ تر خدمات پر مامور کر کے عملی حصہ لیا۔ سر تھامس منرو اور سر جان میلکم بھی اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے جن کا اظہار انھوں نے حسب ذیل خطوط میں کیا ہے:-

سرکاری خدمات پر ہندوستانیوں کی ماموری*

آپ کے خیال کا یہ اندازہ صحیح ہے کہ مجلس نگراں کے عہدۂ صدارت سے آپ کا مستعفی ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جس میں مجھے "کچھ نہ کچھ دلچسپی" لینی چاہیے کیونکہ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آسکتا تھا جس میں اس سے زیادہ میں دلچسپی لے سکتا۔ میں اس واقعے پر سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی وجوہ سے عمیق رنج و ملال کا اظہار کرتا ہوں۔ اگر میں آپ کا وہ خط نہ دیکھتا جو آپ نے اپنے رائے دہندوں کو لکھا تھا تب بھی میں بلا تامل یہ نتیجہ اخذ کرتا کہ آپ کے مقاصد معقول تھے، لیکن پھر بھی میں قوم کے نقصان کا کچھ کم تاسف نہ کرتا۔

مجھے یقین ہے کہ ہم پھر آپ کو جلد کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتے ہوئے

*Source.—(i) Letters from Sir Thomas Munro to the Right Hon. G. Canning. Dated June 30, 1821.

دیکھینگے، لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میری خواہش تو آپ کو کسی دوسرے عہدے کی بہ نسبت سابق عہدے ہی پر دیکھنے کی ہوگی کیونکہ اس سے خود میرے عہدے کی وقعت دوگنی ہوجاتی ہے جب وہ ایک ایسے شخص کے تحت ہوتا ہے جس کے نام سے اس کے تمام ماتحتوں کو بھی کچھ شہرت نصیب ہوجاتی ہے۔

میں انڈیا بورڈ کی صدارت کے تغیرات سے ہمیشہ گھبراتا رہتا ہوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس پر کسی روز کوئی ٹھیٹ انگریز پہنچ جائیگا جو ہندوؤں کو اینگلو سیکسن بنانے پر مصر ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ انگلستان میں ایسے اشخاص موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پسندیدہ تغیر پہلے ہی ایک حد تک ہوچکا ہے اور اس کی تکمیل بہت مدت قبل ہی ہوجاتی اگر کمپنی کے ملازمین اس کی مخالفت نہ کرتے۔

میں ہندوؤں یا دیگر لوگوں کی شتاب آمیز ترقی کے جدید اصول پر کوئی اعتقاد نہیں رکھتا ہوں۔ ہندوؤں کا کردار غالباً اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ واسکوڈاگاما کے پہلے پہل ہندوستان پہنچنے کے وقت تھا اور ایک صدی بعد تک بھی اس کے زیادہ بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہماری حکومت کی قوت اس میں شک نہیں اس مدت میں اُن لڑائیوں کا سدباب کرکے جو سابق زمانے میں بہت عام تھیں ملک کی دولت اور آبادی میں اضافہ کردیگی۔ ہم بھی مدارس کے قیام کے ذریعے ہندوؤں میں خود ان کے ادب کی معلومات سے نیز انگلستان کی زبان اور ادب سے واقفیت پیدا کردیں گے لیکن یہ سب کچھ ان کے کردار کو درست نہیں کرسکتا، ہم ان کو بہت زیادہ مطیع و منقاد، محنت کش اور شاید فنون میں بھی ماہر بنالیں گے، اور ہم ڈکیتیوں کو بھی بہت کم کردینگے لیکن ہم ان کے اخلاقی معیار کو بلند نہ کرسکینگے۔ ہمارے تمام قوانین اور درسی کتب کا جو اثر ان کے کردار کو درست کرنے میں ہوسکتا ہے اس کے بالمقابل ہمارا موجودہ نظام حکومت جو ہندوستانیوں کو اقتدار، اعتماد اور منفعت کے عہدوں سے محروم رکھتا ہے ان کے کردار کو ذلیل بنانے میں بہت زیادہ موثر ہے۔ ہم خود اپنے منصوبوں کے خلاف عمل کررہے ہیں اور ہم کسی اصلاح کی توقع نہیں رکھ سکتے جبکہ ہم ترقی کے لیے ایک کمزور آلہ استعمال کریں اور تخریب کے لیے ایک قوی آلہ کسی قوم کے کردار کی اصلاح اور اس کے ساتھ ہی اس قوم

کو اجنبی حکمرانوں کے تحت ایسی ذلیل ترین حالت میں رکھنا جس میں وہ مفتوح ہونے کے بعد مبتلا ہو سکتی ہے یہ دونوں چیزیں بالکل متضاد ہیں۔

ترقی کے لیے بڑے جوش و خروش کی کوئی توقع ہی نہیں ہو سکتی جبکہ اعلیٰ ترین تحصیل معلومات کسی معمولی عہدے سے زیادہ کچھ نہیں دلاتی اور نہ وہ دولت یا عزت کا باعث ہو سکتی ہے۔ جب ہندوستانیوں کی توقعات اس طرح محدود ہوں تو ہر وہ تدبیر جو ان کی اصلاح کردار کے لیے کی جائیگی لازماً ناکام ہوگی، اور اس قسم کی کوئی تدابیر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک ایسے مقاصد کی طرف ہندوستانیوں کی رہنمائی نہ کیجائے جن کے حصول کے لیے دوسرے ممالک میں انسانوں میں محنت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ترقی کا یہ کام خواہ وہ کسی طریقے سے شروع کیا جائے بہت دھیما ہونا چاہیے لیکن وہ ہمیشہ اسی قدر اعتماد کے تناسب سے ہوگا جس قدر ہم ہندوستانیوں پر کرینگے اور سرکاری کاروبار کے انتظام میں وہ اس حصے کے مطابق ہوگا جو ہم ان کو دینگے۔ جو کچھ ہم اپنی برتری کو خطرے میں ڈالے بغیر ان کو دے سکتے ہیں وہ دے دینا چاہیے۔ ہماری حقیقی فوجی قوت خود ہمارے ہی ہاتھ میں ہونی چاہیے لیکن رکن مجلس اعلیٰ سے فروتر سیول عہدوں پر بلحاظ موقع ہندوستانیوں کا انتخاب کرنا چاہیے یہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہونی چاہیے کیونکہ وہ ابھی کسی اعلیٰ سیول عہدے کے فرائض کو ہمارے قواعد و خیالات کے مطابق ٹھیک طور پر انجام دینے کے قابل نہیں ہیں، لیکن جتنا جتنا ہمیں یہ معلوم ہوتا جائے کہ وہ اعلیٰ تر عہدوں پر بخوبی مامور ہونے کے قابل ہو گئے ہیں اتنا اتنا ان کی ماموری کا دایرہ وسیع ہوتا جائے۔

ہم ملک کے ذرایع آمدنی کا یا ان اسباب کا زیادہ صحیح علم جن سے وہ گھٹتے یا بڑھتے ہیں کبھی حاصل نہ کر سکینگے۔ اس وقت تک ان ذرایع کی ہم ہمیشہ نہایت غیر متوازن تشخیص کرینگے اور اکثر بہت زیادہ جب تک ہم یہ نہ سیکھ لینگے کہ ہندوستانیوں کے اعلیٰ تر طبقے کے ساتھ شرفا کی مانند برتاؤ کیا جائے اور ان سے ہماری امداد میں اسی طرح کام لیا جائے جس طرح انگلستان میں دارالعوام سے رقم محاصل کی تشخیص و تقسیم میں لیا جاتا ہے۔

*میرے پاس کسی شخص کو دینے کے لیے دس روپیے بھی نہیں ہیں اور جو کچھ بھی مجھے مل سکتا ہے وہ میرے بنیادی اصول کے مطابق مقامی مستحقین کو دیا جانا چاہیے۔ میری کامیابی کا بڑا رازیہ ہے کہ میں اسی مواد سے کام کرتا ہوں جو مجھے کسی مقام پر مل جاتا ہے اور اسی میں سے جو کچھ انتخاب کروں اس کے سوا کسی اور چیز کی طرف میں اپنے کو رجوع نہیں کرتا۔

مجھے اس بات پر اتنا ہی تاسف ہے جتنا آپ کو یا کسی شخص کو ہو سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے کوئی گنجایش نہیں۔ دباؤ کا طریقہ بہت زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے جب کہ ہماری قوت بڑھتی جاتی ہے، لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ملازموں یا منشیوں وغیرہ کو خواہ وہ کتنے ہی اچھے ہوں ذی رتبہ یا با اثر بنا دیں۔ ہم کو چاہیے کہ کوئی ایسی تدبیر کریں جس سے ہندوستانی ہمارے ساتھ حکومت کے کام میں اور اس سے جو فوائد و منافع حاصل ہوتے ہیں ان میں شریک ہو سکیں ورنہ ہم قایم نہ رہ سکینگے مجھے یہ توقع تھی کہ اس مقصد کی تکمیل میں ایسے ذرایع اختیار کرکے جو کم از کم ہمارے نظم و نسق کی تدریجی مگر حقیقی اصلاح کی بنیاد ڈالیں بڑی بڑی پیش قدمیاں کی جائیں گی۔ میں اس احتیاط یا فراست کے خلاف کچھ کہنا نہیں چاہتا جس کے نظر کرتے اس امر کے متعلق ایک مختلف رائے قایم کی گئی اور ایک ایسے موقع کو گزرنے دیا گیا جو شاید جلد نہ ملسکے کیوں کہ اس وضع کی حکومت میں جیسی کہ ہماری ہے صرف مقامی عہدہ داری مواقع اور اتفاقی واقعات سے فائدہ اٹھائیں تو کوئی بہتری ہو سکتی ہے۔ کوئی عام تجویز خواہ وہ کتنی ہی دانشمندانہ اور مستحکم ہو تعصب، جہالت اور رقابت کی اس کثرت میں کبھی کارگر نہ ہو گی جو بقول اہل ایران بحر قوت یعنی انگلستان میں پائی جاتی ہے۔

*یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ متعدد معزز و قابل اشخاص نے ہندوستانیوں کو

---

*Source.—(ii) "Letters of Sir John Malcolm," by J. W. Young.

Reproduced in "Life and correspondence of Sir John Malcolm,"

J. W. Kaye. Vol. II., p. 392. (Smith, Elder & Co.)

*Source.–(iii) Minute of Sir Thomas Munro, dated December 31, 1824.

خارج کر دینے اور ان کی بجائے جہاں تک ہو سکے یورپیوں کو مامور کرنے کی اہم سفارش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر وہ قدم جو اس راستے میں اٹھایا جائیگا نہ صرف ہندوستانیوں کے کردار کو بد سے بدتر بنائیگا بلکہ ہماری حکومت بھی اس کے باعث کمزور ہی کمزور ہوتی جائیگی۔ اس ملک میں ہماری سلطنت کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام اعلیٰ ترعہدے خواہ وہ سیول ہوں یا فوجی یورپیوں سے مامور کیے جائیں لیکن وہ تمام عہدے جن پر ہندوستانی ہمارے اقتدار کو خطرے میں ڈالے بغیر مامور کیے جا سکتے ہیں بلحاظ منفعت انھیں کے لیے چھوڑ دیے جائیں۔ ہم اس خیال سے مغرور ہیں کہ ہم اپنی محدود تعداد سے ایک قوم کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ہم دس گنا زیادہ ہوتے تو اسی قدر کام اور بگڑتا۔ ہم پہلے ہی سے ہر اہم عہدے پر قابض ہیں۔ اگر ہم تنزل کے ساتھ اُن عہدوں پر مامور ہوں جو کم تر درجے کے ہیں اور اب ہندوستانیوں سے پُر کیے جا رہے ہیں تو ہم اپنے کردار کو بدتر کر لینگے اور فرائض کو اچھی طرح انجام نہ دے سکینگے۔ ہندوستانیوں میں کم از کم وہ تمام صفات یورپیوں کے برابر موجود ہیں جو اُن ادنیٰ خدمات کی انجام وہی کے لیے درکار ہیں جن پر وہ مامور ہیں۔ وہ مجموعی حیثیت سے بہتر محاسب ہیں، زیادہ صابر اور محنت کش ہیں، ملک کے حالات اور باشندوں کے اطوار و رسوم سے بہت زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں اور سرتاپا بہت اچھے معاملہ فہم انسان ہیں۔

* * * *

ہم کس افتخار کی بنا پر اپنی پدرانہ حکومت کا ذکر کر سکتے ہیں اگر ہم ہر اہم عہدے سے ہندوستانیوں کو محروم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں جیسا کہ حال حال تک ہم کہتے رہے ہیں کہ ایک ملک میں جس میں پندرہ کرور باشندے ہیں یورپی کے سوا کسی شخص کو اس قدر اختیار بھی نہیں دیا جائیگا کہ وہ بید کی ایک ضرب کی سزا دینے کا حکم صادر کر سکے۔ اس قسم کی دست اندازی سے ایک پوری قوم کی تذلیل و توہین ہوتی ہے جس کی تلافی کے لیے کوئی صورت مفید نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم کے متعلق کسی وقت بھی کوئی فیصلہ کیا گیا ہو۔ انسان کی کمزوری اور غلطی جو اس کی سرشت میں داخل ہے ہندوستانیوں کی نظر

میں کبھی اُس بے عزتی کی کوئی معقول وجہ نہیں قرار پا سکتی جو ان کے ساتھ بہ ظاہر کر کے کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے چھوٹے چھوٹے جرایم کے فیصلے کرنے میں بھی قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ہم ان کی اصلاح کرنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن تجاویز ایسی پیش کرتے ہیں جو کامیابی کی بالکل مخالف ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح کے ان مدعیوں نے وہ بڑی بنیادیں دیکھی ہی نہیں جن پر اصلاح کا انحصار ہے۔ وہ ہندوستانیوں پر اعتماد کرنا، ان کو کوئی اختیار دینا نہیں چاہتے اور حتی الامکان ان کو عہدوں سے علٰحدہ رکھنا چاہتے ہیں، لیکن علم کی عام اشاعت کر کے ان کو روشن خیال بنانے کے جوش و خروش میں وہ سرگرم ہیں۔

اس سے زیادہ ناشایستہ اور لغو مصلحت کبھی بدترین زمانوں میں بھی ظاہر نہیں ہوئی، کیونکہ ہر زمانے اور ہر ملک میں علم کے شوق کی زبردست تحریک شہرت، دولت یا قوت کے سوا اور کیا ہے؟ یا اُن اعلیٰ قابلیتوں کے حاصل کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے اگر ان کو ان کے بہترین مقصد یعنی خدمت عوام کی طرف اس طرح نہ لگایا جائے کہ اس قسم کی قابلیتیں رکھنے والے اپنے اپنے درجہ قابلیت کے مطابق ملک کے عام انتظام کے مختلف فرایض پر مامور ہوں؟ ہم یہ کس طرح توقع رکھ سکتے ہیں کہ ہندو علم حکمت کے شوق میں انہماک ظاہر کریں گے جب تک انہیں ایسی ترغیب نہ ہو جیسی دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے؟ اگر اعلیٰ درجے کی تحصیل معلومات پر بھی امتیاز و اعزاز کی راہ نہیں کھلتی تو یہ خیال کرنا بے سود ہے کہ ہندو اس کی تلاش میں اپنا وقت ضایع کریگا اور اگر اس نے ایسا کیا بھی تو اس کی مہارت، عہدے سے محرومی کے اصول کے تحت اس کے سوا کچھ اور کام نہ آئیگی کہ اسے خود اپنی اور اپنے اہل ملک کی افتادہ حالت کا اور صریح علم ہو جائیگا۔ وہ ایسا علم حاصل نہ کریگا جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ انجام کار اس سے کوئی فائدہ اسے نہ ہوگا، وہ صرف وہی چیزیں سیکھیگا جن کی ضرورت ہوگی اور جن کے مفید ہونے کا امکان ہوگا یعنی تحریر و حساب۔ ممکن ہے کہ کچھ مستثنیات ہوں مگر وہ چند ہی ہوں گے۔ چند ہندو جو بڑی بڑی نوآبادیوں میں رہتے ہیں اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ یورپیوں کے ساتھ گزارتے ہیں علم ادب کے حقیقی شوق سے یا نمایش کے لیے یا کسی اور وجہ سے اپنی کتابیں

پڑھتے ہوں گے، اور اگر انھوں نے کچھ ترقی کرلی تو اس میں خوب مبالغہ کیا جائیگا اور اس پر مرحبا و آفریں کی ایسی صدائیں لگائی جائیں گی گویا تمام ہندوستان میں پھیلنے والی روشنی اور حکمت کے عظیم الشان یوم کا آغاز ہوا ہے۔ لیکن اس قسم کے چند اشخاص ہندوستانیوں میں ہمیشہ ہوئے ہیں اور ہمیشہ ہونگے تاہم ان سے عوام کی جماعت میں کوئی تغیر نہوگا۔ محض ہماری کتابیں بہت کم بلکہ کچھ بھی اثر نہیں کرینگی، خشک اور معمولی علم ادب کبھی کسی قوم کے کردار کو درست نہیں کریگا۔ خاطر خواہ نتیجہ پیدا کرنے کے لیے دولت عزت اور سرکاری خدمت کی راہ کھلی رہنی چاہیے۔ اس قسم کے نعم البدل کی توقع کے بغیر علم حکمت کی کوئی تحصیل عوام کے کردار کو کبھی بلند نہیں کریگی۔

* * * * *

فیاضانہ برتاؤ بہت سی اقوام کے کردار کو بلند کرنے کا موثر ترین طریقہ ثابت ہوا ہے اور ہم یقین کرسکتے ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کے کردار پر بھی اس کا اثر ایسا ہی ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہوگی لیکن اسی سبب سے کام کے شروع کرنے میں ذرا بھی دیر نہ کرنی چاہیے۔ ہمیں مشکلات سے پست ہمت نہ ہونا چاہیے اور اس وجہ سے کہ خود ہمارے زمانے میں کوئی ترقی نہیں ہوسکتی اس کام کو بے فایدہ سمجھ کر نہ چھوڑنا چاہیے، اور ہندوستانیوں کی ضد اور تعصب پر اس ناکامی کو محمول نہ کرنا چاہیے جو صرف ہماری غیر مستقل مزاجی سے یوں واقع ہوئی ہے کہ ہم نے اس واحد طریق عمل کو ترک کردیا جس کی بنا پر معقولیت کے ساتھ کامیابی کی کوئی توقع ہوسکتی تھی۔ ہمیں ہندوؤں کے ساتھ وہی رعایتیں کرنی چاہئیں جو اور اقوام کے ساتھ کی جاتی ہیں اور ہمیں غور کرنا چاہیے کہ یورپ کی اقوام میں ترقی کی رفتار کس قدر سست رہی ہے اور ان کو موجودہ حالت پر پہنچنے سے قبل زمانہ ہائے وحشت و جہالت کی کس قدر طویل منازل طے کرنی پڑی ہیں۔ جب ہم دوسرے ممالک کا انگلستان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم علی العموم انگلستان کی موجودہ حالت کا ذکر کرتے ہیں اور ہم عہد اصلاح سے پہلے کے زمانہ کا خیال تک بھی نہیں کرتے، اور ہم میں ہر اس اجنبی ملک کو

غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب سمجھنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے جس کا طرز حکومت کسی بھی طرح ہمارے طرز حکومت کے لگ بھگ نہ ہو باوجودیکہ وہ ہمارے اُس طرز حکومت سے بہتر ہو جو کچھ ہی مدت قبل تھا۔

ہمیں ہندوستان کو عارضی نہیں بلکہ ایک ایسا مقبوضہ سمجھنا چاہیے جس کو مستقلاً اس وقت تک قایم رکھنا ہے جب تک کہ آیندہ کسی زمانے میں ہندوستانی اس قابل ہو جائیں کہ اپنے اکثر توہمات و تعصبات کو ترک کر دیں اور کافی طور پر ایسے روشن خیال ہو جائیں کہ اپنے لیے ایک باقاعدہ حکومت قایم کر کے اسے چلا سکیں اور محفوظ رکھ سکیں۔ جب کبھی ایسا وقت آئیگا اس وقت غالباً دونوں ملکوں کے لیے بہترین صورت یہی ہوگی کہ ہندوستان سے برطانوی حکومت رفتہ رفتہ اٹھالی جائے۔ اس امر کے متعلق کہ یہ مفید تغیر جس کا یہاں تصور باندھا گیا ہے آیندہ کسی نہ کسی زمانے میں ہندوستان کے اندر واقع ہوگا نا امیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس قسم کا تغیر ایک زمانے میں خود برطانیہ کے اندر کم از کم اتنا ہی بعید از قیاس تھا جتنا وہ اب یہاں ہے۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ حکومتوں کے طرز سے قوموں کے کردار ہمیشہ کس حد تک متاثر ہوتے رہے ہیں، اور یہ کہ بعض جو کسی زمانے میں بہت ہی شایستہ تھے وحشیانہ حالت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور بعض دوسرے جو سابق زمانے میں بہت ہی غیر مہذب تھے تہذیب کے انتہائی زینے پر پہنچ گئے ہیں تو ہمیں اس میں شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اگر ہم استقلال کے ساتھ مناسب تدابیر اختیار کریں تو ہم بروقت اپنی ہندوستانی رعایا کے کردار کو اس حد تک درست کر لیں گے کہ وہ حکومت اور اپنی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائے۔

مذکورۂ بالا آرا کے اظہار سے وہ اشخاص جو اپنی عظیم و صحیح قوت فیصلہ کی بنا پر مشہور رہے ہیں انگلستان کے حکام کو جلد متاثر کرنے لگے۔ ۱۸۳۳ء کے قانون میں اصلاح کا ایک بڑا قدم اٹھایا گیا جب کہ پہلی مرتبہ کمپنی کی ملازمت میں داخلے کے متعلق رعایا کے تمام فرقوں کی مساوات، اُس کے مقام پیدایش، مذہب یا رنگ کا لحاظ کیے بغیر واضح طور پر تسلیم کی گئی۔ اس وسیلے سے تمام قانونی رکاوٹیں دور

ہوگئیں لیکن یہ لازم نہ ہوا کہ ہندوستانی فوراً اعلیٰ عہدوں پر لے لیے جائیں۔ اس کے بعد سے اہلیت "ملازمت میں داخلے کا معیار" قرار پاگئی۔ لہٰذا قانون مذکور کے منظور ہونے کے ایک سال بعد مجلس نظما نے اپنے ایک مندرجِ ذیل قابل یادگار مراسلے میں حکومت ہند پر اس ضروری امر کے لیے زور دیا ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں جن سے وہ اپنے کو سرکاری خدمات کے اعلیٰ مدارج کے قابل بنانے کے مواقع پاسکیں۔

رفع موانع*　مذکورِ بالا قانون کی دفعہ ۸۷ کی رُو سے یہ امر طے ہوگیا ہے کہ کوئی شخص اپنی پیدایش، مذہب یا رنگ کی وجہ سے ہماری ملازمت میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کے ناقابل نہ قرار پائیگا۔

یہ مناسب ہے کہ اس اہم دفعۂ قانون کو سمجھ لیا جائے تاکہ اس کا پورا منشا اور مقصد ہمارے تمام نظام حکومت میں پہنچایا جاسکے۔

آپ دیکھینگے کہ اس کا منشا کسی قابلیت کا تعین نہیں ہے بلکہ رفع امر مانع ہے۔ دفعۂ مذکور سے ہمارے نظام حکومت کو جو خاصکر ہمارے باقاعدہ سیول اور فوجی ملازمین کے ذریعے چلایا جاتا ہے کوئی حرج یا نقصان نہیں پہنچتا ہے ورنہ ایسا کرنا گویا اُن قواعد کو منسوخ یا کمزور کرنا ہوگا جو جماعت مقننہ نے ان کارپردازوں کی قابلیت کے اطمینان کے لیے نافذ کر رکھے ہیں جن کے ہاتھوں میں ہندوستانی نظم ونسق کے مخصوص فرایض سونپے جائینگے، اور وہ ایسے قواعد ہیں جن میں حال کے قانون سے ایک اہم اضافہ ان شرایط میں ہوتا ہے جو ہیلی بری کالج سے متعلق ہیں۔ لیکن ان قواعد کے معنی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ برطانوی ہند میں کوئی حکمران جماعت نہ ہوگی، قابلیت کے متعلق خواہ کسی قسم کا معیار قایم کیا جائے اس میں مذہب اور فرقے کا امتیاز شامل نہ ہوسکیگا، اور ملک معظم کی رعایا سے کوئی شخص خواہ وہ ہندوستانی یا برطانوی ہو یا مخلوط نسل کا اُن خدمات سے جو عام طور پر ہمارے

---

* Source.—Despatch from the Court of Directors to the Government of India, 1834.

ہندوستانی ملازمان غیر متعہد کو دیجاتی ہیں یا خود خدمات متعہد سے محروم نہ ہوگا بشرطیکہ وہ اور طور پر اُن قواعد کے مطابق نیز اُن شرائط کے موافق جو مذکورہ دو صورتوں سے متعلق ہیں ملازمت کے قابل ہو۔

اس اصول کے نفاذ میں جس کا تعلق خاصکر آپ سے ہے ہندوستانیوں کو سرکاری خدمات پر مامور کرنا ہوگا خواہ وہ سفید فام ہوں یا مخلوط النسل کے۔ ہمارے خیال میں جہاں تک سابق الذکر جماعت یعنی سفید فام ہندوستانیوں کا تعلق ہے یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ جماعت مقننہ کی اغراض میں بڑی حد تک پیش بینی سے کام لیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا اور جیسا کہ فی الحقیقت بعض اہم موقعوں پر آپ کے عمل بھی کیا ہے کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معتبر خدمات پر ایسی آزادی اور وسعت کے ساتھ لیا جائے جو اس لحاظ سے جائز قرار پائے کہ اس قسم کی خدمات سے متعلق فرائض کی انجام دہی ٹھیک طور پر ہوگی۔ اب تو اہم اور وسیع عدالتی فرائض بھی انہیں سونپے جا رہے ہیں گو اس میں شک نہیں کہ کچھ تو کفایت کے خیال سے اور کچھ فیاضانہ و ہمہ گیر حکمت عملی کے اصول پر بھی ایسا ہو رہا ہے، تاہم ایک خط فاصل جو ایک حد تک ہندوستانیوں کو حاصل اور دوسری طرف انہیں خارج کرتا ہے قایم رکھا گیا ہے۔ بعض خدمات ان کے لیے مخصوص کیجاتی ہیں اور بعض سے انہیں محروم رکھا جاتا ہے اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ مؤخرالذکر کا تعلق ملازمت متعہد سے ہے اور سابق الذکر اس سے غیر متعلق ہیں، بلکہ علانیہ اس وجہ سے کہ ہندوستانیوں کی قابلیت کے اوسط معیار کے متعلق یہی خیال ہوسکتا ہے کہ وہ صرف ایک معین حد تک بلند ہوسکتا ہے۔ یہی وہ خط فاصل ہے جس کو موجودہ قانون مٹاتا ہے یا یہ کہ اس کی بجائے وہ ایک دوسرا قایم کرتا ہے جس میں فرقوں کا امتیاز مطلق نہ ہوگا۔ قابلیت آئندہ سے ملازمت میں داخل ہونے کا معیار ہوگی۔

اس تبدیل شدہ قاعدے کی پابندی آپ کو اپنے قول و فعل دونوں میں کرنی ضروری ہے۔ عملاً شاید نتایج میں کوئی زیادہ نمایاں فرق واقع نہ ہوگا۔ ملازمت متعہد سے متعلق خدمات اور سرکاری نوعیت کی دیگر خدمات کے مابین جو امتیاز اب

ہے وہی عام طور پر آیندہ رہیگا۔
ہم اس اہم اصول کے نتایج پر جس کو اب جماعت مقننہ نے پہلی مرتبہ تسلیم کر کے قایم کر دیا ہے زیادہ خصوصیت کے ساتھ غور و خوض کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ہم قیاسی نوعیت کی بحث سے احتراز کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک عملی سبق ہے جیسے ہم نے سابق مواقع پر آپ کے ذہن نشین کرایا ہے اور جس پر ایک مرتبہ اور زور دینے کے لیے موجودہ موضوع ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ جہاں ایک طرف یہ بات قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ ہندوستانیوں اور مخلوط فرقوں کے مامور ہونے کے قابل سرکاری خدمات کا دایرہ رفتہ رفتہ وسیع ہوتا جائیگا وہاں دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یورپی اشخاص جب ملک (ہند) میں داخل ہو کر مقیم ہو جائینگے تو ان کا یہ طبقہ غالباً انھیں خدمات کے لیے امیدوار مہیا کر دیگا جو ہندوستانیوں کو دیجا سکتی ہیں۔ یورپی فہم و تعلیم کے اشخاص میدان میں نمودار ہونگے اور اسی واقعے کی پیش بینی سے ہم خاص طور پر محول بالا سبق کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ ہر نقطۂ نظر سے یہ بات اہم ہے کہ ہندوستان کے دیسی لوگ یا ان میں سے وہ جو اپنی عادت، کردار یا حیثیت کے لحاظ سے حصول خدمات کی جانب مایل ہیں حتی الوسع اس قابل ہو جائیں کہ اپنے یورپی حریفوں کا مقابلہ کر سکیں۔ پس ایک مضبوط دلیل ہر اس تجویز کی تائید کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے جو ہندوستانیوں کی ترقی کی باعث ہو خواہ وہ انہیں فواید تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے ذریعے یا ان میں علم و حکمت اور اخلاقی تربیت کے ذخایر کو پھیلانے سے عمل میں آئے۔ ان خاطر خواہ نتایج کے برآمد ہونے کی خواہش ہمیں خوب معلوم ہے آپ بھی ہماری طرح رکھتے ہیں اور ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کی ترقی کے متعلق آپ کو زیادہ محنت کی جانب اکسانے کے لیے اُن خیالات کے جو ہم نے یہاں ظاہر کیے ہیں محض حوالے سے بڑھ کر آپ کو اور کسی تحریک کی ضرورت نہ ہوگی۔
لیکن جب ہم اس قسم کی خواہشیں اور رائیں رکھتے ہیں تو ہمیں اس مفروضے کے خلاف پیش بندی کرنی چاہیے کہ سرکاری امتیاز کے ذرایع و مواقع کے جاری رہنے ہی کی بدولت ہم اپنی حکومت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اُن گروہوں

باشندوں کو فائدہ پہنچائیگی جو اس کے زیر اقتدار ہیں۔ ہم نے بارہا ایک بالکل مختلف خیال آپ پر ظاہر کر دیا ہے۔ سرکاری عہدوں پر ترقی کی آسانیوں سے کسی حکومت کے باشندوں کی بڑی تعداد پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا اور شاید ایک شایستہ حکومت کے باشندے تو ان سے مطلق متاثر نہیں ہوتے۔ حکومت، عہدہ داری کے شوق کو بڑھانے کے لیے تحریص و ترغیب کے سلسلے کی برقراری سے نہیں بلکہ جرم کے انسداد سے، جائداد کی کفالت و حفاظت سے، اعتماد کی تخلیق سے، محنت کش لوگوں کو ان کی محنت کا پھل ملنے کے تیقن سے، عوام کو ان کے حقوق سے بے روک ٹوک متمتع ہونے کے انتظام اور ان کی قوتوں کے آزادانہ استعمال سے بہترین طور پر دولت اور عام مرفہ الحالی پیدا کر سکتی ہے۔ غرض یہ کہ عہدوں تک پہنچنے کی آزادی خاصکر اسی وقت قابل قدر ہوتی ہے جب وہ عام آزادی کا ایک جزو ہو۔

محولِ بالا مراسلے کے موخر حصے میں نظما نے ایسی آسانیاں پیدا کرنے کی ضرورت پر اصرار کیا ہے جن سے ہندوستانی اپنے کو سرکاری خدمات پر مامور ہونے کے قابل بنا سکیں اور اپنے یورپی حریفوں کا مساوی شرایط کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ جیسا کہ بعد کو بتایا جائیگا ملک کے اندر نظام تعلیم کی اصلاح کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ کی حکومت اُن بہتر ذرائع تعلیم سے وسیع حد ممکنہ تک فایدہ اٹھانے کی خواہشمند تھی جو اس وقت ہندوستانیوں کے لیے مہیا کیے گئے تھے۔ لہذا ایک تجویز ان طریقوں سے متعلق نافذ کی گئی جن کا استعمال ایسے ہندوستانیوں کو خدمات پر مامور کرتے وقت لازم تھا جنھوں نے اُن مدارس میں تعلیم پائی تھی جہاں انگریزی زبان بولی جاتی تھی۔

*سرکاری خدمات میں انگریزی زبان کا استعمال	گورنر جنرل نے بنگال کی تعلیم کی موجودہ حالت کو ملحوظ رکھ کر اور یہ رائے زنی کرتے ہوئے کہ اس کی

*Source.—Lord Hardinge's Resolution.

"Education in British India."

A. Howell. (Calcutta General Press.)

ترغیب ہر معقول طریقے سے اس طرح دینا مناسب ہے کہ جن اشخاص نے اُن مواقع تعلیم سے جو اُنہیں دیے گئے تھے فایدہ اٹھایا ہے ان کے لیے سرکاری خدمات پر ماموری کی خوش آیند توقعات پیدا کی جائیں اور ان کے ذریعے نہ صرف انفرادی لیاقت کو نوازا جائے بلکہ سلطنت کو بھی اس قابل بنایا جائے کہ وہ اُن تجاویز کے نتائج سے جو عوام کی تعلیم کے لیے گزشتہ سنین میں اختیار کی گئی تھیں جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھا سکے نیز حکومت، خانگی افراد اور جماعتیں بھی مستفید ہو سکیں، یہ فیصلہ کیا ہے کہ سرکاری ملازمت کے لیے امیدواروں کے انتخاب کے وقت ہر ممکنہ صورت میں اُن اشخاص کو ترجیح دی جائیگی جنھوں نے ایسے مدارس میں تعلیم پائی ہے جو عمل مذکور کے تحت قایم ہوئے ہیں اور خصوصاً ان کو جنھوں نے اس قسم کے مدارس میں قابلیت و معلومات کے معمولی درجے سے گزر کر اپنے کو ممتاز ثابت کیا ہے۔

۲۔ پس گورنر جنرل کا یہ مسرت آمیز حکم ہے کہ مجلس تعلیمات، مختلف مقامی مجالس اور دیگر حکام کے لیے جن کے سپرد حکومت بنگال کے محکوم صوبوں میں تعلیمات عامہ کی نگرانی کا کام کیا گیا ہے یہ ایک ہدایت متصور ہو کہ حکومت مذکور کو بہت جلد اور آیندہ سے ہر سال یکم جنوری کو اُن طلبہ کی کیفیت سے مطلع کیا جائے جو اپنی قابلیت و لیاقت کے مختلف مدارج کے لحاظ سے ایسی مختلف سرکاری خدمات کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں جن پر ان کی ماموری اُن کی عمر، استعداد اور دیگر حالات کے نظر کرتے مناسب سمجھی جا سکتی ہے۔

۳۔ گورنر جنرل کا مزید ارشاد یہ ہے کہ مجلس تعلیمات سے یہ خواہش کی جائے کہ وہ ان تمام درسگاہوں کے افسروں یا منتظموں سے بھی جن کی امداد سرکاری سرمائے سے نہیں کی جاتی ممتاز طلبہ کی کیفیت حاصل کرے اور اسے مناسب اور کافی تحقیق کے بعد سرکاری مدارس کی کیفیت کے ساتھ شامل کر دے نیز یہ کہ اس قسم کے اداروں کے منتظموں سے عام طور پر یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ مذکورہ نوع کی کیفیت، مقررہ میعاد کے اختتام پر مجلس تعلیمات کے پاس روانہ کیا کریں۔

۴۔ جب یہ کیفیت وصول ہو جائے تو اسے طبع کر کے تمام سرکاری دفتر و

کے بالا دستوں کے پاس خواہ وہ کلکتہ میں ہوں یا باہر اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا جائے کہ جن امیدواروں کی طرف ان کو اس طرح توجہ دلائی جاتی ہے انہیں مامور کرنے اور ترقی دینے کے کسی موقع کو وہ نظر انداز نہ کریں اور اپنے زیر اقتدار ہر خدمت کے پر کرنے میں خواہ وہ کسی درجے کی ہو دوسروں کے مقابلے میں جو اعلیٰ تر قابلیت نہ رکھتے ہوں ہمیشہ انہیں ترجیح دی جائے۔ اس قسم کے تمام امیدواروں کے سرکاری خدمات پر تقررات کی اطلاع، تقرر کنندہ عہدہ دار فوراً مجلس تعلیمات کو دیگا اور وہ اپنی سالانہ رُوداد میں حکومت اور عوام کو ان تقررات سے مطلع کیا کریگی۔ عہدہ داران نگراں کا جنھیں اپنے ماتحت عہدہ داروں کے کیے ہوئے تقررات کی توثیق کا اختیار حاصل ہے فرض ہوگا کہ وہ یہ دیکھیں کہ ہر اُس صورت کے متعلق جہاں ایسے تعلیم یافتہ امیدوار کا انتخاب نہ ہوسکتا ہو جس کا نام مطبوعہ فہرست میں درج ہے کافی وجوہ کا اظہار کیا گیا ہے۔

۵۔ عوام کے ادنیٰ تر طبقوں میں اشاعت تعلیم کی مزید ترقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے گورنر جنرل کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ادنیٰ ترین خدمات سرکاری کے پر کرنے کے لیے انتخاب اشخاص میں بھی امیدواروں کی لیاقت کے مختلف مدارج کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر صورت میں ایک ناخواندہ پر اس شخص کو ترجیح دی جائے جو پڑھ لکھ سکتا ہو۔

پانچواں باب

خلافِ انسانیت رسوم کا انسداد

گزشتہ صفحات میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرہٹوں کی لڑائیوں کے اختتام کے سنین مابعد میں برطانوی حکومت ہند کی نوعیت اور مقاصد کیا تھے۔ اس زمانے کے جلیل القدر حکمرانوں نے چند اصول مقرر کر لیے تھے جو ان کے سیاسی مسلک میں رہنمائی کرتے تھے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جن لوگوں پر وہ حکومت کر رہے ہیں وہ اپنے قدیم طرز حکومت سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کی رسوم کا خواہ وہ موجودہ تجربے کی روشنی میں ناقص ہی معلوم ہوں احترام ہونا چاہیے۔ لہٰذا ملکی نظم و نسق کی تعمیر میں انہوں نے ایسے نئے طریقوں کو جو عوام کے طریقوں سے مختلف تھے نافذ کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی بلکہ نہایت صبر کے ساتھ قدیم اور مسلّم طریقوں کی اصلاح کی اور جہاں تک ہو سکا ملک کے سرکاری کام میں ہندوستانی کارکنوں سے مدد لی۔ مالگزاری کے معاملے میں یکساں طریق عمل قایم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ وہ طریقے جو مختص ملک میں رائج تھے اختیار کیے گئے اور ان میں جدید ضروریات کے مطابق آہستہ آہستہ اصلاح کی گئی۔ انتظام معدلت کے

متعلق حکمرانوں نے دھرم شاستر یا شرع اسلام میں تبدیلی کی جانب توجہ نہیں کی اور حتی الامکان ملک کے قوانین و رسوم کا احترام کیا۔ انہوں نے اپنے نظام تعلیم میں جو مغربی علم و تجربے پر مبنی تھا ملکی زبان کے ادب کی تشکیل کو اپنا مرکز نگاہ قرار دیا۔ مزید براں انہوں نے مذہبی معاملات میں کامل رواداری سے کام لیا اور اگرچہ وہ خود راسخ الاعتقاد و خدا ترس عیسائی تھے انہوں نے ہندوؤں کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کا اصل مقصد اُن اشخاص کو فایدہ پہنچانا تھا جن پر وہ حکومت کر رہے تھے۔ وہ نہایت صبر و اعتماد سے کام لیتے تھے۔ "انہیں یہ یقین تھا کہ تہذیب کی تدریجی ترقی اور حقیقی علم کی افزایش سے باشندگان ہند اپنے خاص مصلحوں یعنی رام موہن رائے وغیرہ کی رہنمائی میں اپنی آزادانہ خواہش کی بنا پر خود کو ان مزاحمتوں اور جکڑ بندیوں سے آزاد کر لینگے جن سے ان کے خیالات و افعال مقید ہیں اور ذہنی نوع انسان کے اعلیٰ طبقوں میں اپنی جگہ پائینگے۔"

لیکن بعض امور ایسے تھے جن میں وہ اپنی عدم مداخلت کے فیاضانہ طرز عمل کو ایک معین قاعدہ قرار نہ دے سکتے تھے۔ نازک موقعوں پر جیسا کہ افغانستان کے معاملے میں پہلے بتایا جا چکا ہے ان حکمرانوں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں قوت و استقلال سے کام لینا چاہیے۔ وہ مستحکم طور پر اس بات کے قایل تھے کہ خود ہندوستانیوں کے مفاد کے لیے برطانوی سلطنت کی حفاظت قایم رہنی چاہیے اور اسی لیے عجلت کے ساتھ کسی قسم کے تجربے نہ کیے جانے چاہییں لیکن جب اقتضائے انسانیت نے عمل کی صدا دی تو انہوں نے ہمت اور فیصلہ کن قوت دکھائی۔

ان مسایل میں سب سے مشکل مسئلہ ہندوؤں کی ستی کی رسم سے متعلق تھا۔ لفظ ستی کے لغوی معنی ہیں "وہ جو صادق ہو" اور رفتہ رفتہ یہ لفظ ایک وفادار زوجہ اور ایک ایسی سچی عورت کے متعلق استعمال ہونے لگا جو اپنی اور اپنے شوہر کی زندگی کو بالکل ایک ہی جانتی ہو۔ ازدواجی پاکیزگی کا اعلیٰ معیار ہندو گھرانوں کے قصص اور روشنیات میں مشہور ہے، اور سیتا اور ساوتری کی کہانیاں

اب تک ہندو بیویوں کی روش کو ان کے شوہروں کے تابع بنانے میں بہت موثر ہیں۔ پران کے قصوں میں ستنوا کے مطابق دیدہ و دانستہ جانوں کے ہلاک کرنے کی مثالیں موجود ہیں۔ زمانۂ حال میں اس رسم کی ابتدا اُس عام تاریکی چیستان میں پوشیدہ ہے جس نے ہندوستان کی معاشری تاریخ کو دھندلا کر دیا ہے۔ ہندوستان میں ستی کا رواج راجپوتوں کی حکمران قوم کے سوا کسی دوسرے زمانے میں عام طور پر نہ تھا۔ راجپوتوں اور نیم راجپوت قبیلوں میں شاید وہ زیادہ تر باہم دوامی جنگ و جدل سے اور بعد کو فاتح مسلمانوں کے تشدّد کی وجہ سے باقی رہ گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ستی کی واردات بعض ایسی اقوام میں پائی گئی جو کھتری نسل کی ہونے کا دعویٰ نہ رکھتی تھیں اور ستی کا رواج ہندوستان کے شمالی صوبوں میں جن میں بنگال شامل تھا عام ہو گیا۔ یہ بات جلد معلوم ہو گئی کہ جو وجہ تحریک بیچاری عورت کو اپنی ہلاکت کے فعل پر آمادہ کرتی تھی وہ ہمیشہ پاک دامنی کے جوش یا ازدواجی وفاداری پر مبنی نہیں ہوا کرتی تھی۔ اجتماعی حیثیت سے اور متعدد صورتوں میں جسمانی طور پر جبر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ مادی ہوس اور مذہبی جنون دونوں مل کر معصوم عورتوں کو اپنا شکار بناتے اور انہیں بے رحمی کے ساتھ موت گھاٹ اتارتے تھے۔ پس یہ رواج جو اپنی بہترین شکل میں بھی کوئی ایسی خوبی پیش نہ کر سکتا تھا جو انسانی فطرت کو بلند اور پاک کر کے انسانی مسرت کو بڑھائے خلافِ انسانیت اور وحشیانہ بن گیا اور بجا طور پر تمام صحیح الدماغ اشخاص نے اسے ایک انسانی قربانی قرار دے کر قابلِ نفرت ٹھیرایا۔

ہندو بیواؤں کے نذر آتش ہونے سے متعلق مسٹر پونڈر کی تجویز پر ۲۸ مارچ ۱۸۲۷ء کو ایوانِ ہند کے موضوع بحث میں ستی کی حسب ذیل نہایت اشتعال انگیز و ظالمانہ مثال پیش کی گئی:-

ستی* — ایک برہمن ستیمونامی جب وہ اپنے خاندان سے دور تھا مر گیا۔ دو ہفتے بعد اس کی بیوہ ہو لیا ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً

*Source.—"Good Old Days of John Company." Vol. II, p. 129. (Wm. Carey.)

چودہ سال نفی ستی ہونے کے لیے چل نکلی۔ چتا اس کے ان قریب ترین رشتہ داروں نے تیار کی جو اس وقت اسی گاؤں میں موجود تھے جہاں وہ مقیم تھی۔ اس کا باپ پٹھا تیواری کسی اور حصۂ ملک میں تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اطلاع اسے نہیں دی گئی۔ اس امر کی تحقیق نہیں کی گئی کہ آیا ہومولیا کا ستی ہونا برضا و رغبت تھا۔ یہ فرض کرنا چاہیے کہ صورت حال ایسی ہی تھی۔

ابتدائی رسوم ختم ہونے کے بعد ہومولیا چتا پر چڑھ گئی جسے اس کے چچا شیولعل قیدی نے آگ لگادی۔ تھوڑی ہی دیر میں تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی اور وہ شعلوں سے باہر کود پڑی، لیکن شیولعل، بھوک اور دیگر اشخاص نے اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر اسے دوبارہ چتا پر پھینک دیا۔ جب وہ زیادہ جلنے لگی اور اس کے کپڑے بھی بالکل جل گئے تو وہ پھر چتا پر سے کود پڑی اور قریب کی ایک باؤلی کو جاکر پانی کی جگہ روتی ہوئی لیٹ گئی۔ اب شیولعل نے ایک چادر لے کر جو اس موقع کے لیے مُروسا نے اسے دی، زمین پر پھیلادی اور ہومولیا سے اس پر بیٹھنے کی خواہش کی۔ اس نے کہا "نہیں، میں اس پر نہیں بیٹھوں گی، تم مجھے پھر آگ کے پاس لے جاؤ گے اور میں اس کو روانہ رکھونگی، میں خاندان کو چھوڑ دونگی اور بھیک مانگ کر یا کسی اور طریقے سے زندگی بسر کرونگی اگر تم لوگ مجھ پر محض رحم کرو گے۔" شیولعل نے اس پر گنگا کی قسم کھاکر کہا کہ اگر وہ چادر پر بیٹھ جائیگی تو وہ اسے اس کے گھر پہنچا دیگا۔ اس نے حسبہ عمل کیا۔ ان لوگوں نے اسے چادر میں باندھ دیا، ایک بانس منگوایا جسے گانٹھ میں سے جو چادر کو لپیٹ کر لگائی گئی تھی گزار اگیا اور اس طرح اسے لٹکا کے چتا کے قریب جاکر جو اب خوب بھڑک رہی تھی اس پوٹلی کو شعلوں میں پھینک دیا۔ چادر فوراً جل گئی اور بدقسمت لڑکی نے پھر ایک بار اپنے کو بچانے کی کوشش کی کہ اس اثنا میں باقی لوگوں کے اکسانے پر ایک مسلمان بُوراجی اپنی تلوار کے ساتھ اس کے بہت قریب پہنچا اور اس کا سر کاٹتے ہی وہ پشت کی جانب گر پڑی اور موت نے اسے مزید کشمکش سے نجات دلادی۔

مسلمان حکمرانوں نے ستی کے رواج کو روا رکھا تھا گو کم ازکم ایک موقع پر

اکبر نے بذاتِ خود مداخلت کر کے اس مہلک رسم کو روک دیا تھا۔ ایک طویل مدت تک انگریزوں نے بھی گو وہ اس رسم کی شقاوت سے متنفر ہو گئے تھے اس بات پر کہ یہ عمل خود بیوہ کی جانب سے بہ رضا و رغبت ہونا چاہیے اصرار کرنے کے سوا کچھ اور کرنا خلافِ عقل سمجھا۔ لارڈ ہیسٹنگز کو بدقسمتی سے ایسے وقت حکمرانی کا موقع نہیں ملا جب کہ حکومت زیادہ اہم خطروں میں پڑ سکتی تھی، لیکن اس نے لارڈ بنٹنگ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اس قبیح رسم کے انسداد سے متعلق اس کے ارادے کی تائید گرم جوشی سے کی۔ لارڈ امہرسٹ نے بھی اس معاملے پر اپنی عمیق ترین توجہ صرف کی لیکن وہ بہت دل برداشتہ ہو کر اس نتیجے پر پہنچا کہ ممانعت اگر ناممکن نہیں تو خلافِ عقل ضرور ہو گی۔ اس نے ۱۸۲۷ء میں لکھا کہ "میں کسی ایسے قانون کی سفارش کرنے پر آمادہ نہیں ہوں جو ستی کو بالکلیہ ممنوع کر دے .... اگرچہ یہ خیال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے کہ میں نے اس قبیح رسم کی شدت پر کوئی توجہ نہیں کی لیکن میں صاف طور پر اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُس ترقی سے متعلق اپنے اعتماد پر زور دینے کی جانب مائل ہوں جو اس مذموم رسم کے تدریجی انسداد کے لیے ہندوستانیوں میں اشاعتِ تعلیم کے ذریعے ہو رہی ہے میں ممکن باور نہیں کر سکتا کہ ہر سال مفید و معقول علوم میں جو ترقی ہو رہی ہے اس کے باوجود بیواؤں کو جلانے یا زندہ دفن کرنے کی رسم زیادہ مدت تک جاری رہ سکے گی۔"

یہ افتخار لارڈ ولیم بنٹنگ ہی کو حاصل ہے کہ اس نے عظیم ترین اخلاقی جرأت سے سنجیدہ صورتِ حال کا مقابلہ کیا۔ اس میں اور فی الواقع دیگر تمام اصلاحات میں جو اس کے نام سے موسوم ہیں اسے اپنے رفیق سر چارلس (بعد ازاں لارڈ) مٹکاف کی اعانت و حمایت حاصل تھی۔ لارڈ ولیم بنٹنگ نے معلوم کر لیا کہ کامل ممانعت سے کم درجے کی کوئی چیز ہرگز مفید نہیں ہو سکتی اور اس نے انسداد کے

ما۔ لارڈ امہرسٹ کی یادداشت۔ "شایع شدہ مراسلات"۔

بالواسطہ طریقوں کی تائید سے انکار کر دیا۔ ہندوستان میں علوم کی تدریجی ترقی سے بھی اسے کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ اس معاملے میں مستقل مزاج ہو کر اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ عمل کی جانب قدم بڑھایا اور ان اشخاص سے مشورہ کیا جو بہترین مشیر ہو سکتے تھے۔ اسے معلوم ہوا کہ ستی کے واقعات زیادہ تر کلکتہ کے اضلاع میں پیش آئے ہیں جہاں کے باشندوں سے غیر مخالفانہ ہل چل کے سوا اور کسی چیز کے خطرے کا گمان نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے اطمینان کے لیے تدابیر بھی اختیار کیں تاکہ کامل ممانعت سے سپاہیوں میں عملی مخالفت کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ تب اس نے اپنی کونسل کے غور و خوض کے لیے اپنی وہ مشہور یادداشت سپرد قلم کی جو زبان کی نفاست اور فیصلے کی معقولیت کے لحاظ سے دنیا کے بہترین سرکاری مراسلات میں شمار ہونی چاہیے۔ اس کے جرأت آمیز عمل سے پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ جیسا کہ سر جے۔ ڈبلیو۔ کیئی بیان کرتا ہے "قانون مذکور کے نفاذ سے کمپنی کے سارے علاقوں میں ستی کا خاتمہ ہو گیا۔" اور اس سے زیادہ اطمینان بخش صورت یہ تھی کہ دیسی ریاستوں نے بھی رفتہ رفتہ میجر لڈلو رزیڈنٹ جیپور وغیرہ کے سے اشخاص کے دانشمندانہ مشوروں کی مدد سے بہ رضا و رغبت بنٹنک کی تقلید کی۔ اس کی کامیابی کا راز اس کے مقصد کی محض سادگی تھی جس کے متعلق ہر وہ شخص جو بنٹنک کو جانتا تھا کوئی اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوؤں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑا ہے جس کا اصلی مقصد ان کی اصلاح ہے اور اسی لیے انہوں نے اس کے افعال کا وہی نشا لیا جو در حقیقت تھا۔

لارڈ ولیم بنٹنک کو اپنے نہایت مشکل کام میں رام موہن رائے اور دیگر معاشرتی مصلحین سے قابل قدر مدد ملی۔ ایک قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ موہن رائے نے اپنے بھائی کی بیوہ کو ستی ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ اس عورت نے پہلے تو ان کی مزاحمت کی کچھ پروا نہیں کی لیکن جب شعلوں کی تکلیف محسوس ہوئی تو اس نے چتا سے بچ نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے کٹے مذہبی رشتہ داروں اور پجاریوں نے اسے بانسوں سے دبا کر

وہیں مرنے کے لیے روک رکھا اور ڈھول اور پیتلی باجے زور زور سے بجائے گئے تاکہ اس کی چیخوں کی آواز سنائی نہ دے۔ رام موہن نے اس کی جان بچانے میں بے بس ہو کر اور ناقابل بیان غصے اور رحم سے بھر کر وہیں اور اسی وقت از خود عہد کر لیا کہ وہ اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک اس ظالمانہ رسم کی بیخ کنی نہ ہو جائے[1]۔ انھوں نے اپنا عہد برقرار رکھا۔ انھوں نے اخباروں اور عام جلسوں میں اس قبیح رسم کی خوب مذمت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

اس مقصد کی بنا پر رام موہن رائے نے مستعد ہو کر اس وحشت اور بربریت کو جو ستی میں متضمن تھی ظاہر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ رام موہن ہی کی شخصیت تھی جس نے غیر قوم کے نیک نیت حکام کا معاشرتی اصلاح کی ان کوششوں میں ہاتھ بٹایا جو راسخ الاعتقاد طبقے کی اخلاقی قوت کے ازالے کے ذریعے کی گئیں۔ جب کلکتہ کے ہندوؤں نے ۱۸۱۸ء میں ایک محضر بھیجا جس میں ستی کے واقعات سے متعلق مخالفانہ کارروائیوں کے مصدرہ احکام کی تنسیخ کے لیے التجا کی گئی تھی تو انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک تردیدی محضر بھیجا گیا جس میں ان احکام کی خوبی اور انسانی ہمدردی کی گرم جوشی سے تائید کی گئی۔ ستی کے بڑے بڑے خوفناک منظروں میں سے بعض ان کی پرزور عبارت میں یوں بیان کیے گئے ہیں: "یہ درخواست گزار اپنی ذاتی معلومات یا قابل اعتماد شواہد رویت کی بنا پر پوری طرح آگاہ ہیں کہ ایسے واقعات اکثر پیش آئے ہیں جن میں عورتوں کو ان کے آیندہ وارثوں نے جوان کی موت کے خواہاں ہوتے ترغیب دے کر ان کے شوہروں کے ساتھ چتا پر جل مرنے کے لیے آمادہ کیا ہے، بعض عورتوں کو جنھوں نے خوف کھا کر اس ارادے کو ترک کرنا چاہا جو ان کے متوفی شوہروں کے ساتھ جل مرنے کی مصیبت کے ابتدائی لمحوں میں بے تحاشا ظاہر کیا گیا تھا جبراً چتا پر ڈھکیل دیا گیا اور وہیں ان کو رسیوں سے باندھ کر ہرے بانسوں سے اس وقت تک داب رکھا گیا جب تک کہ وہ شعلوں سے جل کر خاکستر نہ ہو گئیں اور بعض کو جو شعلوں سے بچ نکلی تھیں ان کے رشتہ داروں نے

---

[1] یعنی "سوانح و خطوط رام موہن رائے" مصنفہ کولٹ صفحہ ۱۵۔

واپس لا کے جلا کر مار ڈالا۔ درخواست گزاروں کی یہ عاجزانہ التماس ہے کہ مذکورہ تمام مثالیں ہر شاستر کی رُو سے نیز تمام اقوام کی معمولی فہم کے لحاظ سے بمنزلۂ قتل کیے ہیں[1]۔" موہن رائے بیرونی مہم پر اکتفا نہ کر کے اپنی جان کو خطرۂ عظیم میں ڈال کر کلکتہ کے مرگھٹ پر جایا کرتے تھے اور ستی کی معینٹ کو صداقت آمیز ترغیب کے ساتھ رُو کنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۸۲۹ء میں جب لارڈ ولیم بنٹنک نے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے مستند اقتباسات سے یہ ثابت کیا کہ ستی کوئی مذہبی فرض نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے بہت کچھ کیا چنانچہ انہوں نے بتایا کہ ستی کی رسم کو جو مداومت حاصل ہو گئی ہے اس کی وجہ ایک بڑی حد تک کوئی مذہبی اعتقاد نہیں بلکہ رشتہ داروں کی یہ حریصانہ خواہش ہے کہ وہ بیوہ کی پرورش کے مصارف سے بچیں۔ لہٰذا اس رسم کے انسداد سے کوئی مضرت، مذہب کو نہیں پہنچیگی جس کے متعلق برطانیہ نے اپنی ساکھ پر رواداری واحترام کا عہد کیا تھا۔

ستی کی موقوفی*

خواہ ستی کے رواج کو جاری رکھنے کا سوال ہو یا اسے روک دینے کا، دونوں صورتوں میں فیصلہ پُرخطر ذمہ داری سے مملو ہے۔ سال بہ سال سینکڑوں بے گناہ مظلوموں کے بے رحمانہ و بے وقت موت کے حوالے کیے جانے پر رضامندی کا اظہار کرنا جبکہ اس فعل کو روکنے کی قوت موجود ہو ایک ایسی صورت حال ہے جسے کوئی شخص خوف زدہ ہوئے بغیر نہیں سوچ سکتا۔ لیکن دوسری جانب اگر سابق کی وصول شدہ رائیں کسی نہ کسی طرح قابل وقعت سمجھی جائیں تو ایک متضاد طریق عمل کے ذریعے ہندوستان میں خود برطانوی سلطنت کی سلامتی کو خطرے میں ڈالنا اور سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ کروروں افراد کی حالت کو متاثر کرتے ہوئے اُن اہم اصلاحات کی جن کی توقع ہمارے اقتدار کے جاری رہنے ہی سے ہو سکتی ہے ساری امیدوں پر پانی پھیر دینا ایک ایسا بدل ہے جو خود انسانیت کی روشنی میں بھی ایک عظیم ترغیبات سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی ایک اولین و اعلیٰ ترین خیال یعنی بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود

[1] "سوانح و خطوط رام موہن رائے"، مصنفہ کولٹ صفحہ ۳۱۔

*Source.—(i) Minute by Lord William Bentinck, 1829.

کی بنا پر میری رائے میں کسی مہذب قوم کی حکومت اس خلاف انسانیت اور ناپاک رسم کو روا رکھ سکتی ہے۔ جہاں اس اہم مسئلے کا حل اس کے ممکن اثرات کی عدیم المثال وسعت کے لحاظ سے پریشان کن ہے وہاں وہ خیالات جن سے ان کا تعلق ہے ایسے ہیں کہ قوی ترین دماغ بھی اس کی یکسوئی پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف مذہب و انسانیت اپنی نہایت خطرناک شکل میں مع نخوت و طمع۔ مختصر یہ کہ انسانی دل پر اثر کرنے والی تمام زبردست ترین قوتیں ـــــ فیصلے کو متاثر اور متضاد کرنے کے لیے صف بستہ ہیں اور دوسری طرف بمدت مدید سے ستی کے جاری رہنے کی سند، تمام مسلمان فاتحوں کی مثال اور اسی قسم کی روش سے خود ہمارے قابل ترین حکمرانوں کا کامل اتفاق نیز عوام کا عام جذبۂ احترام یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو احساس اور عقل دونوں کا لحاظ کرتے ان کے فطری حق کے استعمال میں کسی طرح کی مداخلت کرنے سے صریح طور پر مانع نظر آتی ہیں۔ اس رواج سے پہلی مرتبہ انحراف کی جرأت کرنے میں ہمارے لیے یہ ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ کوئی چیز احساس کے تابع نہیں کی گئی ہے بلکہ عقل اور محض عقل ہی کی بنا پر فیصلہ صادر ہوا ہے۔

اپنے پیشروؤں کے طرزعمل کی مذمت کرنے کا خیال تو کجا میں یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ ان حالات میں مجھے بھی ویسا ہی کرنا پڑتا جیسا کہ انہوں نے کیا۔ سیاسی بے احتیاطی کے اس الزام سے بری ہو کر جو معین مسلک کے موجودہ انحراف سے مترشح ہو سکتا ہے میں اختیار کردہ تدابیر کے پرامن ہونے کو اس قدر کامل طور پر ثابت کرنے کی توقع رکھتا ہوں کہ کسی قسم کے خوف و خطر کے اس اندازے کی بھی ضرورت نہ ہوگی جو ایک فائدہ عظیم کے حاصل کرنے کے لیے معقول اور منصفانہ طور پر کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس کے برخلاف کہ میں اس اہم و خطرناک جدت کا واحد حامی ہوں میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ موجودہ حکومت کا غلبۂ آرا مدت سے ستی کی موقوفی کی تائید میں رہا ہے۔ فی الواقع گزشتہ تجربہ و دیگر تمام اشخاص کے قطع نظر میرے بآسانی قطعی نتیجے پر پہنچنے کے بارے میں مزاحم ہونا چاہیے۔ میں نے بہ حیثیت گورنر مدراس ایسے بغاوت ویلور میں

لارڈ بینٹنک نے بہ حیثیت گورنر مدراس ایسے احکام جاری کیے تھے جن کی بنا پر سپاہیوں کو جبکہ

مذہبی رسوم کی خیالی خلاف ورزی کے خطرناک نتائج کے اثرات دیسی رعایا اور فوج کے دماغوں پر مسلط دیکھے تھے۔ میں یہ نہیں بھول سکتا کہ اس منحوس سانحے کا خود میں بے گناہ نشان ملامت بنا تھا اور میں معقول طور پر اس خوف کا اندازہ کر سکتا ہوں کہ ناکامی کی صورت میں جو ذمہ داری بجا طور پر مجھ سے منسوب ہوگی وہ اُسی واقعے کا اعادہ کرائیگی۔ احتیاط اور اپنی حفاظت کا تقاضا مجھے اپنے پیشروؤں کی پیروی کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن انسانیت اور تہذیب کے ایک عظیم و اہم معاملے میں جہاں انسان کو اپنی موجودہ یا آیندہ مسرت کی پروا نہ کرنی چاہیے ایسی قبیح و خود غرضانہ حکمت عملی کے تقاضے پر کون عمل کر سکتا ہے۔ مستحکم اور مکمل یقین کے باوجود جو اس مسئلے کے متعلق مجھے حاصل ہو گیا ہے اگر میں اس سنجیدہ فرض کے ادا کرنے میں پس و پیش کروں تو میرا جرم کسی قتل عمد کے ارتکاب سے کم نہ سمجھا جائیگا۔ اس احساس نے مجھے پہلے ہی سے مجروح کر دیا ہے۔ ہر روز کی تاخیر خوفناک فہرست میں ایک فرد کا اضافہ کرتی ہے جس کی روک تھام موجودہ مسئلے کو بہت پہلے پیش کر دینے سے ہو سکتی تھی۔ لیکن بد دوران سال حال عوام میں بہت زیادہ بے اطمینانی پیدا ہوگئی اور جب اضطراب پھیلا ہوا ہو، ہر قسم کے مبالغے خوب گشت کرتے ہوں اور ہندوستانی فوج کسی حد تک اس خوف میں ہو کہ مبادا اس کے بھتے بھی یورپی عہدہ داروں کے بھتوں کے ساتھ کم ہو جائیں تو اس وقت مکار اور منصوبہ باز دشمنوں کو ایسا موقع دینا جس سے وہ امن عامہ میں خلل ڈال سکیں خلاف عقل ہوتا۔ حکومت کی موجودہ تدابیر سے جو سپاہیوں کے مفاد کو حالیہ تخفیف افواج کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئیں حکومت کی نیت کے متعلق سارے وسوسے دور ہو جائینگے اور اسی صورت حال کا خیال میرے پس و پیش کا

(باقی حاشیہ صفحۂ گزشتہ) وہ فوجی وردی میں ہوں قشقہ لگانے اور کان میں بالے پہننے کی ممانعت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ویلور میں بغاوت ہوگئی۔ اس واقعے کو مجلس نظما نے سنگین قرار دیا اور بنٹنگ کو واپس طلب کر لیا۔
۲؎ اس کا تعلق مسلم بٹہ سے ہے جبکہ نظما کے حکم سے ان کے بھتے کم کر دیے گئے تھے۔ نظما کے حکم سے ہندوستانی فوج کے دستوں میں ایک حد تک فطری طور پر بہت زیادہ اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔

واحد سبب بنا ہوا تھا مگر اب میں ہمارے منصوبوں میں رحمت الٰہی شامل رہنے کی دعا کرتے ہوئے اُن وجوہ کو بیان کرونگا جن پر میری رائے قایم ہوئی ہے۔

اب ہمارے سامنے نظامت عدالت[1] کی رُوداد میں موجود ہیں جن میں ۱۸۲۷ء و ۱۸۲۸ء کی واردات ستی کا ذکر ہے۔ موخرالذکر سال میں ۱۸۲۷ء کے بالمقابل ۴۵ واردات کی کمی ظاہر ہوتی ہے اور سابق سنین کے مقابلے میں تو بہت زیادہ کمی ہے۔ اگر اس تخفیف کو تہذیب یا تعلیم کی ترقی کے باعث مسئلۂ زیر بحث سے متعلق کسی قسم کی تبدیلیٔ رائے پر محمول کیا جا سکے تو یہ امر نہایت اطمینان بخش ہوگا اور ذاتی اصلاح کی اس یقینی مگر سست رفتار عمل میں خلل انداز ہونا بالکل خلاف عقل و مصلحت ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں با اطمینان کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ کلکتہ میں ممکن ہے اعلیٰ طبقوں پر صداقت کا سکہ خوب بیٹھا ہو تا ہم جہاں تک عام آبادی کا تعلق ہے کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور ان وجوہ سے کم از کم اس رسم کے متروک ہونے کی کوئی معقول امید نہیں ہو سکتی۔

* * * * * * *

میرا خیال ہے کہ یادداشت ہذا کے دستاویزات منسلکہ کے ملاحظے سے نیز اُن واقعات سے جو مجھے بیان کرنے ہیں یہ صاف طور پر واضح ہو جائیگا کہ رعایا میں قانون سے متجاوز ہو کر اثر و اقتدار کو مجہول طور پر تسلیم کر لیتے کا مادہ اس قدر زیادہ ہے کہ حکومت کی طرف سے محض ضمنی منظوری بھی ستی کی رسم کو بالکل موقوف کر دیگی۔ اس طریق موقوفی کی سفارش ان اشخاص میں سے بہتیروں نے کی ہے جن سے مشورہ کیا گیا اور اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ کئی اعتبارات سے قابل ترجیح ہو سکتا ہے کیونکہ یہ زیادہ خاموش تغیر ہوگا مگر ساتھ ہی ساتھ موثر بھی ہوگا اور اس سے وہ خوف پیدا نہ ہوگا جو شاید کسی عام قانون سے ہو سکتا ہے

---

[1] ۔ مرکزی عدالت فوجداری۔

نیز بصورت ناکامی زیادہ وقت اور کسی اخلاقی گفت و شنید کے بغیر اس سے انحراف بآسانی ہو سکیگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ایسی حکومت اختیار نہیں کر سکتی جو پارلیمنٹ کے نزدیک قانونی حکومت اور اس کے نیک منشا کے مطابق عمل کرنے پر پابند ہو۔ مزید برآں برطانوی سلطنت کی موجودہ حیثیت کے لحاظ سے یہ مشتبہ ہے جایز طور پر کیا جا سکتا ہے کہ آیا اس قسم کی کوئی پوشیدہ کارروائی درحقیقت عمدہ حکمت عملی سمجھی جا سکتی ہے۔ جب ہمارے پڑوسی قوی تھے اور ہم اپنی حفاظت سے متعلق بے اطمینانی کی وجوہ قوی تر رکھتے تھے تو ممکن ہے مصلحت وقت کا تقاضا بالواسطہ و پُر احتیاط کارروائی کے لیے ہوتا ہو، لیکن اب جبکہ ہم مقتدر اعلیٰ ہیں میری قطعی رائے ایک ایسی برملا، علانیہ اور عام ممانعت کی تائید میں ہے جو بانکلیہ قانون کی اخلاقی خوبی اور ہماری قوت نفاذ پر مبنی ہوگی اور کسی مذبذب تجویز کے خلاف میری رائے اس قدر اٹل ہے کہ اگر میں کامل موقوفی کے پُر امن ہونے کا قایل نہ ہوتا تو یقیناً میں ہر قسم کی مداخلت کے انسداد کا مشورہ دیتا۔

ان تمام اشخاص میں سے جنہوں نے اس رسم کی موقوفی کے خلاف رائے دی ہے اور ان قبیح نتایج کا ذکر کیا ہے جن کا بصورت موقوفی پیدا ہونا ممکن ہے میں مسٹر ہوریس ولسن[۱] کی رائے سے زیادہ کسی شخص کی رائے کو قابل وقعت نہیں سمجھتا۔ اس کے خیال میں ایک خطرناک غلطی اُن حقیقی مشکلات سے گریز کرنا ہے جو اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش میں پیش آتی ہیں کہ ستی "لازمی طور پر ہندو مذہب کا جزو نہیں ہے۔" مجھے اس سے کامل اتفاق ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ حقیقت میں یہ رسم کیا ہے بلکہ یہ کہ اسے کیا سمجھا جاتا ہے اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہر طبقے کے ہنود چند مستثنیات کے سوا اپنے صدق اعتقاد کی بنا پر اسے مقدس رسم خیال کرتے ہیں۔

---

[۱] - مستند کلیۂ ہنود۔

مسٹر ولسن کا خیال ہے کہ اس رواج کو اٹھانے کی کوشش سے وسیع پیمانے پر بے اطمینانی پھیلیگی۔ مجھے اس رائے سے بھی اتفاق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کامیابی محض جزوی ہوگی جو میرے نزدیک مشتبہ ہے۔ اس کا تصور یہ نہیں ہے کہ ممانعت کا اعلان کسی فوری اور صریح عمل نافرمانی کا باعث ہوگا بلکہ یہ کہ لازماً منافقتے اور عوام کی بے اطمینانی کے مظاہرے ہونگے۔ لیکن وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی انہیں شبہ پیدا ہو جائے کہ برطانوی حکومت کا منشا یہ ہے کہ اب تک مذہبی معاملات میں نہایت مکمل رواداری کا جو مستحکم اصول جاری ہے اسے ترک کر دیا جائے تو سب کے دلوں میں ہمارے آیندہ مقاصد کے متعلق اس قدر بے اطمینانی پیدا ہو جائیگی کہ وہ آیندہ کسی ایسے انتظام پر بھی عمل پیرا نہ ہوں گے جو ان کی ترقی کے لیے کیا جائے اور پاکیزہ اصول اخلاق نیز نیک و اعلیٰ اصول عمل میں جو آب یورپی تعلیم اور علوم کے ذریعے تیزی کے ساتھ عوام کے ذہن نشین کرائے جا رہے ہیں ایک خطرناک مزاحمت ہوگی میں مانتا ہوں کہ اسی قسم کی رائے کہ ہمارے آیندہ مقاصد کے متعلق گہری بے اطمینانی پھیل جانے کا اندیشہ ہے مجھ پر اس روشن خیال ہندوستانی رام موہن رائے نے ظاہر کی تھی جو ستی نیز ان تمام توہمات وقبائح کو مٹا دینے کے پرزور حامی تھے جو ہندو مذہب میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کے خیال میں ہندو مذہب ابتداءً ایک خالص توحید پرست مذہب تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ستی کا رواج خاموش و غیر نمایاں طور پر اس کی راہ میں مشکلات کے اضافے سے اور پولیس کے بالواسطہ ذریعے سے مسدود ہو سکتا ہے۔ ان کو یہ خوف تھا کہ سرکاری قانون سے عام سراسیمگی پیدا ہو جائیگی اور استدلال یوں ہوگا کہ "جب انگریز اپنے اقتدار کے لیے لڑ رہے تھے تو اس وقت انہوں نے یہ قرین مصلحت خیال کیا کہ عام رواداری اور ہمارے مذہب کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے لیکن اعلیٰ اقتدار کے حاصل ہوتے ہی ان کا سب سے پہلا کام عہد شکنی ہے اور اس کے بعد مسلمان فاتحوں کی طرح غالباً وہ اپنا مذہب قبول کرنے پر ہمیں مجبور کر ینگے"۔

اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے جیسا کہ اس کی جانب میں ہمیشہ مایل رہتا ہوں کہ مذکور بالا خیالات میں بہت کچھ صداقت ہے، لیکن ان نتائج سے مطلق اتفاق نہ کرتے ہوئے جو اگرچہ ظاہر نہیں کیے گئے تاہم بہت ناموافق آثار رکھتے ہیں اب میں اس قباحت نیز اس وسعت خطر کی تحقیقات کرونگا جو مذکورہ تجویز سے عملاً پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سارے احاطۂ فورٹ ولیم میں سنی کی جو ۶۳ ہم واردا تیں ہوئیں ان میں سے ۲ ہم بنگال، بہار و اوڑیسہ میں جنہیں صوبجات نیشیبی کہا جاتا ہے واقع ہوئیں اور ان موخرالذکر وارداتوں میں سے ۲۸ صرف قسمت کلکتہ میں واقع ہوئیں۔

کسی اجنبی شخص کو جو ہندوستان سے واقف نہ ہو یہ یقین دلانا تو کجا سمجھانا بھی بہت مشکل ہوگا کہ لاکھوں باشندوں کی آبادی میں جس پر قسمت کلکتہ مشتمل ہے اور جہاں کی صورت حال صوبہ جات نیشیبی پر بھی منطبق ہو سکتی ہے اخلاقی جرأت اور قوت کی اس قدر کمی ہے اور صدیوں کی ایسی عادتی غلامانہ فطرت ہے کہ حکمراں طاقت کے حکم کے خلاف بغاوت یا مخالفانہ مقابلہ کا خطرہ ناممکن قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر انسانی جانوں کی اس افسوسناک تباہی کا منظر صوبہ جات نیشیبی کی بجائے صوبہ جات بالائی میں دلیر و شجیع اشخاص کے درمیان پیش آتا تو میں حفاظت کے سوال کے متعلق زیادہ یقین کے ساتھ اظہار خیال نہ کرتا۔ ان صوبہ جات میں جہاں کی آبادی تقریباً دو کرور ہے ستی کی وارداتیں صرف ۴۳ تک ہوئی ہیں۔ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک ایسے مقام پر جہاں کسی قسم کا بھی اتحاد بالکل خلاف معمول ہے کوئی عام ہیجان ایک ایسی رسم کی موافقت میں پیدا ہو سکتا ہے جس میں بہت کم اشخاص حصہ لیتے ہوں اور جو علانیہ دیگر ارکان خاندان کی جانب سے اکثر و بیشتر ذاتی اغراض کے نظر کرتے ہی عمل میں لائی جاتی ہے۔

* * * * * * *

بہرحال یہ ایک بالکل مختلف اور اہم تر سوال ہے کہ ہندوستانی فوج

کس حد تک خوف زدہ ہو سکتی ہے اور عام طور پر وہ کب تک ستی کی رسم پر کاربند رہ سکتی ہے اور کہیں عیار اشخاص و بلور کے معاملے کی طرح فوری بغاوت پیدا کرنے یا دوامی منافرت کا بیج بونے کا قصد کر کے موجودہ صورت حال سے فایدہ تو نہ اٹھائینگے۔ ہماری ہندوستانی اور یورپی فوجوں کے درمیان بلحاظِ تعداد جو بڑی نامناسبت ہے اس کے نظر کرتے یہ ظاہر ہے کہ فوجوں کا عام اتحاد سلطنت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن سکتا تھا اور اسی لیے یہ لازم ہوا کہ ہندوستانی سپاہیوں کے دماغ پر جس اثر کے مترتب ہونے کا امکان ہے اس کا اندازہ کرنے میں پوری احتیاط سے کام لیا جائے۔

مجھے کونسل کے سامنے اس گشتی کی نقل مع جوابات پیش کرنے کا شرف حاصل ہے جو ایسے اشخاص عہدہ داروں کے نام بھیجی گئی تھی جن کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی فہم اور تجربے کے لحاظ سے ہندوستانی فوج پر مجوزہ تدبیر کے اثر کا اندازہ لگانے کے لیے موزوں ترین افراد ہیں۔

اب مجھے کونسل کے غور و خوض کے لیے اس قانون کا مسودہ پیش کرنا ہے جس میں ستی کی موقوفی مدون ہے۔ اس کے ساتھ ایک کاغذ منسلک ہے جس میں نظامت عدالت کے حکام کی آرا و تجاویز مندرج ہیں۔ اس کاغذ میں پیش کردہ تجویز کی تائید میں مذکورہ عدالت کی متفقہ آرا کا اعادہ کیا گیا ہے۔ نظامت عدالت کی تجاویز میرے ایک اہم مقصد سے جو ستی کے مرتکب فریق اور عہدہ داران کوتوالی کے باہمی تصادم کو روکنے کے متعلق تھا کسی قدر مختلف ہیں۔ صرف ابتدائی کارروائیوں میں یا عین ادائے رسم کے دوران میں جب کہ سب کے احساسات کم و بیش مشتعل رہتے ہیں اختیارات کے نامناسب و غیر معقول استعمال کی وجہ سے فسادات یا مناقشات کے درپیش آنے کا مجھے اندیشہ ہے۔ اسی لیے مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ پولیس بصورت ابتدائی صرف ہدایت اور تاکید کر دے مگر تشدد کے ساتھ ممانعت نہ کرے اور اگر اس اطلاع کے خلاف ستی کی رسم ادا کی جائے تو اس کی رپورٹ مجسٹریٹ کو بھیجی جائے جو فریقین کو طلب کرے گا اور اس بارے میں کسی دوسرے مقدمۂ جرم کی طرح باضابطہ کارروائی کریگا۔ یہ پیش بندیاں عدالت ہند کے خیال میں غیر ضروری

نظر آتی ہیں اور مجھے توقع ہے کہ وہ اسی خیال کی حامی رہینگی، لیکن ابتدا میں میرا خیال ہے ہم بہت زیادہ چوکسی کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے بایں خیال کہ مقامی جج کے انتہائی جوش کی بنا پر بہت عاجلانہ یا سخت حکم سزا نافذ نہ ہونے پائے میں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس قسم کا مقدمہ کمشنران دورہ کے لیے قابل سماعت قرار دیا جائے۔

میں اب اپنا معروضہ ختم کر چکا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور و خوض کرنے میں احساسات و جذبات کا دخل نہ ہونے کا جو عہد میں نے کیا تھا اسے میں نے پورا کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ظاہر ہو جائیگا کہ میں نے تمام مشکلات و اعتراضات کی اہمیت کو ملحوظ رکھا ہے، واقعات کو صدق و غیر جانب داری کے ساتھ بیان کیا ہے اور جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں اس کی تطبیق استدلال و اسناد سے ہوتی ہے۔

میرا سب سے پہلا اور اولین ولی مقصد ہندوؤں کی فلاح و بہبود ہے۔ میں ان کی آئندہ حالت کی اصلاح کے لیے کوئی شئے اس قدر اہم نہیں جانتا جس قدر پاکیزہ اخلاق کی تلقین خواہ ان کا اعتقاد کچھ ہی ہو اور خداوند تعالیٰ کی مشیت کا جائز تصور ہو سکتا ہے۔ اس بہتر مفہوم کے پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلی تدبیر یہ ہونی چاہیے کہ مذہبی اعتقاد و رواج سے کشت و خون کے خیالات کو جدا کر دیا جائے۔ پھر جب وہ اس وحشیانہ جوش و خروش سے محفوظ رہینگے تو ٹھنڈے دل سے مسلمہ صداقتوں کا احساس کرینگے۔ وہ دیکھینگے کہ قوانین الٰہی میں کوئی تباین نہیں ہو سکتا اور اس حکم میں جسے تمام بنی نوع انسان الہامی مانتے ہیں کہ "کسی بے گناہ کا خون نہیں بہایا جائیگا" کوئی استثنا نہیں ہو سکتا اور جب وہ اپنے اس اولین اور سب سے زیادہ مجرمانہ رواج کی غلطی کا اعتراف کرینگے تو کیا یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ دوسرے رسم و رواج بھی جو ان کی راہ ترقی میں حائل ہیں اٹھ جائینگے اور اس طرح ان مزاحمتوں اور پابندیوں سے جب ان کے دل و دماغ اور افعال آزاد ہو جائینگے تو وہ آئندہ ہر غیر ملکی فاتح کے غلام بنے رہنا گوارا نہ کرینگے جیسا کہ اب تک کرتے رہے ہیں بلکہ بنی نوع انسان کے اعلیٰ خاندانوں میں اپنی مناسب جگہ حاصل کر لینگے؟ میں اس قسم کے خیالات میں یا اس

تجویز کے معاملے میں کوئی ایسی رائے قبول نہیں کرسکتا جو انہیں ہمارے مذہب میں داخل کرنے سے متعلق ہو۔ میں ہندوؤں کے لیے واضع قانون کی حیثیت سے محسوس کر رہا ہوں اور لکھ رہا ہوں اور جیسا کہ مجھے یقین ہے یہی احساس و خیال متعدد روشن ضمیر ہندوؤں کا بھی ہے۔

ان اعلیٰ خیالات سے قطع نظر ایک ایسی حکومت کے لیے جس کا میں ایک عضو ہوں ایسے قانون کا فخر حاصل کرنے کا خیال کوئی ذلیل منصوبہ نہیں ہوسکتا جس کی بدولت برطانوی حکومت کے دامن سے ایک بدنما دھبہ نکل جائیگا اور خطرناک نفس پرستی کے لیے ناانصافی اور انسانی قربانی رُک جائیگی۔ آخر میں ہمارے انتظام کے متعلق جو عام نظم و نسق سلطنت برطانوی کے ایک شعبے کی حیثیت رکھتا ہے مجھے اپنی اس خواہش کے اظہار کی اجازت دی جائے کہ ہمارا طرز عمل اس اعلیٰ مثال کی تقلید پر مبنی ہوگا جو برطانوی حکومت ہماری رہنمائی کے لیے انگلستان میں قایم کرے اور انھیں اعلیٰ و ارفع اصول کو جب ممکن ہو ہندوستان کی کثیر آبادی کے حالات پر منطبق کرنے سے ہندوستان اور انگلستان کی عام خوش حالی کو ترقی اور قوم کے کردار کو بلندی نصیب ہوسکتی ہے۔

مورخہ ۸ر نومبر ۱۸۲۹ء

ولیم بنٹنک

ستی یا ہندو بیواؤں کو زندہ جلانے یا دفن کرنے کا رواج انسان کے فطری احساسات کے بالکل مخالف ہے۔ ہندوؤں کے مذہب میں کہیں بھی اسے لازمی فرض نہیں بتایا گیا ہے،* اس کے برخلاف پرہیزگاری اور گوشہ نشینی کی زندگی

---

*قانون جس میں ستی یا ہندو بیواؤں کو زندہ جلانے یا دفن کرنے کا رواج ناجایز اور عدالتہائے فوجداری سے قابل سزا قرار دیا گیا اور جسے گورنر جنرل با جلاس کونسل نے ۴ر دسمبر ۱۸۲۹ء کو منظور کیا۔

* Source.—(ii) "Administration of the East India Company."

Sir J. W. Kaye. (Richard Bentley.)

بیوہ کے لیے مخصوص طور پر قابل ترجیح ہونے کی تلقین کی گئی ہے اور ہندوستان کے باشندوں کا ایک کثیر حصہ اس رواج پر عمل پیرا نہیں ہے۔ بعض وسیع اضلاع میں تو اس کا وجود ہی نہیں ہے اور ان اضلاع میں جہاں یہ رواج بہت زیادہ رہا ہے یہ مشہور ہے کہ متعدد صورتوں میں ایسے مظالم کیے گئے جو خود ہندوؤں کے نزدیک نفرت انگیز اور ان کی نظر میں ناجائز و قبیح تھے۔ اب تک جو تدابیر اس قسم کے افعال کو کم کرنے اور روکنے کے لیے اختیار کی گئیں انہیں کامیابی نہ ہو سکی اور گورنر جنرل باجلاس کونسل کو کامل یقین ہے کہ زیر بحث قبائح عملاً اُس وقت تک رفع نہیں ہو سکتیں جب تک اس رواج کو پورے طور پر موقوف نہ کر دیا جائے۔ ان خیالات سے متاثر ہو کر گورنر جنرل باجلاس کونسل نے برطانوی حکومت ہند کے نظام کے اس اولین و اہم ترین اصول کو ترک کرنے کا قصد کیے بغیر کہ رعایا کا ہر طبقہ اپنے مذہبی معمولات کی بجا آوری میں اس وقت تک آزاد رہے گا جب تک اس اصول کی پابندی، انسانیت و انصاف کے ناگزیر تقاضوں کی خلاف ورزی کے بغیر کی جا سکتی ہو، حسب ذیل قواعد کا نفاذ مناسب تصور کیا ہے اور انہیں بذریعۂ ہذا اس وقت سے قابل نفاذ قرار دیا جاتا ہے جب کہ وہ اُن تمام ممالک میں شایع ہو جائیں جو احاطۂ فورٹ ولیم کے عین ماتحت ہیں۔

۱۔ ستی یا ہندو بیواؤں کو زندہ جلانے یا دفن کرنے کا رواج بذریعۂ ہذا ناجائز اور عدالت فوجداری سے قابل سزا قرار دیا جاتا ہے۔

۲۔ (ا) تمام زمینداروں، تعلقداروں، یا دیگر مالکان اراضی کو، تمام صدر کاشتکاروں اور ہر حیثیت کے شکمی کاشتکاروں کو، تمام ماتحت تعلقداروں، نائبوں اور دیگر مقامی گماشتوں کو، تمام ہندوستانی عہدہ داروں کو جو حکومت یا محکمۂ نابالغان کی جانب سے مالگزاری یا لگان وصول کرنے پر مامور ہوں، اور

۱۔ مالکان اراضی جو ادائیِ مالگزاری کے متعلق حکومت کے نزدیک راست ذمہ دار ہوتے ہیں۔

۲۔ زمینداروں کے گماشتے۔

۳۔ اصل کاشتکار۔

تمام منڈلوں[1] اور دیگر دیہی پٹیلوں کو اس قسم کی قربانی کے جس کا ذکر مذکور بالا دفعہ میں کیا گیا ہے وقوع میں آنے کے اندیشے کی فوری اطلاع قریب ترین تھانے کے عہدہ داروں کو دینے کا خاص طور پر ذمہ دار بذریعۂ ہذا گردانا جاتا ہے اور کوئی زمیندار یا دیگر قسم کے اشخاص جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور جن پر مذکورہ ذمہ داری عاید کی گئی ہے مذکورہ ضروری اطلاع دینے میں عمداً غفلت یا تاخیر کے مرتکب قرار پائیں تو وہ مجسٹریٹ کی عدالت سے مستوجب سزائے جرمانہ ہونگے اور اس رقم جرمانہ کی مقدار دو سو روپیوں سے زیادہ نہ ہوگی اور زر جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں انہیں سزائے قید دی جائیگی جس کی میعاد چھ مہینوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

(ب) یہ اطلاع ملتے ہی کہ جس قسم کی قربانی قانون ہذا میں ناجایز قرار دی گئی ہے اس کے واقع ہونے کا احتمال ہے خود داروغہ کوتوالی اس مقام پر پہنچ جائیگا یا اپنے محتصر یا جمعدار کو ہندو مذہب کے ایک ـــــ یا زیادہ رفقاروں کے ہمراہ بھیج دیگا، اور عہدہ داران کوتوالی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان اشخاص پر جو ادائے رسم کے لیے جمع ہوں یہ ظاہر کر دیں کہ وہ عمل خلاف قانون ہے اور انہیں منتشر ہونے پر مائل کرنے کی کوشش کریں نیز انہیں یہ سمجھائیں کہ اگر وہ اپنے عمل پر مصر ہونگے تو خود کو مرتکب جرم بنائینگے اور عدالت فوجداری سے مستوجب سزا قرار پائینگے۔ اگر جمع شدہ اشخاص ایسی تاکیدوں کے خلاف ادائے رسم کی کارروائی کریں تو عہدہ داران کوتوالی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ قربانی کو وقوع میں آنے سے روکنے کے لیے اپنے تمام اختیاری طریقے استعمال کریں اور ان سرگروہوں کو گرفتار کرلیں جو ادائے رسم کے لیے امداد یا ترغیب دے رہے تھے اور اگر عہدہ داران کوتوالی انہیں گرفتار نہ کرسکیں تو وہ ان کے نام اور پتے معلوم کرنے کی کوشش کریں اور فوراً مجسٹریٹ یا جائنٹ مجسٹریٹ کو تمام مفصل واقعات کی اطلاع دیں تاکہ وہ احکام صادر کرے۔

---

[1] منڈل: ایک دیہی عہدہ دار۔

۳۔ اگر کسی ایسی قربانی کی اطلاع جو بذریعۂ قانون ہذا ناجائز قرار دی گئی ہو فی الحقیقت اس کے وقوع میں آجانے کے بعد عہدہ داران کوتوالی کو ملے یا ان کے مقام واردات تک پہنچنے سے قبل وہ عمل میں آچکی ہو تو بھی اس صورت حال کی پوری تحقیقات وہ اسی طرح کرینگے جس طرح غیر فطری موت کے دیگر تمام مواقع پر کی جاتی ہے اور اس کی روداد برائے اطلاع وصدور حکم اس مجسٹریٹ کے یہاں روانہ کرینگے جس کے وہ ماتحت ہیں۔

۴۔ (ا) اس اطلاع کی وصول یابی پر جس کا روانہ کرنا سابقہ دفعہ کی شرائط کے تحت کوتوالی کے داروغوں پر لازم گردانا گیا ہے اس علاقے کا مجسٹریٹ یا جائنٹ مجسٹریٹ جہاں قربانی وقوع میں آئی ہو حالات متقدمہ کی تحقیقات کریگا اور قربانی کو بروئے عمل لانے والے اشخاص متعلقہ کو عدالت دورہ میں پیش کرنے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کریگا۔

(ب) بذریعۂ ہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ اس قانون کی اشاعت کے بعد وہ تمام اشخاص جو کسی ہندو بیوہ کو زندہ جلانے یا دفن کرنے کے قصد سے اس کی قربانی میں امداد یا ترغیب دینے کے مرتکب ہوں، خواہ وہ قربانی بیوہ کی رضا و رغبت سے ہو یا نہ ہو، قتل انسان مستلزم سزا کے مجرم قرار پائینگے اور حالات متقدمہ کی نوعیت اور مرتکب کی حد جرم کے لحاظ سے عدالت دورہ کی صوابدید پر سزائے جرمانہ یا قید یا دونوں سزاؤں کے مستوجب ہونگے، اور جواب دہی میں یہ عذر قابل سماعت نہ ہوگا کہ اشخاص مذکور نے مجرم یا مجرمہ سے بیوہ کو ہلاک کرنے میں امداد طلب کی تھی۔

(ج) اشخاص جو مذکورہ بالا جرم کی تحقیقات کے لیے عدالت دورہ کے سپرد کیے جائیں داخلہ ضمانت سے متعلق نافذ شدہ قواعد عام کے تحت ضمانت پر رہا ہو سکینگے یا نہیں یہ امر مجسٹریٹ کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔

۵۔ مزید برآں یہ اعلان ناگزیر خیال کیا جاتا ہے کہ قانون ہذا کے کسی حکم کا منشاء ایسا نہ لیا جائیگا جو نظامت عدالت کے ایسے اشخاص کے حق میں سزائے موت صادر کرنے میں مانع ہو جو کسی ہندو بیوہ کو زندہ جلانے یا دفن کرنے میں

جبر و تشدد یا اعانت کے مرتکب قرار پائیں جب کہ وہ بیوہ مدہوشی یا بدحواسی کی حالت میں مبتلا ہو یا اور کسی سبب سے اس کی رضامندی کا اظہار نہ ہو سکتا ہو اور جب کہ قیدی کے خلاف ثابت شدہ جرم کی سنگین نوعیت کے لحاظ سے عدالت مذکور اسے جایز طور پر مستحق رحم قرار دینے کی کوئی وجہ نہ پائے۔

ایک اور معاملہ جو بنٹنک کی توجہ کا طالب اور اس کی مداخلت کا خواہاں ہوا طریق ٹھگی تھا جس کی نوعیت بہ الفاظ سر جان کیئی ذیل میں بیان کی گئی ہے۔ کئی سال تک ہندوستان کے برطانوی حکمران اس طریقے سے بالکل ناواقف تھے جس کے ذریعے پیشہ ور اور آبائی قاتلوں کے گروہ سینکڑوں بے گناہ مسافروں کو وحشیانہ طور پر ہلاک کر ڈالتے تھے۔ اس قبیح طریقے کے انسداد کی دشواری اس شرانگیز ہنرمندی تک محدود نہ تھی جو ان بدمعاشوں کی طرف سے ظاہر ہوتی تھی۔ جن دیہاتوں میں ٹھگ[1] رہتے تھے وہاں کے عہدہ دار اکثر صورتوں میں ان کے دھندوں سے واقف ہوتے تھے اور خود اخفائے راز کی رشوتوں سے متمتع ہوتے تھے مقامی حاکموں اور صوبے کے عہدہ داروں کے لیے بھی اس مسئلے کا حل کرنا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ ٹھگ اپنی گرفتاری کے منصوبوں کی خبر سنتے ہی ملک کے کسی دوسرے ایسے حصے میں منتقل ہو جاتے تھے جہاں مقامی پولیس کا قابو نہ چلتا تھا۔ ایسی شہادت کا فراہم کرنا بھی جو کسی قانونی عدالت میں ثبوت جرم کے لیے کافی ہو ایک بہت دشوار کام تھا۔ لہذا بنٹنک نے بعض ضروری اصلاحیں نافذ کیں۔ اس نے ٹھگی اور ڈکیتی کا ایک مخصوص محکمہ قایم کیا جسے حدود مملکت کمپنی میں خاص اختیارات عطا کیے گئے۔ ایک قانون نافذ کیا گیا جس کی بنا پر ٹھگوں کو سرسری تحقیقات کے بعد سزا دی جا سکتی تھی۔ ان مزید اختیارات سے مسلح ہو کر کرنل سلیمن اور اس کے ماتحتوں نے بہت جلد اپنا کام شروع کر دیا اور ٹھگی کے فن کی اتنی ہی معلومات حاصل کر کے جتنی خود ٹھگوں کو تھی ان کو انھیں کی بازی میں شکست دے دی۔ حکومت کے لیے گرفتار شدہ ٹھگوں میں سے جن کے مفید ہونے کا بہت زیادہ امکان نظر آیا انھیں

---

[1] ۔ اس لفظ کے معنی ہیں "دغاباز"۔

معافی اور ملازمت دی گئی۔ ان "مجرمانِ اقراری" کی جیسا کہ انہیں کہا جاتا تھا امداد سے مختلف گروہوں کی جلد تلاش کی گئی اور انہیں کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔ یہ جیسا کہ سر جان کیئی نے لکھا ہے "ایک باوقعت کارنامہ اور عظیم الشان فتح تھی۔ چند انگریز عہدہ داروں نے اعلیٰ انتظامی حکام کے احکام پر عمل کر کے ہندوستان کو اس بھاری گنہگاری سے پاک کر دیا۔"

*ٹھگی کا پیشہ

ٹھگی کا پیشہ یہ تھا کہ دور دراز مقامات پر بزدلی کے ساتھ انجان مسافروں کا گلا گھونٹ دیا جاتا اور یہ عمل عموماً بدترین طریقے کے کذب و فریب کے حالات میں کیا جاتا تھا۔ ٹھگ جو ارتکاب جرم کے لیے باہم خوب متحد ہوتے انتہائی عقیدت کے ساتھ حلف اٹھا کر اپنے ظالمانہ انداز میں اُن تمام غافل راہ گیروں کو قتل کرتے ہوئے جنہیں وہ بہکا کر اپنے قابو میں لے آتے سارے ملک میں پھرتے رہتے تھے۔ کوئی چیز ان عیاروں اور عام مسافروں میں مابہ الامتیاز نہ تھی۔ ٹھگ کئی مختلف بھیس بدلتے اور انواع و اقسام کے رُوپ بھرتے تھے۔ وہ سڑک پر علیحدہ علیحدہ ہو جاتے، شہروں اور قصبوں کے اندر تین تین یا چار چار کی ٹولیوں میں گشت لگانے اور جب باہم ملتے تو ایک دوسرے کے نزدیک اجنبی نظر آتے تھے۔ شاید ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس گروہ میں سے کوئی ایک ذی رتبہ شخص کی حیثیت سے کسی ریاست میں سفر کرتا، اس کے ساتھ متعدد ملازمین ہوتے اور چند میانے یا ڈولیاں بھی ہمراہ ہوتیں جن میں اس کے خاندان کی مستورات ہونے کا ذکر کیا جاتا حالانکہ درحقیقت ان میں ان کے آلات پیشہ کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ سڑک پر یوں بھیس بدلے ہوئے جبکہ ان کے پاس کوئی چیز شبہ پیدا کرنے والی نہ ہوتی یہ سوداگرانِ اجل دوسرے راہ گیروں سے اس طرح مل جاتے گویا اتفاق سے ان کا ساتھ ہو گیا اور کسی جنگل کے قریب یا کسی سنسان مقام پر جو کسی موزوں ندی سے متصل ہو مناسب موقع

* Source.—"Administration of the east India Company, 1858".

J. W. Kaye.(Richard Bentley.)

پاتے ہی جان لیوا پٹکا یا سوتی کپڑا اپنے شکار کے گلے میں ڈالتے اور حکمت کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ ایک شخص مہلک کمند پھینکتا، دوسرا اس رسی یا کپڑے کا دوسرا سرا پکڑ کے اسے بے بس و بدنصیب راہ گیر کی گردن کے اطراف مضبوطی کے ساتھ کھینچتا اور دونوں مل کر اپنے خالی ہاتھوں سے اس کا سر سامنے کی جانب جھکاتے جاتے جبکہ ایک تیسرا شخص اس کے پاؤں پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیتا تھا۔ اس طرح کوئی مدافعت نہ ہوسکتی تھی اور عجلت کے ساتھ کام تمام کر دیا جاتا تھا۔ بعد ازاں نعش پر سے کپڑے اتار لیے جاتے، مال حاصل کر لیا جاتا اور بہت جلد نعش دفن کر دی جاتی تھی۔ مقدس کدال[۱] سے جو حیرت انگیز خاموشی کے ساتھ استعمال کی جاتی تدفین نعش کے لیے ایک قبر جلد کھود دی جاتی تھی۔ اگر کوئی اجنبی شخص ایسے وقت آ پہنچتا جب وہ اس طور پر مصروف کار ہوتے تو مقتول شخص کی نعش پر وہ شائستگی اور احترام کے ساتھ ایک کپڑا ڈال دیتے اور اس کے بازو و دو زانو بیٹھ کر اس طرح اپنی آوازیں بلند کرتے گویا وہ کسی عزیز ساتھی کی موت پر گریہ و زاری کر رہے ہیں۔

یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستانیوں کے کسی طبقے نے ان ٹھگوں کی نسبت اپنے مخصوص پیشے کو زیادہ شوق و رغبت کے ساتھ جاری رکھا ہوگا۔ وہ بچپن ہی سے خطرناک پیشے کے لیے تیار کر لیے جاتے تھے۔ ٹھگی ان کے لیے صرف ایک پیشہ ہی نہیں بلکہ مذہب بھی تھا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان کی کارگزاریوں پر ان کی دیوی اظہار خوشنودی کرتی تھی اور بعض مسلمہ علامتوں اور آوازوں کے ذریعے ان کے ساتھ سلسلۂ پیام جاری رکھتی تھی۔ دیوی کی رضا جوئی کے لیے وہ پر تکلف رسوم ادا کرتے اور پھر بیقراری کے ساتھ متوقع شگونوں کے منتظر رہتے تھے۔ اس سے زیادہ ظاہری مذہبی رسوم یا متوقع انکشافات کے باطنی

---

[۱] کدال جو خاص عقیدت سے ڈھالی جاتی اور پھر بعض معین رسوم کے ساتھ متبرک بنائی جاتی ٹھگوں کے نزدیک مخصوص طور پر قابل احترام سمجھی جاتی تھی۔ کسی اور آلے سے مردہ شخص کو دفن کرنا ممنوع تھا کیونکہ کدال ہی ان کے پیشے کی علامت تھی اور ان کا اعتقاد تھا کہ خود دیوی نے بطور میراث اسے چھوڑا ہے۔

مضبوط عقیدے کے ساتھ مسلمہ قدامت کے زمانہ ہائے بعید میں بھی کسی فال گو نے اپنے دیوتا سے کبھی مشورہ نہ کیا ہوگا۔

جب شگون خود ایک مرتبہ موافق نظر آ گئے اور دیوی نے مہر خوشنودی کا اظہار کر دیا تو قتل نہ صرف ایک مذہبی فرض بلکہ ایک خوشگوار کام قرار پاگیا۔ پھر مقتدر ٹھگ کو کبھی پشیمانی کا سامنا نہ ہوا۔ کرنل سلیمن نے ایک ایسے ٹھگ سے جو مجرم اقراری بن چکا تھا یہ سوال کیا کہ "کیا تم مقتول اشخاص کے ساتھ ہمدردی کبھی محسوس نہیں کرتے، ان کی حالت واجب الرحم یا قابل افسوس کبھی نہیں پاتے؟" جواب ملا کہ "کبھی نہیں"۔ اس انگریز عہدہ دار نے پھر پوچھا کہ "تم بوڑھوں اور چھوٹے بچوں کو کچھ نہ کچھ ترس کھائے بغیر کس طرح قتل کر سکتے ہو جب کہ وہ جان بوجھ کر دل جمعی سے تمہارے ساتھ بیٹھتے، بات چیت کرتے، اپنے خانگی معاملات، اپنی توقعات اور خطرات کو بیان کرتے ہیں نیز اپنے اہل و عیال کا ذکر کرتے ہیں جن سے ملنے کے لیے وہ کئی سال کی مفارقت، تکلیف اور مصیبت کے بعد جا رہے ہیں؟" جواب جو دیا گیا یہ تھا کہ "شگونوں کے نیک و موافق ہونے کے وقت سے ہم ان کو ایسے شکار سمجھتے ہیں جنہیں دیوی نے قتل کرنے کے لیے ہمارے ہاتھوں میں ڈال دیا ہے، ہم ان کو نیست و نابود کرنے کے لیے دیوی کے ہاتھوں میں محض آلے بن گئے ہیں، اگر ہم ان کو ہلاک نہ کریں تو دیوی ہم پر پھر کبھی مہربان نہ ہوگی اور ہم اور ہمارے خاندان مصیبت و مفلسی میں مبتلا ہو جائیں گے"۔

ٹھگوں کا طریق کار*

میں جیپوری سپاہی کے قتل کے بعد تقریباً چالیس یوم تک گھر ہی پر رہا اور پھر ٹھگوں کی ایک ٹولی کے ساتھ روانہ ہوا۔ ہم نے موسم برسات میں کوٹدہ سے مسافروں کی تلاش میں سفر شروع کیا، اور دو ٹھگ آدھار اور ساتار نے جن میں سے موخر الذکر با کمال عیار تھا ایک مسافر کا اعتماد حاصل کر لیا۔ یہ مسافر لاہور کا ایک راجپوت تھا جو اپنے وطن

* Source.—" Report of the Thug Gangs of Upper and Central India in the Year 1839," W. Sleeman. (G. H. Huliman,Calcutta.)

جا رہا تھا اور اسے اس کے ورغلانے والوں نے ایک بنیے کے مکان میں ٹھیرایا۔
انہوں نے رات کے وقت اسے جگایا اور وہاں سے اس کے ساتھ وہ
روانہ ہوئے مگر راستے میں اس نے دونوں ورغلانے والوں سے کہا کہ "تم
دونوں شخص قابل اعتماد نہیں، تم ٹھگوں کی مانند نظر آتے ہیں، میرے نزدیک مت آؤ۔"
یہ دیکھ کر کہ وہ بدگمان ہوگیا ہے میں نے اپنی مخفی ٹھگی زبان میں ساتھیوں سے کہا کہ
"الگ چلے جاؤ، وہ تم پر شبہ کرتا ہے۔" ساتھی پلٹ گئے۔ مسافر نے پھر مجھے
مخاطب کر کے اپنے شبہات بیان کیے اور یہ رائے ظاہر کی کہ ہم دونوں کو ملکر
چلنا چاہیے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور ان دو آدمیوں کے متعلق اپنے شبہات
بھی ظاہر کیے۔ پس ہم دونوں ملکر چلنے لگے اور میں نے جبکہ وہ چل رہا تھا موقع پاکر
اس کا گلا گھونٹ دیا۔ کدرمی ٹھگ مدد کے لیے قریب ہی تھا۔ ہم نے نعش
ایک ایسے مقام پر پھینک کر چھوڑ دی جہاں پانی نہ تھا تاکہ شغال اسے
کھا جائیں۔

اس کے بعد ہم دو ٹولیوں میں منقسم ہو گئے اور مدارا اور میں صرف دونوں
ایک طرف ہو گئے۔ ہم مسافروں کی تلاش میں چل نکلے اور اسی روز میں نے
ایک مسافر کو پھانسا جو نوجوان گھسیارا تھا۔ اتنے اس کے ٹٹو پر سے اتارنے
کے لیے مدارا نے بیماری کا بہانہ کر کے قے کے آثار ظاہر کیے۔ میں نے مسافر کو
اترنے اور مدارا کی طبیعت درست ہونے تک ٹھیر جانے کی ترغیب دی۔
وہ ٹٹو پر سے اتر کر نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی پشت کی جانب جا کر اس کا
گلا گھونٹ دیا اور مدارا نے اس کے پاؤں کھینچے۔ ہم نے ایک تلوار اس کی بغل
میں چبھو کر اس کی نعش ایک کنوئیں کے اندر پھینک دی جہاں سے اس کی اور
تقریباً پندرہ یا سولہ دوسرے اُن مسافروں کی ہڈیاں نکالی جا سکتی ہیں، جنہیں خود میں
نے اس کنوئیں میں پھینکا تھا۔ اس کے بعد ہم گھر واپس گئے کیونکہ ہم تقریباً ایک
مہینہ باہر رہ چکے تھے اور دو وارادات قتل سے مجھے اپنے حصے میں تقریباً پچاس
روپیے ملے۔ جو شخص گلا گھونٹتا ہے یا ورغلاتا ہے وہ ہمیشہ سب سے زیادہ حصہ
پاتا ہے۔

سفر کے بعد مجھے اپنے موضع کے زمیندار کو کوئی تحفہ دینا لازم تھا کیونکہ سارے موضع کو یہ معلوم تھا کہ میں ٹھگ ہوں اور اگر یہ تحفے نہ دیے جاتے تو زمیندار مجھے قید کرا دیتا۔ تمام ٹھگ اس طرح اپنے اپنے زمینداروں کی رضاجوئی کرتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی سے قتل کی مذکورہ وارداتوں کا یا اپنے ٹھگ ہونے کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ اس قسم کی باتیں ہم اپنی بیویوں سے اس خوف کی بنا پر نہیں کہتے کہ کہیں یہ راز وہ دوسروں پر فاش نہ کر دیں۔

*مقصد یاب ٹھگوں کا ایک گروہ

جناب من۔ آپ کو مخاطب کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ ٹھگوں کی ان مختلف بستیوں کا مختصر حال پیش کروں جنھوں نے ضلع کرپا و چیتور اور شمالی سرکار و اوڈیسہ کے باشندوں کو تنگ کر رکھا ہے کیونکہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عوام اس خطرناک طریقے کی مختلف صورتوں سے نیز ان کارروائیوں سے واقف کرائے جائیں جو اس کے کامل انسداد کے لیے جنوبی ہند میں کی جاری ہیں۔

۱۸۲۳ء سے ۱۸۳۶ء تک ایسے اشخاص کی ایک بڑی جماعت جو ارکاٹی ٹھگ کہلاتے ہیں چار مشہور سرداروں شیخ احمد، ایمن صاحب، ہونور صاحب اور حیدر خاں کے زیر انتظام ضلع مسلی پٹم کے موضعوں میں حیدر آباد کے سرحدی مقام مونگل سے ایلور کی شمالی جانب ایک منزل کی مسافت کے موضع تک قایم ہو گئی تھی۔ ان ٹھگوں میں سے اکثر خصوصاً سردار جفاکش کاشتکار ہونے کی بنا پر اپنے موضعوں میں نیک نام تھے۔ تیرہ سال کی مدت تک ان گروہوں نے اپنے موضعوں کے اطراف تین سو میل کے اندر ملک کی تمام بڑی بڑی سڑکوں پر بلے روک ٹوک قتل و غارت کا کام جاری رکھا۔ انہوں نے اپنی کئی مہموں میں کثیر رقمیں حاصل کیں۔ ضلع باندہ میں مقیم ہونے کے بعد ان کا سب سے پہلا مال غنیمت چودہ ہزار روپیوں کی

* Source.— Letter written by Capt. Vallancey to the United Service Gazette.

ایک رقم تھی جو پانچ اشخاص کے قتل سے حاصل کی گئی اور یہ مال بندر کے ایک تاجر کا تھا جو اسے حیدرآباد روانہ کر رہا تھا۔ اس واقعے کے تقریباً چودہ سال بعد جب وہ گوٹی کی جانب اپنی مہم پر تھے تو انہوں نے چار اشخاص کو قتل کر کے بطور غنیمت چھ ہزار روپیوں کی ایک رقم حاصل کی جو کرپا کے ایک تاجر کی تھی۔ پھر اسی مقام کے قریب ایک ہی سال بعد ان کی مٹ بھیڑ پانچ خزانہ برداروں سے ہوئی جن کے قتل سے انہیں آٹھ ہزار روپیوں کی اور ایک رقم ملی۔ اس کے دس سال بعد انہوں نے ایک مغل سوداگر اسپ کو جس کے ہمراہ چار اشخاص تھے اچانک آگھیرا اور سب کو قتل کر کے تین ہزار روپیوں کی قیمت کا مال غنیمت حاصل کیا۔

یہ ان واردات قتل کی ایک چھوٹی تعداد ہے جن کا ارتکاب ان مردودوں نے کیا ہے۔ قتل کی جن واردانوں کا علم مجھے ہوا ہے ان کی تفصیل سے جو میرے یہاں موجود ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۳ء سے ان گروہوں کی گرفتاری کے وقت تک وہ ساٹھ واردات قتل کے مرتکب ہوئے تھے جن سے ایک سو ستر اشخاص ان کے شکار بنے اور پچاس ہزار روپیوں کی قیمت کا مال ان کے ہاتھ آیا۔ یہ ٹھگ شاید آج تک بے روک ٹوک اپنی کارستانیاں جاری رکھتے اگر دکنی ٹھگوں میں کا ایک مجرم اقراری ان کے وجود اور مقام سکونت کا پتہ نہ دیتا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد ان کی تقریباً تمام آبادی جو ساٹھ اشخاص پر مشتمل تھی گرفتار کر لی گئی۔

ان گروہوں کی گرفتاری سے ضلع ویزیگاپٹم میں مسلمان ٹھگوں کی ایک بستی کے وجود کا علم حاصل ہوا۔ ان مسلمان ٹھگوں سے ضلع باندہ کے ٹھگ سڑکوں پر دو تین مرتبہ ملے تھے اور اس طرح انہیں واقفیت ہو گئی تھی۔ صرف انھیں کو مسلمان ٹھگوں کے وجود کا علم تھا۔ اس امر کی معلومات کہ یہ بستی ہندوستان کے اس حصے میں کس طرح قایم ہوئی تھی ارکاٹی ٹھگ بہم نہ پہنچا سکے، لیکن جب میں نے ان سب کو محفوظ طور پر حراست میں لے لیا تو ان کے تاریخی حالات سے میں نے جملہ واقفیت حاصل کر لی۔ تقریباً بیس سال قبل ان کی تعداد ساٹھ اور ستر کے درمیان تھی لیکن ان کی گرفتاری کے وقت وہ گھٹ کر بارہ رہ گئی تھی۔ ان میں سے جو ضعیف ترین تھے ان کے اجداد دیگر کئی اشخاص کے ساتھ ہندوستان سے

آئے تھے، وہ ابتدا میں زمین سرداروں کے تحت تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اجنبیوں کو اپنے گروہ میں کبھی داخل نہیں کیا۔ گزشتہ چند سال سے ان میں کے اکثر نوجوان اپنے پیشے سے واقف ہوتے کے بعد سپاہی بن گئے اور اب مختلف پلٹنوں میں مامور ہیں جہاں میں نے معلوم کیا ہے ان کا چلن اچھا ہے۔ اس برادری کا ایک مستند خاتق جسے حال میں سولی پر چڑھا دیا گیا سابق میں ایک سپاہی تھا جو فوجی قواعد کے دو وقت کی رخصت لے لیتا، اپنے ساتھیوں سے جا ملتا، چند واردات قتل کا مرتکب ہوتا اور پھر واپس آجاتا تھا۔ ان ٹھگوں کو کسی بڑی لوٹ کھسوٹ کا مال کبھی نہ ملا تھا۔ وہ نہایت سنگ دل قاتل تھے جو صنف یا عمر کا لحاظ کرتے تھے نہ اُن فرقوں کے لوگوں کا کوئی احترام کرتے تھے جن کا قتل دوسرے ٹھگ ایک سنگین جرم سمجھتے تھے۔ وہ شاذ ہی اپنے کو شگونوں کے جنجال میں ڈالتے تھے، ان کے نزدیک کدال کوئی باوقعت چیز نہ تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اِرکانی ٹھگ ان کو ٹھگوں کا ایک منحوس گروہ خیال کرتے تھے۔ ان کی واردات قتل کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ۱۸۲۵ء سے ۱۸۳۵ء میں ان کی گرفتاری کے وقت تک وہ چالیس واردات قتل کے مرتکب ہوئے تھے جن میں اسّی اشخاص شامل تھے۔

اس حصے میں جن اصلاحات کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ولیم بنٹنک کے نام سے منسوب ہیں۔ جیسا کہ اکثر مصلحین کی قسمت میں ہوتا ہے اسے بھی بہت زیادہ مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا جو خاص کر اس کی ہی قوم کے افراد کی جانب سے عمل میں آئی۔ اس کی نیک نامی پر ایک نہایت سخت حملہ مسٹر تھارنٹن نے کیا جس نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "لارڈ ولیم بنٹنک کا نظم و نسق کھوکھلا سا نظر آئیگا" اور اس نے ہندوستان کے لیے یا خود اپنی نیک نامی کے لیے اتنا کام بھی نہ کیا جتنا اُن دوسرے اشخاص نے سر جارج بارلو کے واحد استثنا کے سوا انجام دیا جو انیسویں صدی کے آغاز سے اسی منصب پر مامور رہ چکے ہیں۔" اس کی سب سے

۱۔ گلا گھونٹنے والا۔

۲۔ "تاریخ برطانوی ہند" مصنفہ ای۔ تھارنٹن (شاہی دفتر محافظ خانہ)۔

بڑی کمزوری نخوت تھی۔ وہ شہرت کے بت کا پرستار تھا اور اس کے انوار اس نے بلا مزاحمت اس شے کی قربانی سے حاصل کرنے کی کوشش کی جو روح زمانہ کہلاتی ہے۔"
لیکن اس قسم کی تہمتوں کے باوجود ولیم بنٹنک کے نام کی عزت آج بھی ہندوستان کے تمام طبقے کرتے ہیں۔ اس کے کام کی قدر و قیمت زمانے نے ثابت کر دی ہے۔ مسٹر دت نے اس جلیل القدر حکمران کی یادگاریں حسب ذیل فیاضانہ خراج تحسین ادا کیا ہے:۔

"۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے ہندوستان کو خیرباد کہا۔ اس کی ہفت سالہ حکومت، امن، تخفیف اور اصلاح کا ایک دور تھی۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں امن قائم کر دیا اور ہندوستانی طاقتوں کے ساتھ اپنا زمانہ صلح و آشتی سے بسر کیا۔ اس نے سرکاری قرضے کی رقم گھٹا دی، سالانہ خرچ میں کمی کر دی اور بچت دکھائی۔ اس نے شمالی ہند میں اس اصلاح یافتہ بندوبست مالگزاری کا آغاز کیا جس سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس نے ہندوستان کے باشندوں کو مالگزاری اور عدالت کے محکموں میں اعلیٰ خدمات پر مامور کیا۔ اس نے ستی کی رسم موقوف کر دی اور ٹھگی کے جرم کا انسداد کیا۔ اس نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو ترقی دی اور اس اصول پر بدرجہ غایت عمل پیرا رہنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کا نظم و نسق اولاً رعایائے ملک کے مفاد کے لیے ہے۔ اس کے جانشین سر چارلس مٹکاف نے جو اس کے طریق روایات کا تربیت یافتہ تھا اسی نہج پر کام کیا اور انھیں اصول پر عمل کیا۔ اس نے ہندوستان کے مطابع کو آزادی دے دی اور ایک قابل و خیرخواہ حاکم کی حیثیت سے اپنے لیے اعلیٰ شہرت حاصل کی۔"

لیکن لارڈ ولیم بنٹنک کو اپنے سیاسی مسلک کے برحق ہونے کے متعلق تاریخ کے فیصلے کا انتظار نہ کرنا پڑا۔ ہندوستان سے اس کی روانگی کے قبل ہی بہت سے انگریز اور تقریباً تمام ہندوستانی اس کے کاموں کی حقیقی قدر و منزلت سمجھنے لگے تھے۔ اس کی یادگار میں بمقام کلکتہ ایک مجسمہ نصب کیا گیا جس کا کتابہ اس کے دوست و رفیق میکالے نے یوں لکھا:۔۔۔

یہ یادگار

ولیم کیونڈش بنٹنک

جس نے نہایت دانشمندی، باقاعدگی اور خیر سگالی کے ساتھ سات سال تک ہندوستان پر حکومت کی، جس نے ایک سلطنت عظیم پر حکمران بنائے جانے کے باوجود ایک عام شخص کی طرح سادگی اور میانہ روی سے کبھی کنارہ کشی نہیں کی، جس نے مشرقی مطلق العنانی میں برطانوی آزادی کی روح پھونک دی، جس نے یہ امر کبھی فراموش نہیں کیا کہ حکومت کا مدعا محکوم کی خوشحالی ہے، جس نے ظالمانہ رسوم موقوف کر دیں، جس نے توہین آمیز امتیازات مٹا دیے، جس نے رائے عامہ کے اظہار کی آزادی بخشی، جس کو ہمیشہ یہ دھن لگی رہی کہ جو قوم اس کے سپرد کی گئی ہے اس کے ذہنی و اخلاقی معیار کو بلند کرے۔

یہ یادگار

اُن اشخاص نے قایم کی ہے

جو قومیت، رسم و رواج، زبان اور مذہب میں مختلف ہونے کے باوجود یکساں احترام و احسان مندی کے ساتھ اس کی عاقلانہ، مصلحانہ اور پدرانہ حکومت کی یاد اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔

چھٹا باب

نظامِ تعلیم کی ترقی

۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی لڑائیوں کے اختتام تک برطانوی حکومت ہند کوئی نظام تعلیم قایم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی نہ اس پر غور کرنے کا اُسے موقع ملا تھا۔ اب تک ملک کے اندر اس کی ساری قوتیں خاص کر اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنے میں مصروف تھیں۔ صرف چند عارضی کوششیں باشندگان ملک کی تعلیم میں آسانیاں پیدا کرنے کی گئی تھیں۔ ۱۷۸۱ء میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کلکتہ میں ایک مدرسہ قایم ہوا تھا اور ۱۷۹۲ء میں جوناتھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ ان درس گاہوں کا خاص مقصد ہندوستانیوں کی ایک تعداد کو ایسی تعلیم دینا تھا جس کے ذریعے اُسے دھرم شاستر اور شرع اسلام سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ وہ انتظام معدلت کی ضروریات پوری کر سکے اور اسی لیے نصاب تعلیم بالکل مشرقی تھا۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں چند حکمران رعایا کو جو ان کے زیر نگرانی تھی تعلیم دینے کا فرض محسوس کرنے لگے۔ ان حکمرانوں میں لارڈ منٹو بھی شامل تھا جس نے ۱۸۱۱ء کی ایک تحریر میں باشندگان ہند سے متعلق علم کی زوال پذیر حالت پر

اظہار تاسف کیا۔ اس کے دو سال بعد جب کمپنی کے منشور کی تجدید ہوئی تو ایک لاکھ روپیوں کی رقم (۱۰۰۰۰ پونڈ) "ادبیات کے احیا و ارتقا، تعلیم یافتہ باشندگان ہند کی حوصلہ افزائی اور برطانوی مملکت کے باشندوں میں مختلف علوم کی ترویج و ترقی کے لیے" مختص کی گئی۔[1] لیکن اس خصوص میں جب کوئی کارروائی نہ ہوئی تو ۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل باجلاس کونسل نے یہ حکم دیا کہ "تعلیمات عامہ کی ایک مجلس اس غرض سے مقرر کی جائے کہ رعایا کی تعلیم اور سرکاری تعلیم گاہوں کی حالت، کا جو اس کی ترقی کے لیے قایم کی گئی ہوں اندازہ ہو سکے نیز غور و خوض کے بعد حکومت کے سامنے وقتاً فوقتاً ایسی تجاویز پیش کی جا سکیں جنہیں باشندگان ملک کی بہتر تعلیم، ان میں مفید معلومات کی اشاعت اور ان کی اخلاقی روش کی اصلاح کے نظر کرتے اختیار کرنا مناسب معلوم ہو"۔[2] اس حکم کے نتیجے کے طور پر بڑے بڑے آباد مقامات پر مجالس قایم کی گئیں جن کا کام اسکولوں اور کالجوں کی قدر افزائی و نگرانی کی بجائے بظاہر سنسکرت اور عربی کتابوں کا شایع کرنا تھا۔ اس طریق کار کے اختیار کرنے کی وجہ مسٹر ٹریولیان نے بیان کی ہے جس کا خیال یہ ہے کہ لارڈ ولزلی کے کالج واقع فورٹ ولیم کے اثر سے جو کمپنی کے محرروں کی تعلیم کے لیے قایم ہوا تھا، واحد معیار لیاقت سیول سروس کے ارکان کے نزدیک مشرقی علوم کا جاننا قرار پا گیا تھا۔ لہذا کلکتہ کے تعلیم یافتہ حلقے نے جس کا کارنامۂ حیات بڑی حد تک ایشیاٹک سوسائٹی پر مرکوز تھا جو سر ولیم جونس نے ۱۷۸۴ء میں قایم کی تھی اس زمانے کے تعلیمی انتظام پر اپنا اثر غالب رکھا اور مغربی علوم کی بہ نسبت مشرقی علوم کی ترقی پر زیادہ زور دیا۔

تب بعض واقعات ایسے پیش آئے جن کی بنا پر برطانوی حکومت ہند کو اپنے تعلیمی انتظام پر مکرر غور کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ہوا یہ کہ بعض عیسائی مبلغین احاطۂ مدراس میں اور ان کی تعداد سے کچھ کم مبلغین بنگال اور دیگر مقامات پر

---

[1] "باشندگان ہند کی تعلیم" مصنفہ سی۔ ای۔ ٹریولیان (لانگ منس)۔

[2] "باشندگان ہند کی تعلیم"، مصنفہ سی۔ ای۔ ٹریولیان (لانگ منس)۔

روشناس کر دیا۔ شاید ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر ڈاکٹر ٹامس کا قدیم شاگرد الگزینڈر ڈف تھا جو ۱۸۳۰ء میں کلکتہ پہنچا۔ اس نے تبلیغی کام کے متعلق اپنے پیشرووں سے جو لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے زیادہ تر اپنے وعظ و تلقین پر اعتماد کرتے تھے ایک بالکل مختلف طریق عمل اختیار کرنے کا فوراً فیصلہ کیا۔ اس کا مقصد جس میں اُسے بمبئی کے ڈاکٹر ولسن کی مدد بھی ملی یہ تھا کہ "مناسب تربیت کے ذریعے انسانی دماغ کی مختلف قوتوں اور قابلیتوں کو بیدار کرنے ترقی و تقویت دینے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے اور اس غرض کے لیے انگریزی زبان کو موثر ترین آلے کے طور پر استعمال کیا جائے نیز اس ساری تربیت پر جو اس طرح دی جائے سچے مذہب کا گہرا رنگ چڑھایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ہر جماعت کے وقت کا کچھ حصہ انجیل کی باقاعدہ تعلیم کے لیے وقف کیا جائے۔" اس نے رام موہن رائے کی مدد سے ایک عمارت کرائے پر لی اور اپنے مدرسے کا افتتاح کیا۔ ڈف نے ملکی زبانوں کے ساتھ کسی طور پر بے اعتنائی نہیں کی کیونکہ اس کے مدرسے کے کسی لڑکے کو اس وقت تک انگریزی شروع کرنے کی اجازت نہ تھی جب تک وہ اپنی مادری زبان کو آسانی سے نہ پڑھ سکے۔ پس کامیابی فی الفور نظر آئی اور ڈف نے اپنے تجربے سے ذریعۂ تعلیم کے طور پر انگریزی زبان کے استعمال کی مصلحت اور امکان دونوں کو ثابت کر دکھایا۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے ڈف کے عمدہ کام کی تصدیق الفاظ ذیل میں کی ہے:

میں نے ہمیشہ ہندو کالج کو مفید اغراض کا ایک عظیم ترین ادارہ خیال کیا ہے جو ہندوستان میں ہماری حکومت شروع ہونے کے بعد قائم کیا گیا، لیکن وہ ادارہ بلحاظ افادیت آپ کی تعلیم گاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا جہاں ہر قسم کی ترقی یافتہ تعلیم کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ میں اب اس خط کو اس سے زیادہ کھینچ کر طول نہیں دوں گا کہ مجھے آپ کی بجائے کسی اور شخص کی نیک رائے سے زیادہ طمانیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

ڈف، اڈنبرا میں ۱۸۳۵ء کی مجلس عام کے انعقاد کے وقت موجود تھا

جب کہ ہندوستانی مبلغین کی حمایت کرنے کا موقع اسے اپنی اس تقریر میں حاصل ہوا تھا جو اُس وقت فاکس اور پٹ کی بہترین تقریروں کی ہم پایہ سمجھی گئی تھی۔ اس تقریر کا بہت زبردست اثر ہوا تھا۔ اس نے نہ صرف اس چیز کی قدر و قیمت ثابت کر دکھائی جسے مبلغین کا "نظام تعلیم" کہا جا سکتا ہے بلکہ ایک ایسی قوم اور مذہب دونوں کی تائید بھی حاصل کر لی جنہوں نے ہندوستان کی تعلیمی ترقی میں ایک بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

ہندوستانیوں میں بھی ترقی پسند مفکرین کا ایک مختصر طبقہ ایسا تھا جس نے یہ پُرزور خواہش ظاہر کی تھی کہ اس کے ہم وطنوں کو انگریزی تعلیم و تربیت کے فواید سے بہرہ یاب ہونا چاہیے۔ ان مفکرین کی رائے کا بہترین اندازہ حسب ذیل خط سے کیا جا سکتا ہے جو راجہ رام موہن رائے نے لارڈ ایمہرسٹ کو لکھا تھا۔

مغربی علوم کا نفاذ*

میرے معزز لارڈ

اگرچہ ہندوستان کے باشندے حکومت پر اس کی مرضی کے خلاف ایسے خیالات کا اظہار کرنے میں جو کسی سرکاری تجویز کے متعلق وہ رکھتے ہوں عجز و نیاز کے ساتھ تامل کرتے ہیں تاہم بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جہاں یہ جذبۂ احترام خاموشی کے باعث قابل گرفت حد تک پہنچ جاتا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کو جو کئی ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے ایسے باشندگان ملک پر حکومت کرنے آتے ہیں جن کی زبان، ادب، طور و طریق، رسم و رواج اور خیالات ان کے لیے بالکل جدید اور غیر مانوس ہوتے ہیں یہاں کے حقیقی حالات سے اس قدر گہری واقفیت بآسانی نہیں ہو سکتی جس قدر خود اس ملک کے باشندوں کو حاصل ہے۔ پس ہم اپنے فرض کو بالکل ترک کرنے کے خطاوار قرار پائینگے اور اپنی بے حسی کے باعث اپنے حکمرانوں کے سامنے اعتراض کی معقول وجہ پیش کرینگے اگر ہم اس موجودہ اہم موقع پر انہیں ایسی صحیح معلومات جس کی بدولت وہ بعد

*Source.—Letter written by Raja Ram Mohan Roy to Lord Amherst.

غوروخوض ان تجاویز کو اختیار کرسکیں جو ملک کے لیے مفید متصور ہوں
بہم نہ پہنچائیں اور اس طرح اپنے مقامی علم وتجربے سے ملک کی اصلاح و ترقی
کے متعلق ان کے ظاہر کردہ نیک منصوبوں کی تائید نہ کریں۔
کلکتہ میں ایک جدید سنسکرت اسکول کا قیام حکومت کی اس قابل ستائش
خواہش کا مظہر ہے جو ہندوستان کے باشندوں کی تعلیمی ترقی سے متعلق ہے اور
یہ ایک ایسی نعمت ہے جس کے لیے انہیں ہمیشہ شکر گزار رہنا چاہیے۔ جب اس
تعلیم گاہ کی تحریک ہوئی تھی تو ہم نے یہ سمجھا تھا کہ حکومت انگلستان نے ایک
کثیر رقم کی منظوری دی ہے تاکہ اس کی ہندوستانی رعایا کی تعلیم پر وہ ہر سال صرف
کی جائے۔ ہمارے دل ان حقیقی توقعات سے لبریز تھے کہ یہ رقم ایسے قابل و ماہر
تعلیم یورپی اشخاص کو مامور کرنے میں صرف کی جائیگی جو ہندوستان کے باشندوں
کو ریاضی، فلسفۂ طبعی، کیمیا، علم تشریح الاعضا اور دیگر مفید علوم سکھائینگے جن میں
یورپ کی اقوام نے اس درجہ کمال حاصل کیا ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے حصوں کے
باشندوں سے بالا و برتر ہوگئی ہیں۔
جب ہم خوش آیند توقعات کے ساتھ اس نور علم کے منتظر تھے جسے
ترقی پذیر قوم میں پھیلانے کا وعدہ کیا گیا تھا تو ہمارے دل خوشی اور شکر گزاری کے
مخلوط جذبات سے پُر تھے۔ ہم پہلے ہی رب العالمین کا شکر کر چکے ہیں جس نے مغرب
کی نہایت فیاض اور روشن خیال اقوام میں یہ عظیم ولولہ پیدا کر دیا کہ وہ ایشیا میں یورپ جدید
کے علوم وفنون کی بنا ڈالیں۔
ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت ہند پنڈتوں کے زیر نگرانی ایک سنسکرت اسکول
قایم کر رہی ہے جس میں ایسی تعلیم دی جائے گی جو پہلے ہی سے ہندوستان میں رائج
ہے۔ اس تعلیم گاہ سے (جو بلحاظ نوعیت ان تعلیم گاہوں کی سی ہے جن کا وجود یورپ
میں لارڈ بیکن کے زمانے سے قبل تھا) صرف یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ نوجوانوں
کے دماغوں کو قواعد زبان کے نکات اور مابعد الطبیعیات کے امتیازات سے
بھر دیگی جو سوسائٹی یا صاحب علم کے لیے عملی طور پر مفید نہیں ہوسکتے۔ وہاں طالب علم
وہی چیز حاصل کرینگے جو دو ہزار برس پہلے معلوم تھی اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی لغو

اور پوچ باریکیوں سے بھی واقف ہو گئے جو مفکرین نے بعد کو پیدا کی ہیں اور ہندوستان کے تمام حصوں میں پہلے ہی سے سکھائی جا رہی ہیں۔

سنسکرت زبان جو اس قدر مشکل ہے کہ اس کے حصول کے لیے تقریباً ساری عمر درکار ہے صدیوں سے اشاعت علم میں افسوس ناک طور پر مزاحم رہنے کے لیے مشہور چلی آئی ہے اور جو ذخیرۂ علم اس غیر ممکن الدخل نقاب میں مستور ہے وہ اس کے حصول کی محنت کا کافی معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ ضروری سمجھا جائے کہ اس زبان کو اس قیمتی معلومات کی غرض سے جو اس میں شامل ہے زندہ رکھا جائے تو یہ امر ایک جدید سنسکرت کالج قایم کرنے کی بجائے اور طور پر بہت زیادہ آسانی سے انجام پا سکتا ہے کیونکہ ملک کے مختلف حصوں میں سنسکرت کے متعدد معلم ہمیشہ پائے گئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جو اس زبان اور دیگر ایسے ادبی مضامین کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں جنھیں جدید تعلیم گاہ کا مقصد قرار دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا ان علوم کی زیادہ محنت کش تعلیم کو بشرطیکہ مناسب سمجھا جائے موثر طور پر اس طرح ترقی دی جا سکتی ہے کہ ان ممتاز ترین معلموں کے لیے انعامات مقرر کرنے کے علاوہ بھتے بھی منظور کیے جائیں جو بطور خود پہلے ہی سے علوم مذکور سکھا رہے ہیں تاکہ اس قسم کے معاوضوں سے انہیں عظیم تر مساعی کی ترغیب ہو۔

ان خیالات کی بنا پر یہ پیش نظر رکھتے ہوئے کہ جو رقم ہندوستانی باشندوں کی تعلیم کے لیے مختص کر دی گئی تھی اس کے متعلق حکومت ہند کا منشا یہ تھا کہ وہ اس کی ہندوستانی رعایا کی ترقی میں صرف ہو میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر موجودہ اختیار کردہ تجویز پر عمل کیا گیا تو اس سے مجوزہ مقصد میں سخت ناکامی ہو گی کیونکہ نوجوانوں کو قواعد سنسکرت کے نکات سیکھنے میں بارہ سال صرف کر دینے کی ترغیب دینے سے کسی ترقی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اور نہ کوئی مزید ترقی حسب ذیل قیاس آرائیوں سے ہو سکتی ہے جو ویدانت کے ظاہر کردہ مضامین پر مبنی ہیں کہ روح کس طرح الوہیت میں جذب ہو جاتی ہے؟ ذات الٰہی سے وہ کیا تعلق رکھتی ہے؟ اور نہ نوجوان ویدانت کے ان نظریوں سے سوسائٹی کے بہتر افراد بننے کے قابل ہو سکینگے جو نہیں

یہ تلقین کرتے ہیں کہ تمام مرئی اشیاء کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے اور چونکہ ماں باپ وغیرہ کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتے اس لیے وہ کسی حقیقی محبت کے مستحق نہیں ہیں۔ پس جس قدر جلد ہم ان سے چھٹکارا حاصل کر کے دنیا کا مقابلہ کریں اسی قدر بہتر ہے۔

دنیائے شاستر کے طالب علم کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے دماغ نے ترقی کی ہے اگر اس نے یہ معلوم کر لیا ہو کہ دنیا کی اشیا کتنے خیالی درجوں میں تقسیم کی گئی ہیں اور کیا قیاسی تعلق روح کا جسم سے، جسم کا روح سے یا روح کا کان وغیرہ سے ہے۔

بایں خیال کہ معزز لارڈ کو ایسے موہوم علم کی جس کی خصوصیت اوپر بیان کی گئی ہے ترغیب کے فائدے کا صحیح اندازہ ہو سکے میں معزز لارڈ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ لارڈ بیکن کے زمانے سے پیشتر یورپ کے علم و ادب کی جو حالت تھی اس کا مقابلہ اس کی تحریروں کے بعد کی ترقی علم سے کرنے پر توجہ مبذول کی جائے۔

اگر برطانوی قوم کو حقیقی علم سے محروم رکھنے کا منشا ہوتا تو بیکن کے فلسفہ کو علمائے قدیم کے اس طریق تعلیم کو ہٹا کر جگہ نہ دی جاتی جو لاعلمی کو برقرار رکھنے کا ایک طریق آزمائش متصور تھا۔ اسی طرح سنسکرت کا نظام تعلیم اس ملک کو ظلمت میں رکھنے کا بہترین ذریعہ ہوتا اگر اسی قسم کا طرز عمل برطانوی جماعت مقننہ اختیار کرتی۔ لیکن حکومت کا مقصد ہندوستانی آبادی کی ترقی ہے اس لیے وہ زیادہ فیاضانہ اور اصلاح یافتہ نظام تعلیم کو تقویت دیگی جس میں ریاضی، فلسفہ طبعی، کیمیا، علم تشریح الاعضا اور دیگر مفید علوم شامل ہونگے اور یہ تعلیم مجوزہ رقم سے اس طرح ہو سکتی ہے کہ یورپ کے تعلیم یافتہ چند قابل و فاضل اشخاص کو مامور کیا جائے اور ایک ایسا کالج قایم کیا جائے جو ضروری کتب، آلات اور دیگر سامان سے آراستہ ہو۔

معزز لارڈ کی خدمت میں یہ معروضہ پیش کرتے ہوئے میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے ایک ایسا سنجیدہ فرض ادا کیا ہے جو میرے ہم وطنوں کی جانب سے

نیز اس روشن خیال فرمانروا اور جماعت مقننہ کی جانب سے مجھ پر عاید ہوتا ہے جنہوں نے اپنا سایۂ عاطفت اس دور و دراز سرزمین تک اس تقاضائے خواہش کی بنا پر پھیلا رکھا ہے کہ ہندوستانی باشندوں کی اصلاح کی جائے اور اسی لیے عاجزانہ طور پر یہ توقع رکھتا ہوں کہ میں نے معزز لارڈ کی خدمت میں اپنے خیالات کا اظہار جس آزادی کے ساتھ کیا ہے اسے معاف فرمایا جائے گا۔

زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خود برطانوی حکمرانوں نے وہ روش اختیار کرلی جو عیسائی مبلغین اور ہندوستانی مصلحین نے پیش کی تھی۔ الفنسٹن اور منرو دونوں نے ہندوستانی طالب علموں کے لیے تعلیمی سہولتوں میں اضافہ کرنے کے متعلق گہری دلچسپی لی۔ الفنسٹن نے معلوم کرلیا کہ ان عظیم معاشری قبائح کا جن میں ملک مبتلا ہوگیا تھا صرف ایک علاج ہے اور وہ تعلیم ہی ہے ۱۸۱۵ء میں بمقام بمبئی دیسی درسی کتب و مدارس کی ایک انجمن قائم کی گئی تھی جس کی کارروائیوں کی مثل اب تک الفنسٹن کالج میں موجود ہے گو دیمک کی غارت گری سے وہ بہت خستہ حالت میں ہے۔ اس انجمن کے ارکان نے اُس رقم کا انتظام کیا تھا جو مشرقی علوم کی کتب کے اضافے کے لیے منظور ہوئی تھی۔ ۱۸۲۴ء میں الفنسٹن کی خدمت میں ایک وفد پہنچا جس نے یہ درخواست کی کہ رقم مذکور کا کچھ حصہ ایک مدرسے کے قیام کے لیے وقف کیا جائے۔ گورنر کے جواب کا ایک حصہ جو وسعت نظر اور مقامی حالات کی معلومات کے لحاظ کرتے میکالے کے جواب سے بہتر معلوم ہوتا ہے ذیل کے اقتباس میں درج کیا جاتا ہے:*

بمبئی میں تعلیم

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حکومت کی امداد ناگزیر ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح بہترین طور پر دی جاسکتی ہے؟ اس کے دو طریقے ہیں جو غور و خوض کے لیے پیش نظر ہوتے ہیں۔ حکومت ہندوستانیوں کی تعلیم پورے طور پر اپنے ذمے لے سکتی ہے یا اُس سوسائٹی کے ذرایع میں

*Source.—"Official Writings of Mountstuart Elphinstone." Edited by G. W. Forrest. (Bentley.)

اضافہ کر سکتی اور اس کی مساعی میں تقویت دے سکتی ہے جو پہلے ہی سے اس غرض کے لیے قایم ہے۔ ان دونوں طریق ہائے کار کے انضمام سے غالباً بہترین نتیجہ نکلے گا۔ بہت سی تجاویز جو اشاعت تعلیم کے لیے ضروری ہوں لازماً افراد کی دلی امنگوں پر منحصر ہوں گی اور حکومت کے احکام سے وہ متاثر نہیں ہو سکتیں۔ پس ان تجاویز تعلیم کی ترقی کا کام سوسائٹی کے سپرد ہونا چاہیے، لیکن بعض تجاویز ایسی بھی ہوں گی جن کے لیے باقاعدہ انتظام کی نیز اس خوش اسلوبی اور استقامت کے جس کے وجود کی توقع کسی ایسے منصوبے سے ہو سکتی ہو جس کی کامیابی کا انحصار شخصی کردار پر ہوتا ہے اعلیٰ تر درجے کی ضرورت ہوگی۔ لہذا اس آخری شعبے کا کام حکومت کو اپنے ذمے لینا چاہیے۔

ہندوستانیوں میں اشاعت علم کے لیے ذیل کی اہم تدابیر ناگزیر ہیں:

اول: ہندوستانی مدارس کے طریق تعلیم کی اصلاح کی جائے اور مدارس کی تعداد بڑھائی جائے۔ دوم: ان کے لیے درسی کتب مہیا کی جائیں۔ سوم: ہندوستانیوں کے ادنیٰ طبقوں کو کوئی ایسی ترغیب دی جائے کہ وہ ان ذرایع تعلیم سے جو ان کے لیے مہیا ہوں مستفید ہو سکیں۔ چہارم: یورپی علوم اور اعلیٰ تر شعبہ ہائے تعلیم کی اصلاحات سکھانے کے لیے مدارس قایم کیے جائیں۔ پنجم: ہندوستانی زبانوں میں اخلاقی و طبعی علوم کی کتابوں کی تیاری اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ ششم: انگریزی سکھانے کی غرض سے ان اشخاص کے لیے مدارس قایم کیے جائیں جو اسے ایک مستند زبان کی حیثیت سے نیز یورپی ایجادات کے ذریعۂ علم کے طور پر حاصل کرنا چاہیں۔ ہفتم: ان آخری شعبہ ہائے تعلیم کی تحصیل میں ہندوستانیوں کے لیے ترغیبی انعامات مقرر کیے جائیں۔

* * * * * *

بہرکیف کسی وقت بھی میری یہ خواہش نہیں ہو سکتی کہ ہندوؤں کا خاص جزو نصاب بالکل ترک کر دیا جائے۔ یہ یقیناً ایک مہمل طریقہ ہوگا کہ کسی قوم کے

ذہنی ذخیرۂ معلومات میں اضافہ کرنے کی ابتدا اس کے دیسی علم و ادب کی تباہی سے کی جائے اور ہم یہ خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستانیوں کی آیندہ تحصیل اپنی وسعت و نوعیت میں ترقی کر جائے گی بشرطیکہ ان کے سابق علم میں اس طرح اضافہ ہو کہ ان کی ذاتی و مخصوص خصلت کا رنگ برقرار رہے۔

رام موہن رائے کی یادداشت کو جو اوپر درج کی جا چکی ہے کوئی فوری کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ لارڈ امہرسٹ نے اسے مجلس تعلیم کے حوالے کر دیا اور وہ جواب طلب رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجلس مذکور کے کام میں اس کے ارکان کا باہمی شدید اختلاف مزاحم ہوتا رہا۔ مشرقی جماعت جس میں معتمد حکومت مسٹر تھابی پرنسپ بھی شامل تھا اس امر پر بہت زور دیتی تھی کہ عربی اور سنسکرت کتابوں کو طبع کرنے اور طالب علموں کو عربی کالج کی تعلیم کے لیے اجرت پر طلب کرنے کا قدیم طریقہ جاری رہنا چاہیے۔ مخالف جماعت مساوی قوت و شدت کے ساتھ یہ کہتی تھی کہ مجلس کی آمدنی خاصکر ایسے مدارس کے قیام کے لیے وقف کر دینی چاہیے جہاں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں تعلیم دی جائے۔ ایک طویل مدت تک دونوں جماعتوں میں برابر تفریق رہی۔ آخرکار لارڈ ولیم بنٹنک کا اثر اور خصوصاً میکالے کا اثر جو اولین رکن قانون کی حیثیت سے ہندوستان آ چکا تھا اور مجلس تعلیم کی صدارت پر کار فرما تھا انگریزی زبان کی حامی جماعت کی نمایاں فتح کا باعث ہوا۔ اس تصفیے کی اہم نوعیت کے نظر کرتے ہم میکالے کی مشہور یادداشت، حکومت کی تجویز جو جدید تغیر کو واضح کرتی ہے اور لارڈ ڈف کی عمدہ رائے جو اس کی اہمیت اور قیود سے متعلق ہے ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

نظام تعلیم میں ایک اہم تغیر* | چونکہ بعض اصحاب کی جو مجلس تعلیمات عامہ کے ارکان ہیں یہ رائے معلوم ہوتی ہے کہ

---

*Source.—(i) Minute by the Hon'ble T. B. Macaulay, dated the 2nd February, 1835.

جس طریقے پر وہ اب تک عمل پیرا رہے ہیں وہ من وعن سنہ ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ کی جانب سے مقرر ہوا تھا اور اگر رائے مذکور صحیح ہو تو اس میں تغیر کرنے کے لیے مجلس وضع قوانین کے آئین کی ضرورت ہو گی اس لیے میں نے یہ مناسب خیال کیا ہے کہ ان مخالف بیانات کی تائید میں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں کوئی حصہ لینے سے باز رہوں اور اس معاملے پر اپنے اظہار رائے کو اس وقت تک محفوظ رکھوں جب تک کہ رکن مجلس ہند کی حیثیت میں میرے آگے وہ پیش نہ ہو۔

۲- میں نہیں سمجھتا کہ پارلیمنٹ کے قانون کی کسی ترکیب سے ایسی تعبیر کی جا سکتی ہے جیسی کہ کی گئی ہے۔ اس میں مخصوص زبانوں یا علموں کی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ایک رقم "ادبیات کے احیاء و ارتقاء تعلیم یافتہ باشندگان ہند کی حوصلہ افزائی اور برطانوی مملکت کے باشندوں میں مختلف علوم کی ترویج و ترقی کے لیے" مختص کی گئی ہے۔ استدلال یہ کیا جاتا ہے بلکہ یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ ادبیات سے پارلیمنٹ صرف عربی اور سنسکرت ادب مراد لے سکتی ہے اور یہ کہ وہ کبھی تعلیم یافتہ ہندوستانی کا معزز لقب ایسے ہندوستانی کو نہ دیتی جو ملٹن کی شاعری، لاک کے علم مابعد الطبیعیات اور نیوٹن کے علم طبیعیات سے واقف ہو بلکہ اس نام سے اس کا مقصد صرف ایسے اشخاص کو موسوم کرنے کا تھا جنھوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں کس کے تمام فوائد اور دیوتا کی ذات میں ضم ہو جانے کے تمام اسرار کا مطالعہ کیا ہو۔ یہ تاویل قطعاً قابل اطمینان نہیں معلوم ہوتی۔ اسی قسم کی ایک مثال لیجیے: فرض کیجیے کہ مصر کا پاشا جس کے ملک کو کسی زمانے میں بلحاظ علوم اقوام یورپ پر فوقیت حاصل تھی، مگر جو اب ان کے درجے سے بہت نیچے گر گیا ہے ایک رقم "ادبیات کے احیاء و ارتقاء اور تعلیم یافتہ باشندگان مصر کی حوصلہ افزائی کی غرض سے مختص کر دے" تو کیا کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے گا کہ اس کا منشا یہ تھا کہ اس کی سلطنت کے نوجوان ہیرو غلیف کی تحصیل میں اور ان تمام نظریوں کی تحقیق میں

جو ازبر کے قصے میں پوشیدہ ہیں نیز سکنہ صحت کے ساتھ ان رسوم کو معلوم کرنے میں جن کے ساتھ قدیم زمانے میں بلی اور پیاز کی پرستش کی جاتی تھی کئی سال صرف کریں؟ کیا اس پر جائز طور سے تباین کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے اگر وہ اپنی نوجوان رعایا کو چہار گوشہ مناروں کی تشریح کے لیے مامور کرنے کی بجائے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی نیز ان تمام علوم کی جن کی خاص کلیدیں مذکورہ زبانیں ہیں تعلیم دینے کا حکم صادر کرے؟

۳۔ جن الفاظ پر طریقِ قدیم کے موئدین نے تکیہ کیا ہے وہ ان کی تائید نہیں کرتے اور دیگر متعاقب الفاظ ایسے ہیں جو دوسری جانب بالکل فیصلہ کن معلوم ہوتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیوں کی یہ رقم نہ صرف ہندوستان میں ادبیات کے احیا کے لیے" جس فقرے پر ان کی ساری تاویل مبنی ہے بلکہ "برطانوی مملکت کے باشندوں میں مختلف علوم کی ترویج و ترقی کے لیے" بھی مختص کی گئی ہے اور یہ متعاقب الفاظ بجنسہ ان تمام تغیرات کو جائز قرار دینے کے لیے کافی ہیں جن پر میں زور دے رہا ہوں۔

۴۔ اگر کونسل کو میری توضیح سے اتفاق ہو تو کوئی جدید قانون وضع کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر وہ مجھ سے اختلاف رکھتی ہے تو میں ایک مختصر قانون کی تحریک کرتا ہوں جو ۱۸۱۳ء کے منشور کے اس فقرے کو منسوخ کر دیگا جس کے باعث پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔

جس استدلال پر میں بحث کر رہا ہوں اس سے صرف طریق کارروائی متاثر ہوتا ہے۔ لیکن مشرقی طریق تعلیم کے مداحوں نے ایک اور استدلال پیش کیا ہے جسے ہم معقول تسلیم کر لیں تو ہر قسم کے تغیر کا وہ قطعی مخالف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرکاری عہدو پیمان موجودہ طریق تعلیم کا پابند ہو گیا ہے اور کسی مخصوص رقم میں تبدیلی کرنا جو اب تک عربی اور سنسکرت کی تعلیم کی ترغیب میں صرف ہوتی رہی ہے اس کی صریح خلاف ورزی ہوگی۔ یہ سمجھنا آسان نہیں ہے کہ کس طریقِ استدلال سے وہ اس نتیجے پر پہنچ سکے ہوں گے۔ محاصل ملکی سے جو رقم ادبیات کی ترغیب کے لیے منظور کی جاتی ہے

وہ کسی طرح اُس رقم کی منظوری سے مختلف نہیں ہو سکتی جو انھیں محاصل سے حقیقی یا فرضی فایدے کی دیگر اغراض کے لیے دی گئی ہو۔ ہم نے ایک صحت گاہ ایسے مقام پر قایم کی جسے ہم صحت بخش تصور کرتے ہیں تو اس بنا پر کیا ہم اپنے کو اس امر کا پابند بناتے ہیں کہ ہم اس صحت گاہ کو وہاں برقرار رکھیں خواہ اس کے نتائج ہماری توقعات کے مطابق نہ ہوں؟ ہم کسی پُل کے ستون کی تعمیر شروع کرتے ہیں تو کیا اس کام کو روک دینا سرکاری عہد و پیمان کی خلاف ورزی ہوگی اگر ہمیں بعد کو یہ یقین کرنے کی وجہ نظر آئے کہ تعمیر بے سود ہوگی؟ حقوق ملکیت بے شبہہ قابل احترام ہیں لیکن ان حقوق کو کوئی چیز اس قدر خطرے میں نہیں ڈالتی جس قدر غیر متعلق اشیا سے انھیں منسوب کرنے کا رواج جو اب بدقسمتی سے بہت عام ہو گیا ہے۔ جو اشخاص قبائح سے احترام ملکیت کو ملوث کرتے ہیں وہ درحقیقت مسئلہ ملکیت کو اسی قدر مطعون اور کم زور کرتے ہیں جس قدر خود وہ قبائح ہوتی ہیں۔ اگر حکومت نے کسی شخص کو رسمی طور پر یقین دلایا ہو یا حکومت نے کسی شخص کے دل میں کوئی معقول توقع پیدا کر دی ہو کہ وہ سنسکرت یا عربی کے معلم یا طالب علم کی حیثیت سے کچھ آمدنی پائے گا تو میں اس شخص کے مالی مفاد کا احترام کروں گا۔ میں افراد کے ساتھ فیاضانہ سلوک میں تساہل کروں گا مگر سرکاری عہد و پیمان پر کوئی اعتراض وارد ہونے کا موقع نہ دوں گا۔ لیکن یہ کہنا کہ حکومت نے بعض زبانیں اور علوم سکھانے کا عہد کر لیا ہے خواہ وہ زبانیں بے فایدہ ہو گئی ہوں اور خواہ وہ علوم ترک کر دینے کے قابل ہوں مجھے بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ کسی سرکاری دستاویز میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حکومت ہند نے کبھی اس معاملے پر کوئی عہد کرنے کا منصوبہ کیا یا کبھی اس رقم کے مصرف کو غیر متغیر طور پر معین سمجھا۔ لیکن اس کے خلاف بھی کوئی عمل ہوتا تو میں اپنے پیشرووں کے اس اختیار سے انکار کرتا کہ وہ ہمیں اس قسم کے معاملے میں کسی عہد کا پابند کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک حکومت گزشتہ صدی میں نہایت سنجیدہ طور پر یہ حکم دیتی کہ

اس کی تمام رعایا ہر مدت مقررہ کے اختتام پر چیچک کا ٹیکہ لیا کرے تو کیا وہ حکومت جینر کے اختراع کے بعد بھی اس عمل کو جاری رکھنے کی پابند ہوتی ؟ یہ وعدے جن کے ایفا کا کوئی شخص دعویدار نہیں اور جن سے کوئی شخص نجات نہیں دلا سکتا، یہ مستقل حقوق جو کسی شخص کو حاصل نہیں، یہ ملکیت جس کا کوئی مالک نہیں، یہ چوری جس سے کوئی شخص زیادہ مفلس نہیں بنتا یہ ساری چیزیں ایسے ہی اشخاص کی سمجھ میں آسکتی ہیں جو مجھ سے اعلیٰ تر قوت ادراک رکھتے ہیں۔ میں مذکورہ بالا استدلال کو محض ایسے الفاظ کی ایک معین شکل خیال کرتا ہوں جو انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ ہر اس برائی کی حمایت میں باقاعدہ استعمال کیے جاتے ہیں جس کے لیے کوئی دوسرا عذر قائم نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ میں یہ قرار دیتا ہوں کہ ایک لاکھ روپیوں کی یہ رقم کسی ایسے طریقے پر جو مناسب ترین سمجھا جاتا ہو ہندوستان میں ترقی علوم کی غرض کے لیے صرف کرنا بالکلیہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے اختیار میں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ معزز لارڈ یہ حکم دینے میں کہ رقم مذکور آیندہ عربی اور سنسکرت کی ترغیب کے لیے استعمال نہ کی جائے بالکل اسی طرح آزاد ہیں جس طرح یہ حکم دینے میں کہ میسور میں شیروں کے شکار کا انعام کم کر دیا جائے یا عبادت خانے میں راگ الاپنے پر آیندہ کوئی سرکاری رقم صرف نہ کی جائے۔

۶۔ اب ہم اصل مطلب پر آتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک رقم ہے جو حکومت کی ہدایت کے مطابق اس ملک کے باشندوں کی ذہنی ترقی کے لیے استعمال کی جائیگی۔ سادہ سوال یہ ہے کہ اس کا استعمال کا مفید ترین طریقہ کیا ہے ؟

۷۔ تمام فریقے اس ایک امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کے اس حصے کے باشندوں میں جو زبانیں عام طور پر بولی جاتی ہیں ان میں ادبی معلومات ہے نہ علمی اور علاوہ بریں وہ اس قدر کم مایہ اور ناشایستہ ہیں کہ جب تک انہیں کسی دوسرے ملک کی زبان کے ذریعے ترقی نہ دی جائے

ان میں کسی قابل قدر تصنیف کا ترجمہ کرنا آسان نہ ہوگا۔ یہ امر عام طور پر مسلّم معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کے اُن طبقوں کی ذہنی ترقی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ذرایع رکھتے ہیں فی الحال صرف کسی ایسی زبان کے ذریعے ہو سکتی ہے جو ان کی بول چال کی زبان نہ ہو۔

۸۔ پھر وہ زبان کونسی ہوگی؟ ارکان مجلس کی نصف تعداد کا خیال ہے کہ وہ انگریزی ہونی چاہیے۔ باقی نصف تعداد عربی اور سنسکرت کی پُرزور سفارش کرتی ہے۔ مجھے پورا سوال یہ معلوم ہوتا ہے کہ کونسی زبان بہترین طور پر قابل حصول ہے؟

۹۔ میں سنسکرت جانتا ہوں نہ عربی۔ لیکن میں نے ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اپنی امکانی حد تک کوشش کی ہے۔ میں نے نہایت مشہور عربی اور سنسکرت کتب کے تراجم پڑھے ہیں۔ میں نے یہاں اور وطن میں دونوں جگہ ایسے اشخاص سے گفتگو کی ہے جو مشرقی زبانوں کے ماہر ہونے کے باعث ممتاز ہیں۔ میں مشرقی علوم کو خود مشرقیوں کی آنکی ہوئی قیمت پر قبول کرنے کے لیے بالکل آمادہ ہوں۔ ان میں سے مجھے ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو اس امر سے انکار کر سکے کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانے کی ایک الماری ہندوستان اور عرب کے تمام مقامی ادب کے مساوی ہے۔ مغربی ادب کی حقیقی فوقیت کو فی الواقع اُن ارکان مجلس نے کامل طور پر تسلیم کر لیا ہے جو مشرقی طریقِ تعلیم کی حمایت کرتے ہیں۔

۱۰۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کسی کو کلام نہ ہوگا کہ مشرقی مصنفین کو ادبیات کے جس شعبے میں اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہے وہ شاعری ہے۔ یقیناً کوئی ایسا مشرقی مجھے کبھی نہیں ملا جسے یہ کہنے کی جرأت ہوئی ہو کہ یورپی اقوامِ عظیم کی شاعری سے عربی اور سنسکرت شاعری کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم تصوریات سے گزر کر ایسی تصانیف کی طرف آتے ہیں جن میں حقایق مندرج ہوں اور عام اصول کی تشریح موجود ہو تو یورپی اقوام کی فوقیت بالکل ناقابل اندازہ ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ

تمام تاریخی مواد جو سنسکرت زبان کی تمام کتب سے جمع کیا گیا ہے اس قدر قیمتی نہیں ہے جس قدر وہ مواد جو ابتدائی مدارس انگلستان کی نہایت معمولی و مختصر کتب تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ طبعی یا اخلاقی فلسفہ کی ہر شاخ میں دونوں قوموں کی اضافی حیثیت تقریباً یکساں ہے۔

۱۱۔ پھر صورت معاملہ کیا ہے؟ ہمیں ایک ایسی قوم کو تعلیم دینی ہے جسے فی الحال اس کی مادری زبان کے ذریعے تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ ہمیں کوئی غیر زبان اسے سکھانی چاہیے۔ ہماری زبان کی برتری کا یہاں اعادہ کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ مغرب کی زبانوں میں بھی ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اس میں تصوریات کی بہتات ہے جن کا پایہ ان بہترین تصانیف سے کم نہیں ہے جو یونان نے ہمارے لئے بطور میراث چھوڑی ہیں۔ اس میں فصاحت و بلاغت کے ہر قسم کے نمونے موجود ہیں۔ اس میں ایسے تاریخی حالات ہیں جو محض حکایات متصور ہونے کے لحاظ سے شاذ ہی کم مایہ گردانے گئے ہوں مگر اخلاقی و سیاسی تعلیم کے وسایل قرار پانے کے لحاظ سے کسی زبان نے کبھی ان کی ہمسری نہیں کی ہے۔ اس میں انسانی حیات و فطرت کے صحیح اور جیتے جاگتے مرقعے بکثرت ہیں۔ اس میں مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، حکومت، اصول قانون اور تجارت کے متعلق عمیق ترین تخیلات مجتمع ہیں اور اس میں ان تمام تجربی علوم کے متعلق کامل اور صحیح معلومات کا ذخیرہ ہے جن سے انسان کی صحت کی حفاظت، راحت میں اضافہ یا ذہنی قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ جو شخص اس زبان کو جانتا ہے اس کی فوری رسائی اس ساری ذہنی دولت تک ہو سکتی ہے جو کرۂ ارض کی تمام فرزانہ اقوام نے نوسے پشتوں سے پیدا کر کے جمع کی ہے۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زبان میں جو ادب اس وقت موجود ہے وہ اس تمام ادب سے زیادہ باوقعت ہے جو تین سو سال قبل بہ حیثیت مجموعی دنیا کی تمام زبانوں میں موجود تھا اور یہی سب کچھ نہیں بلکہ ہندوستان میں انگریزی ایسی زبان ہے جو حکمران طبقہ بولتا ہے۔ دارالحکومتوں میں ہندوستانیوں کا اعلیٰ طبقہ بھی انگریزی

بولتا ہے۔ تمام مشرقی سمندروں میں اس کا تجارتی زبان بن جانا ممکن ہے۔ وہ دو بڑے یورپی فرقوں کی زبان ہے جن میں سے ایک جنوبی افریقہ میں اور دوسرا آسٹریلیا میں ترقی کر رہا ہے اور یہ ایسے فرقے ہیں جو ہر سال زیادہ باوقعت اور ہماری سلطنت ہند کے ساتھ زیادہ مربوط ہوتے جا رہے ہیں۔ خواہ ہم اپنے ادب کی اصلی قدر و قیمت پر نظر رکھیں خواہ اس ملک کی مخصوص حالت کو دیکھیں ہمیں یہ خیال کرنے کی قوی ترین وجہ نظر آئیگی کہ تمام غیر ملکی زبانوں میں انگریزی ہی وہ زبان ہے جو ہماری ہندوستانی رعایا کے لیے نہایت مفید ہوگی۔

۱۲۔ اب ہمارے سامنے سوال صرف یہ ہے کہ جب انگریزی زبان کی تعلیم ہمارے اختیار میں ہے تو کیا ہم ایسی زبانوں کی تعلیم دینگے جن میں مسلم طور پر کسی مضمون سے متعلق ایسی کتب نہیں ہیں جو ہماری کتب کا مقابلہ کر سکیں؟ جب ہم مغربی علوم سکھا سکتے ہیں تو کیا ہم ایسے علوم کی تعلیم دینگے جو یورپی علوم سے جہاں کہیں اختلاف رکھتے ہیں وہ یقیناً غلطی ہی پر مبنی ہوتا ہے اور جب ہم صحیح فلسفہ اور حقیقی تاریخ کی حمایت کر سکتے ہیں تو کیا ہم سرکاری مصارف سے ایسے طبی نظریوں کی قدر افزائی کرینگے جو ایک انگریز سلوتر کے لیے باعث ننگ ہوں یا ایسے علم نجوم کو روا رکھینگے جو کسی انگریزی مدرسے کی لڑکیوں میں مضحکہ خیز ہوگا یا ایسی تاریخ کی تعلیم دینگے جو تیس فیٹ کے قد آور بادشاہوں اور تیس ہزار سال کی طویل حکومتوں کے تذکرے سے معمور ہو یا ایسا جغرافیہ سکھائینگے جو شیرے اور مسکے کے سمندروں سے مرکب ہو۔

۱۳۔ ہماری رہنمائی کے لیے تجربہ موجود ہے۔ تاریخ میں ایک ہی قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں اور وہ سب کی سب ہمیں ایک ہی سبق پڑھاتی ہیں۔ ماضی سے قطع نظر کر کے حال ہی کے زمانے کو لیجیے جس میں ایسے ممالک کی دو مثالیں یادگار مثالیں موجود ہیں جہاں ایک پوری سوسائٹی کے دل و دماغ کو خوب متاثر کیا گیا، تعصبات کو مٹا دیا گیا، علم پھیلا دیا گیا، مذاق کو پاک و صاف کر دیا گیا اور علوم و فنون کی بنا ڈال دی گئی حالانکہ ممالک مذکور حال حال تک جہالت اور حیوانیت میں مبتلا تھے۔

۱۴۔ پہلی مثال جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے مغربی اقوام میں علوم کے اُس احیائے عظیم کی ہے جو پندرھویں صدی کے اواخر اور سولھویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اس زمانے میں تقریباً ہر چیز جو قابل مطالعہ تھی یونانی اور رومی متقدمین کی تحریروں میں موجود تھی۔ اگر ہمارے آباؤ اجداد اسی طرح عمل کرتے جس طرح مجلس تعلیمات عامہ نے اب تک کیا ہے اگر وہ تھوسی ڈائڈس اور افلاطون کی زبان کو اور سسرو اور ٹیسیٹس کی زبان کو نظرانداز کر دیتے، اگر وہ اپنی توجہ کو ہمارے جزیرے کی قدیم زبانوں تک محدود رکھتے، اگر وہ اینگلو سیکسن تاریخوں اور نارمن فرانسیسی افسانوں کے سوا کچھ اور شایع کرتے نہ اپنی جامعات میں کوئی تعلیم دیتے تو کیا انگلستان کی وہ حیثیت جو اب پائی جاتی ہے کبھی ہو سکتی تھی؟ مور اور آشام کے ہمعصروں کے حق میں یونانی اور لاطینی زبانیں جس قدر مفید تھیں اسی قدر ہندوستانی باشندوں کے حق میں ہماری زبان مفید ہے۔ اب انگلستان کا ادب مستند قدیم ادب کی بہ نسبت زیادہ باوقعت ہے۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ سنسکرت ادب اسی طرح قابل قدر ہو سکتا ہے جس طرح ہمارے سیکسن اور نارمن اسلاف کا ادب تھا۔ بعض شعبوں میں مثلاً تاریخ میں مجھے یقین ہے وہ بہت کم مایہ ہے۔

۱۵۔ دوسری مثال کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ گزشتہ ایک سو بیس سال کی مدت میں ایک قوم جو بزمانہ سابق ایسی وحشیانہ حالت میں رہ چکی تھی جیسی محاربات صلیبی سے قبل ہمارے آباؤ اجداد کی تھی رفتہ رفتہ اس جہالت سے جس میں وہ مبتلا تھی باہر نکل آئی اور اس نے مہذب اقوام میں اپنی جگہ حاصل کر لی۔ اس قوم سے میری مراد روس کی قوم ہے اب اس ملک میں ایک بڑا تعلیم یافتہ طبقہ ہے جس میں ایسے اشخاص کی افراط ہے جو سلطنت کی اعلیٰ ترین خدمات بخوبی انجام دے سکتے ہیں اور جو کسی طرح بھی اُن باکمال ہستیوں کے مقابلے میں کم پایہ نہیں ہیں جن سے پیرس اور لندن کے بہترین طبقوں کو زینت ہے۔ اس توقع کی گنجائش ہے کہ یہ وسیع سلطنت جس کا رتبہ ہمارے اجداد کے زمانے میں شاید پنجاب سے بھی گرا ہوا تھا ہمارے

پوتوں کے زمانے میں رفتارِ ترقی کے لحاظ سے فرانس اور برطانیہ کے لگ بھگ ہو جائیگی۔ مذکورہ بالا تغیر کس طرح عمل میں آیا؟ وہ قومی تعصبات کو اکسانے سے نہیں، نوجوان باشندگان ماسکو کے دماغوں میں بڑی بوڑھیوں کی کہانیوں کو جن پر ان کے جاہل اجداد یقین رکھتے تھے بھرنے سے نہیں، سینٹ نکولس کے متعلق جھوٹی روایتوں کو ان کے سروں میں داخل کرنے سے نہیں، انہیں اس مسئلۂ عظیم پر کہ آیا دنیا ۱۳ ستمبر کو پیدا کی گئی یا نہیں غور و خوض کرنے کی ترغیب دینے سے نہیں اور جب وہ ان تمام تعلیمی امور پر حاوی ہو چکے ہوں تو انہیں "تعلیم یافتہ روسی" کہنے سے نہیں بلکہ انہیں اُن غیر زبانوں کے سکھانے سے جن میں معلومات کا عظیم ترین ذخیرہ جمع تھا اور اس طرح ان کی رسائی اس ذخیرۂ معلومات تک کرو دینے سے وہ (تغیر) عمل میں آیا تھا۔ مغربی یورپ کی زبانوں نے روس کو مہذب بنایا۔ مجھے اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ زبانیں ہندوؤں کو بھی اسی طرح شائستہ بنا دینگی جس طرح انہوں نے تاتاریوں کو بنایا ہے۔

۱۶۔ وہ دلایل کیا ہیں جو اس طریقے کے خلاف پیش کی جاتی ہیں جس کی تائید نظریہ اور تجربہ دونوں سے ہوتی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہمیں ہندوستانی رعایا کا تعاون حاصل کرنا چاہیے اور یہ تعاون ہم صرف سنسکرت اور عربی پڑھانے سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۷۔ میں یہ کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتا کہ جب ایک قوم جو اعلیٰ درجے کے دماغی اوصاف سے متصف ہو کسی ایسی قوم کی تعلیم کی نگرانی اپنے ذمے لیتی ہے جو نسبتہً جاہل ہو تو طالب علم بالکلیہ اس طریقِ تعلیم کو مقرر کرینگے جو معلموں کو اختیار کرنا چاہیے۔ بہرحال اس معاملے کی نسبت کچھ کہنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ناقابل تردید شہادت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ فی الحال ہم ہندوستانیوں کا تعاون حاصل نہیں کر رہے ہیں۔ یہ بڑی بد مذاقی ہوگی کہ ان کی ذہنی صحت کو قربان کر کے ان کے ذہنی رجحان کو ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن ہم ان دونوں چیزوں میں سے کسی کا بھی پاس نہیں کر رہے ہیں۔ ہم انہیں ایسے علم سے روک رہے ہیں

جو اُن کے نزدیک مرغوب ہے اور ایسا جھوٹا علم اُن کے سامنے پیش کر رہے ہیں جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔

۱۸۔ مذکورِ بالا امر اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم عربی اور سنسکرت کے طلبہ کو وظایف عطا کرنے پر مجبور رہیں اور جو طلبہ انگریزی سیکھتے ہیں وہ ہمیں اجرت تعلیم ادا کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہندوستانی اپنی مقدس زبانوں سے جو محبت اور ان کا جو احترام کرتے ہیں اس کے متعلق دنیا کی لفاظی کسی غیر جانب دار شخص کی رائے میں اس ناقابل تردید واقعے سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتی کہ ہمیں اپنی ساری وسیع سلطنت میں ایک طالب علم بھی ایسا نہیں ملتا جو ہم سے مذکورہ زبانوں کی تعلیم پانے کے لیے تیار ہو بجز اس صورت کے کہ ہم اسے تعلیم پانے کا معاوضہ دیں!

۱۹۔ اس وقت میرے سامنے مدرسے کے حسابات یک ماہ بابت دسمبر ۱۸۲۳ء موجود ہیں۔ عربی کے طالب علم تعداد میں ۷۷ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب کے سب سرکاری وظیفے پاتے ہیں۔ کل رقم جو انہیں دی جاتی ہے ہر ماہ پانچ سو روپیوں سے زاید ہوتی ہے۔ اس حساب کی دوسری جانب حسب ذیل مد قایم ہے:

انگریزی کے سابق طلبہ سے گزشتہ ماہ مئی و جون و جولائی کی بابت حاصل کردہ رقم جو مہا شدنی ہے ۔ ۱۰۳ روپے۔

۲۰۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ محض مقامی تجربے کی کمی کا باعث ہے کہ مجھے مذکورِ بالا حالات پر تعجب ہوتا ہے اور یہ کہ ہندوستان کے طلبہ کا یہ طریقہ ہی نہیں کہ وہ اپنے مصارف سے تعلیم حاصل کریں۔ اس بیان سے میرے خیالات کی توثیق ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی چیز قابل یقین نہیں ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں انسانوں کو ایسا کام کرنے کے لیے جسے وہ خوشگوار اور مفید سمجھیں اجرت دینا کبھی لازم نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدے سے ہندوستان مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہندوستان کے باشندوں کو جب وہ بھوکے ہوں چاول کھانے یا موسم سرما میں اونی کپڑے پہننے کے لیے کوئی رقم لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

خیر ہمارے پیش نظر معاملے کے زیادہ قریب آییے: دیہی مکتب کا مدرس ان بچوں کو جو اس سے ابجد اور کچھ ابتدائی حساب سیکھتے ہیں کوئی اجرت نہیں دیتا بلکہ انہیں تعلیم دینے کی اجرت اسے دی جاتی ہے۔ پھر جو اشخاص سنسکرت اور عربی سیکھتے ہیں انہیں اجرت دینا کیوں لازم ہے؟ صریحاً اس لیے کہ عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ سنسکرت اور عربی ایسی زبانیں ہیں جن کا علم اس محنت کا کافی معاوضہ نہیں ہوتا جو ان کے حصول میں کی جاتی ہے۔ ایسے تمام امور کے متعلق بازار کی حالت سے قطعی آزمائش ہوا کرتی ہے۔

۲۱۔ اگر کسی اور ثبوت کی ضرورت ہو تو اس کی کچھ کمی نہیں ہے۔ گزشتہ سال سنسکرت کالج کے کئی قدیم طالب علموں کی جانب سے مجلس کے پاس ایک درخواست پیش ہوئی تھی۔ درخواست گزاروں نے لکھا تھا کہ انہوں نے دس بارہ سال کالج میں تعلیم پائی، ہندو ادب اور علوم سے واقفیت حاصل کی اور قابلیت کے اسناد بھی حاصل کر لیے۔ اس ساری محنت کا ماحصل کیا ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ "ان اسناد کے باوجود معزز مجلس کی مہر آمیز اعانت کے بغیر ہماری حالت کے بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ اُس بے اعتنائی کے باعث جو ہمارے ہم وطن عام طور پر ہمارے ساتھ روا رکھتے ہیں ہمیں ان کی جانب سے کسی قسم کی امداد یا حوصلہ افزائی کی کوئی توقع نہیں رہی ہے"۔ لہٰذا وہ استدعا کرتے ہیں کہ گورنر جنرل کی خدمت میں انہیں سرکاری خدمات دینے کی سفارش کی جائے۔ یہ خدمات اعلیٰ اعزاز یا بڑی آمدنی کی نہیں بلکہ ایسی ہوں جو محض ان کی زندگی کو برقرار رکھ سکیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ "ہمیں اپنی شریفانہ زندگی اور تدریجی ترقی کے لیے توسل کی ضرورت ہے جو کسی طرح ہم اُس حکومت کی اعانت کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے جس نے بچپن سے ہماری پرورش کی اور ہمیں تعلیم دی"۔ وہ نہایت دردانگیز پیرایے میں اپنی درخواست اس امر کے اظہار پر ختم کرتے ہیں کہ انہیں یقین ہے کہ حکومت کا کبھی یہ منشا نہیں رہا کہ وہ ان کی تعلیم کے زمانے میں ان کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کر کے آیندہ انہیں مفلسی اور کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دے۔

۲۲- میں حکومت کے نام معاوضے سے متعلق متعدد درخواستیں دیکھتا رہا ہوں۔ وہ تمام درخواستیں بلکہ ان میں سے نہایت غیر معقول درخواستیں بھی اس مفروضے پر مبنی تھیں کہ کچھ نقصان اٹھایا گیا ہے اور ناانصافی کی گئی ہے۔ یہ یقیناً پہلے درخواست گزار ہیں جنہوں نے اس بنا پر معاوضہ طلب کیا ہے کہ انہیں مفت تعلیم دی گئی سرکاری رقم سے بارہ سال تک ان کی مدد کی گئی اور پھر انہیں علوم و فنون سے خوب واقف ہونے کے بعد دنیائے عمل میں بھیجا گیا۔ وہ اپنی تعلیم کو ایک ایسا ضرر ظاہر کرتے ہیں جس سے انہیں یہ حق پیدا ہوتا ہے کہ حکومت سے داد خواہی کی جائے نیز وہ اسے ایک ایسا ضرر بیان کرتے ہیں جس کے عاید کرنے کے دوران میں جو وظایف انہیں دیے گئے ان سے اس کی کافی تلافی نہیں ہوئی، اور مجھے اس میں شبہ نہیں کہ وہ حق بجانب ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال ایسی تعلیم کی تحصیل میں صرف کیے جس سے انہیں روٹی مل سکتی ہے نہ عزت۔ جو رقم ان اشخاص کو ناکارہ اور مصیبت زدہ بنانے میں صرف ہوئی اسے یقیناً ہم بہتر غرض کے لیے محفوظ کر سکتے تھے۔ یقیناً اس سے کسی قدر کم سرکاری خرچ پر ایسے اشخاص کو تعلیم دی جا سکتی ہے جو حکومت کے لیے بارگراں اور ہمسایوں کے نزدیک قابل نفرت ہوں۔ لیکن ہماری روش ہی ایسی ہے کہ ہم صدق اور کذب کے باہمی مقابلے میں غیر جانب دار رہنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ہم ہندوستانیوں کو انھیں کے موروثی تعصبات کے زیر اثر چھوڑنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ اُن فطری دشواریوں میں جو مشرقی علوم کی راہ ترقی میں مزاحم ہیں ہم اپنی پیدا کردہ عظیم دشواریوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ ایسے عطیے اور وظیفے جو حق کے فروغ کے لیے بھی نہ دیے جاتے چاہییں ہم غلط آزمائش اور باطل فلسفہ پر صرف کرتے ہیں۔

۲۳- اس طرح عمل کرنے سے ہم وہی قباحت پیدا کرتے ہیں جس سے ہم ڈرتے ہیں۔ ہم ایسی مخالفت کر رہے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ جو کچھ ہم عربی اور سنسکرت کالجوں پر صرف کرتے ہیں وہ محض حق کے معاملے میں ایک نقصان عظیم ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی فیاضانہ رقم ہے جو حامیان اغلاط

کے پیدا کرنے میں صرف کی جا رہی ہے۔ وہ نہ صرف عاجز اور کاہل اشخاص کا ایک گروہ پیدا کر رہی ہے بلکہ ایسے متعصب اشخاص کا بھی جو جذبات اور اغراض سے یکساں طور پر متاثر ہو کر ہر مفید منصوبۂ تعلیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریگا۔ اگر میرے پیش کردہ تغیر کے متعلق ہندوستانیوں کی جانب سے کوئی مخالفت ہو تو وہ ہمارے ہی نظام تعلیم کا نتیجہ ہوگی۔ اس مخالفت کے بانی وہی اشخاص ہونگے جنہوں نے ہمارے وظیفوں کی مدد سے ہمارے کالجوں میں تعلیم پائی۔ جس قدر زیادہ مدت تک ہم اپنے موجودہ طرز پر قایم رہینگے اسی قدر زیادہ خطرناک ان کی مخالفت ہو جائیگی اور ان میں سال بہ سال زنگروٹوں کی بھرتی ہوتی جائیگی جنہیں ہم وظایف دیا کرینگے۔ ہندوستانی سوسائٹی کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس سے ہمیں مشکلات کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ ساری شکایت کا باعث مشرقی علوم کا وہ رجحان ہوگا جسے ہم نے مصنوعی ذرایع سے پیدا کیا اور پال کر قوی بنایا ہے۔

۲۴۔ ایک واقعہ اور ہے جو تنہا اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ ہندوستانی رعایا کا احساس جب اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے ایسا نہیں ہوتا جیسا قدیم نظام تعلیم کے حامی اسے ظاہر کرتے ہیں۔ مجلس نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک لاکھ روپیوں سے زاید رقم عربی اور سنسکرت کتابوں کی چھپائی کے لیے مختص کر دی جائے۔ ان کتابوں کا کوئی خریدار نہیں ملتا۔ یہ بہت شاذ ہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک نسخہ فروخت ہو جائے۔ ۲۳ ہزار جلدیں جن میں سے اکثر بڑی اور چھوٹی تقطیع کی ہیں اس مجلس کے کتب خانوں بلکہ انبار خانوں میں بھری پڑی ہیں۔ مجلس اپنے مشرقی ادب کے عظیم ذخیرے سے کتابیں بخش دے کر اس کا کچھ حصہ خارج کرنے کی تدبیر کر رہی ہے۔ لیکن کتابیں اس قدر جلد وہ نہیں دے سکتی جس قدر جلد انہیں وہ طبع کراتی ہے۔ تقریباً بیس ہزار روپے سالانہ ردی کاغذات کے تازہ ڈھیر کا اس انبار میں اضافہ کرنے کے لیے صرف کیے جاتے ہیں جو ہر شخص کے خیال میں پہلے ہی سے کافی طور پر بڑا ہے۔ اس طرح گذشتہ تین سال میں تقریباً ساٹھ ہزار روپے

صرف کیے گئے ہیں۔ انھیں تین سال میں عربی اور سنسکرت کتابوں کی فروخت سے پورے ایک ہزار روپیے بھی حاصل نہ ہو سکے۔ اسی زمانے میں انجمن کتب مدارس سات آٹھ ہزار انگریزی کتابیں ہر سال فروخت کرتی رہی اور نہ صرف ان کی طباعت کے مصارف اس نے ادا کیے بلکہ اپنے سرمائے پر ۲۰ فی صد نفع بھی حاصل کیا۔

۲۵۔ اس امر پر بہت زور دیا گیا ہے کہ دھرم شاستر کو خاصکر سنسکرت کتابوں سے اور شرع اسلام کو عربی کتابوں سے سیکھنا چاہیے۔ لیکن اس کا کوئی تعلق مسئلۂ زیر بحث سے نہیں معلوم ہوتا۔ پارلیمنٹ نے حکم دیا ہے کہ ہم ہندوستان کے قوانین سے واقفیت اور ان میں مہارت حاصل کریں۔ اس غرض کے لیے ہمیں ایک قانونی کمیشن کی مدد بھی دی گئی ہے۔ جوں ہی مدون قانون کی اشاعت ہوگی شاستر اور ہدایۃ کسی منصف یا صدر امین کے لیے بے سود ہوگی۔ مجھے امید اور بھروسہ ہے کہ جو طلبہ اس وقت مدرسہ اور سنسکرت کالج میں داخل ہو رہے ہیں ان کے فارغ التحصیل ہونے سے پیشتر مذکورہ کام تکمیل پا جائیگا۔ یہ علانیہ ایک لغو فعل ہوگا کہ نوجوانوں کو اس صورت حالات کے نظر کرتے تعلیم دی جائے جسے ہمارا منشا بدل دینے کا ہو قبل اس کے کہ انہیں لوازم انسانیت حاصل ہوں۔

۲۶۔ لیکن ایک اور استدلال باقی ہے جو نسبتہً زیادہ غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سنسکرت اور عربی ایسی زبانیں ہیں جن میں دس کروڑ اشخاص کی مقدس کتابیں لکھی ہوئی ہیں اور اسی سبب سے وہ خاص طور پر تائید کی مستحق ہیں۔ یقیناً برطانوی حکومت ہند کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام مذہبی معاملات میں نہ صرف رواداری برتے بلکہ غیر جانب دار رہے۔ لیکن ایک ایسے ادب کی تعلیم کو جس کی حقیقی قدر و قیمت بہت کم تسلیم کی گئی ہے محض اس لیے تقویت دینا کہ اس ادب میں اہم ترین معاملات کے متعلق اہم ترین اغلاط کی فہمائش کی گئی ہے ایک ایسا طریقہ ہے جو عقل، اخلاق یا خود اس غیر جانب داری پر بھی بہ مشکل منطبق ہو سکتا ہے جو احترام کے ساتھ جیسا کہ ہم سب کا خیال ہے

برقرار رہنی چاہیئے۔ یہ مسلم ہے کہ ایک زبان مفید معلومات سے محروم ہے لیکن ہمیں اس زبان کی تعلیم دینی ہے کیونکہ اس میں عظیم توہمات کی بہتات ہے۔ ہمیں غلط تاریخ، غلط علم ہیئت، غلط علم طب پڑھانا ہے کیونکہ ہم انہیں ایک باطل مذہب کے ساتھ گساتھ پاتے ہیں۔ ہم احتراز کرتے ہیں اور مجھے اعتماد ہے کہ ہم ہمیشہ ان اشخاص کو سرکاری امداد دینے سے احتراز کرتے رہینگے جو ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے کام میں مصروف ہیں۔ جب ہمارا طرز عمل یہ ہے تو کیا ہم عاقلانہ یا شریفانہ طور پر سرکاری محاصل میں سے کوئی رقم ہندوستانی اشخاص کو بطور رشوت دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے عالم شباب کو یہ سیکھنے میں برباد کر دیں کہ گدھے کو چھونے کے بعد انہیں اپنے آپ کو کس طرح پاک کرنا چاہیئے یا بکرے کو ہلاک کرنے کے جرم کا کفارہ دینے کے لیے انہیں وید کے کونسے فقرے پڑھنے چاہیئیں؟

۲۷۔ مشرقی علوم کے حامی یہ مسلّم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کا کوئی باشندہ انگریزی زبان کی سطحی واقفیت سے زیادہ اور کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن ہمیشہ اس کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ اس تعلیم کو جس کی سفارش ان کے مخالفین کرتے ہیں محض ایک کتابِ املا کی تعلیم سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ اس امر کو ناقابل انکار تصور کرتے ہیں کہ اصل سوال ایک طرف ہندی اور عربی ادبیات وعلوم کی گہری معلومات اور دوسری طرف مبادیات انگریزی کی سطحی معلومات حاصل کرنے کا ہے۔ یہ نہ صرف ایک مفروضہ ہے بلکہ ایسا مفروضہ ہے جو بالکل عقل اور تجربے کے خلاف ہے ہم جانتے ہیں کہ تمام اقوام کے غیر اشخاص ہماری زبان اس قدر کافی سیکھتے ہیں کہ ان کی رسائی تمام مشکل ترین معلومات تک جو اس میں موجود ہے ہو جاتی ہے نیز وہ ہمارے معیاری مصنفین کی نہایت بامحاورہ تحریروں کی لطافت و نزاکت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خود اسی شہر میں ایسے ہندوستانی اشخاص موجود ہیں جو روانی اور درستی کے ساتھ انگریزی زبان میں سیاسی یا علمی مسائل پر بحث کرنے کے قابل ہیں۔ میں نے خود اسی مسئلے پر جس کے متعلق میں اب لکھ رہا ہوں

ہندوستانی اشخاص کو ایسی ذکاوت اور وسعت نظر کے ساتھ بحث کرتے ہوئے سنا ہے جو مجلس تعلیمات عامہ کے کسی رکن کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتی ہے۔ فی الواقع براعظم یورپ کے ادبی حلقوں میں کبھی کوئی غیر ملکی شاذ ہی ایسا ملتا ہے جو انگریزی زبان میں اپنے خیالات کو ایسی سہولت اور صحت کے ساتھ ظاہر کر سکتا ہو جیسی ہم اکثر ہندوؤں میں پاتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہ کریگا کہ انگریزی کسی ہندو کے لیے اسی قدر مشکل ہے جس قدر یونانی ایک انگریز کے لیے مشکل ہے۔ بریں ہم جس مدت میں آپ کے بدقسمت طالب علم سنسکرت کالج سے کامیاب ہو کر نکلتے ہیں اس سے بہت ہی کم مدت میں ایک ذہین انگریز لڑکا بہترین یونانی مصنفین کی تحریروں کو پڑھنے ان کا لطف اٹھانے نیز عمدگی سے ان کے اسلوب بیان کی نقل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایک انگریز لڑکا جس مدت میں ہیروڈوٹس اور سافوکلز کی تصانیف پڑھنے کے قابل ہوتا ہے اس کے نصف سے بھی کم مدت میں ایک ہندو کو ہیوم اور ملٹن کی کتب پڑھنے کے قابل ہو جانا چاہیے۔

۲۸۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے: میں ان امور کو واضح خیال کرتا ہوں کہ ہم پر ۱۸۱۳ء کے قانون پارلیمنٹ کی پابندی عاید نہیں ہوتی، ہم کسی صریح یا معنوی عہد و پیمان کے پابند نہیں ہیں، ہم اپنی رقم کو جس طرح چاہیں استعمال کرنے میں آزاد ہیں، ہمیں چاہیے کہ اسے ایسی تعلیم میں استعمال کریں جو بہترین طور پر قابل حصول ہو، انگریزی کی واقفیت سنسکرت اور عربی کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے، ہندوستانیوں کی خواہش یہ ہے کہ انہیں انگریزی سکھائی جائے نہ کہ عربی یا سنسکرت، عربی اور سنسکرت قانونی زبان کی حیثیت سے نہ مذہبی زبان کی حیثیت سے ہماری تائید کا کوئی خاص استحقاق رکھتی ہیں، اس ملک کے باشندوں کو کامل طور پر انگریزی کے حقیقی عالم بنانا ممکن ہے اور ہمیں اس مقصد کی جانب اپنی مساعی کا رخ پھیر دینا چاہیے۔

۲۹۔ ایک مسئلے میں مجھے ان اصحاب سے کامل اتفاق ہے جن کی عام رائے کی مخالفت میں نے کی ہے۔ میں ان کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے

محدود ذرایع کے نظر کرتے رعایا کی اکثریت کو تعلیم دینے کی کوشش کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ ہمیں فی الحال اپنی بہترین کوششیں ایک ایسی جماعت کے قایم کرنے میں صرف کرنی چاہییں جو ہمارے اور اُن لاکھوں نفوس کے درمیان جن پر ہم حکومت کرتے ہیں ترجمانی کا کام کرے اور یہ ایک ایسی جماعت ہو جو خون اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی ہو مگر مذاق، تخیل، اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے فرنگی ہو۔ اس جماعت کے سپرد ہم یہ کام کر سکتے ہیں کہ وہ ملک کی زبانوں کو شستہ بنائے، ان کو مغربی علمی اصطلاحوں سے معمور کرے اور رفتہ رفتہ ان کو عوام کی کثیر آبادی میں اشاعت علم کا موزوں ذریعہ بنائے۔

۳۰۔ میں تمام موجودہ اغراض کا کامل احترام کرونگا۔ میں اُن تمام افراد کے ساتھ بھی فیاضانہ سلوک کرونگا جنہیں کسی مالی امداد کی معقول توقع ہو گئی ہے۔ لیکن میں اس قبیح طریقے کی بیخ کنی کرونگا جسے اب تک ہم نے جاری رکھا ہے۔ میں فوراً عربی اور سنسکرت کتابوں کی طباعت بند کردونگا۔ میں مدرسہ اور سنسکرت کالج (کلکتہ) کو برخاست کردونگا۔ بنارس برہمنی علوم کا بڑا مرکز ہے اور دہلی عربی علوم کا۔ اگر ہم بنارس کے سنسکرت کالج اور دہلی کے محمڈن (اسلامی) کالج کو برقرار رکھیں تو ہمارا یہ عمل میری رائے میں مشرقی زبانوں کی بقا کے لیے کافی بلکہ کافی سے بہت زیادہ ہوگا۔ اگر بنارس اور دہلی کے کالج برقرار رکھے جائیں تو میں کم از کم اس امر کی تائید کرونگا کہ اُن طلبہ کو جو آیندہ ان کالجوں میں داخل ہوں کوئی وظائف نہ دیے جائیں بلکہ یہ عوام پر چھوڑ دیا جائے کہ خود وہ ہمسر تعلیمی طریقوں میں سے کسی کا انتخاب کریں اور ہماری طرف سے انہیں ایسے علوم سیکھنے کے لیے رشوت نہ دی جائے جن کے حصول کی خواہش وہ نہیں کرتے۔ اس طرح جو رقم ہمارے زیر تصرف ہوگی اس سے ہم ہندو کالج کلکتہ کو زیادہ امداد دینے نیز فورٹ ولیم اور آگرہ کے احاطوں کے بڑے بڑے شہروں میں ایسے مدارس قایم کرنے کے قابل ہو سکینگے جن میں انگریزی کامل طور پر بخوبی

سکھائی جا سکے۔

۳۱۔ اگر معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کا فیصلہ میری توقع کے مطابق ہو تو میں اپنے فرائض کی بجا آوری انتہائی جوش و مستعدی کے ساتھ شروع کر دونگا۔ اگر بصورت دیگر حکومت کی یہ رائے ہو کہ موجودہ نظام تعلیم میں کوئی تغیر نہ ہونا چاہیے تو میں استدعا کرتا ہوں کہ مجھے مجلس کی صدارت سے سبکدوش ہونے کی اجازت دی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجلس میں میرے رہنے سے قلیل ترین فایدہ بھی نہ ہو سکیگا اور میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ وہاں میرا رہنا گویا اس امر کی تائید کرنا ہے جسے میں کامل یقین کے ساتھ محض ایک مغالطہ سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ موجودہ نظام تعلیم سے صداقت کی رفتار میں تیزی نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس سے فانی اغلاط کی فطری موت میں بھی تاخیر ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم بحالت موجودہ مجلس تعلیمات عامہ کے معزز نام کے مستحق نہیں ہیں۔ ہماری مجلس سرکاری رقم ضایع کرتی ہے، وہ ایسی کتابیں طبع کرتی ہے جن کی قدر و قیمت اُن سادہ کاغذات سے بھی کم ہے جن پر وہ طبع کی جاتی ہیں؛ وہ لایعنی تاریخ، لغو علم مابعد الطبیعیات، بیہودہ علم طبیعیات اور نامعقول علم فقہ کی مصنوعی ترغیب دیتی ہے، وہ طالب علموں کی ایک ایسی جماعت پیدا کرتی ہے جو اپنی علمیت کو ایک بار اور عار سمجھتی ہے اور جو حصول تعلیم کے زمانے میں سرکاری رقم پر گزارہ کرتی ہے اور جس کی تعلیم اس قدر بے سود ہوتی ہے کہ جب وہ اسے حاصل کر چکتی ہے تو وہ فاقہ کرنے یا اپنی تمام باقی زندگی سرکاری امداد سے بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ان خیالات کی بنا پر میں فطرتہً ایسی مجلس کی تمام ذمہ داری سے بری ہونے کا خواہشمند ہوں جسے میں لازماً اس وقت تک نہ صرف بیکار بلکہ مضر سمجھتا ہوں جب تک کہ وہ اپنی کارروائیوں کا سارا طریقہ نہ بدل دے۔

مورخہ ۲؍ فروری ۱۸۳۵ء

ٹی۔ بی۔ میکالے

میں ان خیالات سے جو اس یادداشت میں ظاہر کیے گئے ہیں کامل اتفاق کرتا ہوں۔

ڈبلیو۔ سی۔ بنٹنک

*مجلس تعلیمات عامہ کے نام معتمد کے دو مراسلے مورخہ ۲۱ و ۲۲ جنوری
گزشتہ مع کاغذاتِ محولہ گورنر جنرل ہند بہ اجلاس کونسل نے بغور ملاحظہ فرمائے۔
اول: معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کی یہ رائے ہے کہ برطانوی حکومت
کا بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے باشندوں میں یورپی علوم و فنون
کو ترقی دی جائے اور تمام رقم جو تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے بہترین طور پر
صرف انگریزی تعلیم کے لیے صرف ہو سکتی ہے۔
دوم: لیکن معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کا منشا یہ نہیں ہے کہ ہندوستانی
علوم کا کوئی کالج یا اسکول برخاست کر دیا جائے جبکہ ہندوستانی رعایا
ان فوائد کو جو وہاں موجود ہوں حاصل کرنے کے لیے راغب معلوم ہو اور
معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کا حکم یہ ہے کہ مجلس کے زیر انتظام تمام تعلیم گاہوں
کے کل موجودہ معلمین اور متعلمین اپنے اپنے بھتے اور وظیفے پاتے رہیں۔ لیکن
معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل طلبہ کو اُن کے زمانۂ تعلیم میں مالی امداد دینے
کے طریقے پر جواب تک رائج رہا صریحاً اعتراض کرتے ہیں۔ معزز لارڈ کا خیال ہے کہ
ایسے طریقے کا صرف یہ اثر ہو سکتا ہے کہ اُن علوم کی مصنوعی ترغیب دی جائے جو
واقعات کی قدرتی رفتار میں مفید تر علوم سے مغلوب ہو جائینگے، لہذا لارڈ موصوف کا
حکم یہ ہے کہ مذکورہ تعلیم گاہوں میں سے کسی میں آیندہ جو طالب علم داخل ہو اسے
کوئی وظیفہ نہ دیا جائے، اور جب مشرقی علوم کا کوئی معلم اپنی خدمت ترک کر دے
تو مجلس اس کی جماعت کی حالت و تعداد کی اطلاع حکومت کو دیگی تاکہ حکومت
اس کے جانشین کے تقرر کی واجبیت کا تصفیہ کر سکے۔
سوم: گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو یہ معلوم ہوا ہے کہ مجلس نے مشرقی کتب
کی طباعت میں ایک بڑی رقم صرف کر دی ہے۔ معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل
کا ارشاد یہ ہے کہ اس قسم کے کام میں آیندہ کوئی رقم استعمال نہ کی جائے۔
چہارم: معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کا حکم یہ ہے کہ وہ تمام رقم جو ان

---

*Source.—(ii) Government Resolution, dated 7th March, 1835.

اصلاحات کے باعث مجلس کے زیر تصرف رہیگی آیندہ ہندوستانی باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی ادبیات وعلوم کی تعلیم دینے میں صرف کی جائے اور معززلارڈ بہ اجلاس کونسل کی خواہش یہ ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مجلس بعجلت تمام ایک تجویز حکومت کے سامنے پیش کرے۔*

ان تعلیمی فنون کا جن میں ہر سال اضافہ ہورہا ہے کیا اثر ہوگا؟ ہم انجام پر زور دیتے ہیں کیونکہ ہم پریشان خیال نہیں ہیں۔ ہم معجزات کی توقع نہیں کرتے، ہم فوری اور عاجلانہ تغیرات کی امید نہیں رکھتے بلکہ ہم اعتماد کے ساتھ ایک آخری انقلاب عظیم کا انتظار کررہے ہیں۔ ہم لارڈ ولیم بنٹنک کے قانون کو ایسے سلسلۂ اسباب کا بانی سمجھتے ہیں جو ممکن ہے غیر محسوس طور پر کچھ مدت تک اس طرح عمل کرے کہ سرسری یا اتفاقی طور پر مشاہدہ کرنے والوں کی نظر سے اوجھل رہے لیکن اہم اور عظیم نتیجے کے متعلق یقیناً اس کا عمل برابر جاری رہیگا۔ ان قوانین کی طرح جو اپنی خاموش مگر اٹل قوت کے ساتھ مادی عالم کی حرکات کا انضباط کرتے ہیں یہ تعلیمی امور جو خلاق قوانین کی سی نوعیت اور قوت رکھتے ہیں ترقی پذیر ہوتے جائینگے حتیٰ کہ ان سے ہندوستان کی قومی ذہنیت میں انجام کار ایک عام تغیر پیدا ہو جائیگا۔

لیکن جہاں ہم لارڈ ولیم بنٹنک کے قانون کو اس کی وسعت کے لحاظ سے بہت پسند کرتے ہیں وہاں ہم اس تحریر یادداشت کو ختم کرنے سے پہلے اپنی ذاتی رائے نیز دنیا کے اعلیٰ ترین وشریف ترین مقصد کو حق بجانب قرار دینے کے لیے پرزور طور پر اپنے اس بے لوث ایقان کے اظہار کی اجازت چاہتے ہیں کہ قانون مذکور کافی دوررس نہیں ہے۔ کسی شعبۂ علم میں خواہ وہ ادنیٰ ترین ہو یا اعلیٰ ترین راستی کو غلطی پر فوقیت ہوتی ہے۔ اسی سبب سے

---

*Source.—(iii) Memorandum by Alexander Duff, reproduced in the "Life of Alexander Duff." Vol. I., pp. 200-3. G. Smith. (Hodder & Stoughton.)

ہم اُس شخص کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے ہیں جس نے یہ حکم دیا کہ ہندوستان کی سرکاری تعلیم گاہوں میں جھوٹے ادب، جھوٹے علوم اور جھوٹے مذہب کی بجائے آئندہ سچا ادب اور سچے علوم سکھائے جائیں۔ لیکن جہاں ہم اس امر سے خوش ہیں کہ جو چیزیں صریحاً جھوٹی ہیں ان کی بجائے سچا ادب اور سچے علوم سکھائے جائینگے وہاں ہم یہ اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ واحد سچے مذہب عیسائیت کو اس جھوٹے مذہب کی بجائے قایم کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے جسے ہمارا ادب اور ہمارے علوم لازمی طور پر فنا کر دینگے۔

ہمارا مقولہ یہ رہا ہے، اب ہے اور ہمیشہ رہیگا کہ "جہاں کہیں جب کبھی اور جس کسی کی جانب سے دنیوی مصالح پر عیسائیت کو قربان کر دیا جائیگا وہیں اور اسی وقت انسان کی اعلیٰ نیکی کا خون ہو جائیگا۔" لیکن کیا یہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک عیسائی حکومت ایسے مذہب کی جانب جسے وہ احترام کے ساتھ قایم رکھنے کی ذمہ دار ہے اپنے فرایض سے غفلت برت رہی ہے تو برطانیہ کے عیسائی تبلیغی مرکز بھی اپنے فرایض کو فراموش کر دیں؟ پس ہم کو حالت جمود سے بیدار ہو کر اپنے فرایض کی انجام دہی کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہم بر وقت دانشمندی سے کام کریں تو ہم حکومت ہند کے قانون کو اپنا ممد و معاون بنا لینگے۔ قدیم توہمات کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہم ایک عظیم الشان مشنری کے قیام کو بفضل الٰہی غیر فانی انجیل کی اشاعت کے متعلق جدید سہولتوں کا آغاز خیال کر سکتے ہیں جس سے ایک ادنیٰ بانی کی طرح اُس عظیم تودۂ لغویات کو پاک و صاف کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے جو بصورت دیگر الہامی صدق کے آزادانہ فروغ کی راہ میں مزاحم ہوتا۔ جہاں کہیں سرکاری تعلیم گاہ قایم کی جائے جس کا اثر یہ ہو کہ بت پرستی اور اوہام پرستی کی عمارتیں مسمار ہو جائیں اسی مقام پر ہمیں ایک عیسائی درس گاہ بنانے کے لیے تیار ہونا چاہیے جو برکات الٰہی کی بدولت مذکورہ عمارتوں کے کھنڈروں پر عیسائیت کی خدا خانہ عمارت

قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہوگی۔

اسکاٹلینڈ کے کلیسا نے پہلے ہی سے سرگرمی کے ساتھ میدان عظیم میں قدم رکھ دیا ہے مگر اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے صرف سرحد کو عبور کیا ہے۔ اس نے پہلے ہی سے ایک جرأت آمیز اور فاتحانہ انداز دشمن کے مقابلے میں اختیار کیا ہے مگر اسے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جنگ کی صرف ابتدا ہوئی ہے۔ اسے اٹھنا چاہیے اور عیسیٰ مسیح کا نام لے کر ملک پر قبضہ کرنے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس نے پہلے ہی حکومت کی تعلیمی تجاویز سے مفید کام لینے کے امکان کو ایک مثال پیش کر کے ثابت کر دکھایا ہے۔ جہاں حکومت نے اپنا پہلا انگریزی کالج[1] قائم کیا وہیں اس نے اپنے مبلغین کے قیام کا انتظام کیا اور اپنی اولین عیسائی درس گاہ[2] کی بنیاد رکھی۔ اس درس گاہ میں سرکاری کالج کے بعض لائق ترین افراد بفضل ایزدی سب سے پہلے عیسائی بن گئے جو ہندوستان میں اس کی تبلیغی کوششوں کے اولین ثمر تھے۔

اب پانسہ پھینکا جا چکا تھا اور مغربی علوم کی جیت ہو چکی تھی۔ بہت غور و تامل کے بعد ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں نے اپنے اس مسلمہ طرز عمل میں جو یہاں کے باشندوں کی معاشرتی ترقی میں مداخلت نہ کرنے سے متعلق تھا ایک تغیر عظیم پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسا نظام تعلیم رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو مغربی تصورات اور خیالات کی تعلیم پر مبنی تھا اور اسی فیصلے کے نتیجے کے طور پر ان کی یہ رائے تھی کہ یہ تعلیم زیادہ تر ایک اجنبی زبان کے ذریعے اور اکثر و بیشتر ایک اجنبی قوم کے اساتذہ کے ذریعے دی جائے۔ فی الحقیقت یہ ایک خطرناک تجربہ تھا جو خوفناک امکانات سے لبریز تھا۔ اس کی اہمیت کے متعلق مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ لارڈ مارلے نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ جامعات کا قیام حکومت تاج کے

۱۔ ہندو کالج۔

۲۔ یہ اب اسکاٹش چرچیز کالج ہے۔

انتقال کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم اور اوق امر تھا۔ آج ہندوستانی نظم و نسق کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اتنے زیادہ مباحثے پیدا کرتا ہو اور ایسے مخالفانہ جذبات کا حامل ہو جیسا کہ شعبۂ تعلیمات ہے۔ سوالات اور تحریکات کی تعداد جو شاہی اور صوبہ واری مجلسوں کے سامنے پیش کی گئی تقاریر جو عام جلسوں میں کی گئیں خطوط اور مضامین وغیرہ جو سرکاری اخباروں میں شایع ہوئے سب کے سب اُس دلچسپی کی نمایاں شہادت دیتے ہیں جو ہندوستانی قوم نے اپنی حکومت کی تعلیمی روش کے متعلق ظاہر کی تھی۔ کئی سال قبل سر منری مین نے یہ الفاظ کہے تھے کہ ہر کسی شئے کو دیکھنا ضروری ہے تاکہ اس پر یقین کیا جائے اور میں نہیں جانتا کہ آیا طلبہ کے گروہ جواب نہیں تو جلد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں شمار ہونگے زیادہ تعجب خیز اور نمایاں ہیں یا وہ ذوق و شوق جو انہوں نے ظاہر کیا ہے۔ میں اپنی حدتک تو یہ خیال نہیں کرتا کہ اس قسم کی کوئی حالت کسی یورپی جامعہ نے ازمنۂ وسطیٰ کے بعد سے دیکھی ہو اور مجھے اس میں شبہ ہے کہ آیا کوئی چیز جس کی بنیاد برطانوی حکومت ہند نے رکھی ہو یا جس کا تعلق اس سے ہو ایسی ہے جو کلکتہ سے لاہور تک اعلیٰ تر طبقے کے ہندوستانی گھرانوں میں امتحانِ جامعہ کی بہ نسبت زیادہ سرگرمی پیدا کر سکتی ہے۔"

بہت کم اشخاص اپنے کو اُن خطروں سے غافل ظاہر کر سکتے ہیں جو اس عظیم تغیر سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ پہلے ہی سے ایسے تجربہ کار اشخاص موجود تھے جنہوں نے ان قبائح کو معلوم کر لیا جو مغربی تعلیم کے سلسلے میں رونما ہونگے اور یہ اشخاص نظامِ تعلیم کے جدید تغیر کے باعث سیاسی ہیجان پیدا ہو جانے کا اندیشہ کر رہے تھے۔ لارڈ مٹکاف نے ان خیالات کی مخالفت حسب ذیل یادداشت میں کی:

*مغربی علوم اور سیاسی ہیجان | بہرحال معزز لارڈ[1] علوم کی اشاعت اور

*Source.—Minute of Sir C. Metcalfe, dated May 16, 1835.

(Parliamentary Papers.)

[1] ۔لارڈ ولیم بنٹنک۔

صحافت کے عمل میں مزید خطرہ دیکھتے ہیں۔ میں اپنی حد تک توان اسباب سے یقینی طور پر کسی خطرے کے پیدا ہونے کا تصور نہیں کرتا۔ میں رعایا کی جہالت، مذہبی جوش اور وحشت میں کچھ ایسا خطرہ دیکھتا ہوں کہ مجھے اشاعت علم ہی سے مزید قوت اور حفاظت کی تھوڑی سی توقع ہو سکتی ہے۔ تب رعایا ہماری حکومت کے محاسن و معائب کا اندازہ کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہو سکے گی اور اگر محاسن غالب ہوں تو وہ جان لیگی کہ تغیر سے اس کا نقصان ہوگا۔ کسی کی خیر سگالی پر اعتماد کے بغیر یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں میں سے وہ اشخاص جو ہماری معزولی پر بہت زیادہ لعن طعن کرینگے اور اس میں کم سے کم حصہ لینگے سب سے زیادہ باخبر اور روشن خیال ہونگے بجز اس صورت کے کہ وہ خود انفرادی طور پر اپنے اعلیٰ اقتدار کے خواب دیکھنے لگیں۔ بہرحال اشاعت علم سے اگر کوئی جدید خطرہ محسوس ہوتا ہے (جس کے برخلاف میں اطمینان کے ساتھ پیش گوئی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں) تو وہ ایک ایسا خطرہ ہے جس سے قطعاً گریز نہیں ہوسکتا۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ علم کی اشاعت کریں خواہ نتیجہ کچھ ہی ہو اور اگر ہم نے اس کی راہ میں مزاحمت کی تو بھی وہ اشاعت پذیر ہو کے رہیگا۔ وہ زمانہ گزر چکا جب کہ صحافت کے عمل کو موثر طور پر روکا جا سکتا تھا اگر ایسا تعرض حفاظت کا کوئی ذریعہ ہوسکتا جو لازماً ایک بہت مشتبہ امر ہے۔ اس قسم کی کسی غیر معین چیز پر معقولیت کے ساتھ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا علوم کی ترقی سے اگر خطرے کی زیادتی کا واقعی اندیشہ ہے تو وہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں خوشی سے قبول کرنی چاہیے۔ ہمیں اسے دور کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور اگر ہم نے ایسی کوشش کی بھی تو ہم ناکام رہینگے۔

یہ قرین قیاس ہے جیسا مسٹر ایچ۔ آر۔ جیمس نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم، میکالے کی مشہور یادداشت کی بہ نسبت اس کی انتظامی قابلیت کی زیادہ ممنون احسان ہو۔ مجلس اب اپنے صحیح تعلیمی نظام کے متعلق اختلاف آرا سے نجات پاکر تعجب خیز قوت کے ساتھ کام کرنے لگی۔ لیکن

دو اہم سوال اب بھی قابل توجہ تھے، ایک یہ تھا کہ انگریزی تعلیم کے مدرسے میں دیسی زبانوں کی حیثیت کیا ہوگی اور دوسرا یہ کہ قوم کے کن طبقوں کو انگریزی تعلیم کے فوایدسے متمتع کیا جائے۔ پہلے امر کے متعلق مجلس نے یہ محسوس کیا کہ ہنوز دیسی زبانوں میں ایسی ادبی یا علمی معلومات نہیں ہے جو درسی و اخلاقی تعلیم کے لیے ضروری ہے" لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ قرار دیا کہ دیسی ادبیات کی تشکیل اس کی مساعی کی آخری غرض ہے۔ دوسرے مسئلے کے متعلق مجلس نے یہ طے کیا کہ جدید درس گاہوں میں ہر طبقے کے لڑکے بلا امتیاز شریک کیے جائیں لیکن عملاً اس نے وہ طریق اختیار کیا جسے تعلیم کا "طریقِ ترشیح" کہا گیا ہے۔ پہلے پہل تعلیم کو بالکلیہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں تک اس توقع پر محدود کیا گیا کہ وہ فطری طور پر عوام کے ہادی ہونے کی حیثیت سے ان میں اپنا علم پھیلائینگے۔

***طریق جدید کی تنظیم** ہمیں دیسی زبانوں کی تعلیمی ترغیب کی اہمیت کا کامل احساس ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی ترغیب دہی سے حکم مصدرہ ۷ مارچ ہمیں روکتا ہے اور اسی تعبیر پر ہم نے ہمیشہ عمل کیا ہے۔ اُن مباحثوں میں جو حکم مذکور سے قبل ہوئے تھے دیسی زبانوں کے مطالبات کو تمام فریقوں نے علانیہ اور واضح طور پر تسلیم کر لیا تھا اور جو مسئلہ حکومت کے فیصلے کے لیے پیش کیا گیا تھا وہ صرف ایک طرف انگریزی تعلیم کی اور دوسری طرف مشرقی علمی زبانوں کی تعلیم کی نسبتی خوبیوں سے متعلق تھا۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ "یوربی ادبیات وعلوم"، "محض انگریزی تعلیم" اور "ہندوستانی باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی ادبیات وعلوم کی تعلیم دینا" ایسے فقروں سے صرف یہی مراد ہے کہ مشرقی علوم پر جو سنسکرت اور

*Source.—The first Annual Report of the Committee of Education. Reproduced in Trevelyan's "Education of the People of India," pp. 23-5, 47-9. (Longmans.)

عربی زبانوں کے ذریعے سکھائے جاتے ہیں یورپی علوم کو جو انگریزی زبان کے
ذریعے سکھائے جاتے ہیں اُن ہندوستانیوں کی تعلیم کے بارے میں
ترجیح دی جائے جو ہماری درس گاہوں میں معیاری تعلیم حاصل کرتے ہیں۔
مذکورہ فقروں میں ہمارے مفہوم کے مطابق کوئی حوالہ اس مسئلے کے متعلق
نہیں ہے کہ ایسی تعلیم جسے عوام حاصل کر سکیں آخر کس زبان کے ذریعے دی جائیگی۔
اگر انگریزی ترک کر دی جاتی اور مشرقی علمی زبانیں اختیار کی جاتیں تو بھی
عوام لازماً دیسی زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرتے۔ پس حکومت کے لیے
ہمیشہ زبانوں کا مسئلہ حل کرتے وقت دیسی زبانوں کی طرف توجہ کرنا قطعاً
غیر ضروری تھا اور اسی سبب سے ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی غلط توجہ سے
معقول طور پر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ دیسی ادبیات کی تشکیل ہمارا مطمح نظر ہے جس کے لیے
ہماری ساری کوششیں عمل میں آنی چاہییں۔ بحالت موجودہ دیسی ادبیات کے
افسوسناک فقدان سے اور صرف اسی کے ذریعے معقول تعلیم حاصل
کرنے کا امکان نہ ہونے سے کسی غیر زبان کی وسیع تحصیل جو ہمیشہ ذہن کو
بہت ترقی دیتی ہے لازم ہو گئی ہے۔ پس انگریزی زبان کی تعلیم جسے ترجیح دینے کی
کئی وجوہ ہندوستانیوں کے نزدیک پیدا ہو گئی ہیں نیز اس تعلیم کے
ساتھ ساتھ مغربی علوم کی واقفیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ ہماری
رائے میں اُس عمل کا پہلا درجہ ہے جس کے ذریعے ہندوستان کو روشن خیال
بنایا جائیگا۔ ہندوستانیوں کو خود تعلیم یافتہ ہونا چاہیے قبل اس کے کہ وہ
تعلیم دے سکیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوں انہیں ہمارے
علوم سے خوب واقف کرانا چاہیے قبل اس کے کہ وہ اپنی زبان میں انہیں
منتقل کر سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس قسم کے تراجم کی تعداد ہر سال بڑھتی جائیگی۔
جیسا جیسا یورپی علوم کی فوقیت عام طور پر زیادہ قابلِ قدر ہوتی جائیگی
ویسا ویسا ان کا مطالبہ یقیناً بڑھتا جائیگا اور ہم ایسی عمدہ کتابوں کو
جو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کی جائیں فراخدلی کے ساتھ اپنی درس گاہوں کے

نصاب میں داخل کر کے ان کی قدر افزائی کر سکینگے۔

ہر صوبے کی دیسی زبان کا ایک ایک استاد پہلے ہی سے ہماری کئی درس گاہوں میں مقرر ہو چکا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ یہ طریق عمل جلد عام ہو جائیگا۔ اس اہم شعبۂ تعلیم پر جو توجہ کی جاتی ہے اس کی مقدار کا بطور خود اندازہ کرنے کے لیے ہم نے حصول ذرایع کی کوشش اس طرح بھی کی ہے کہ انگریزی زبان سے دیسی زبان میں یا اس کے برعکس جو بہترین تراجم ہوں وہ ہر سال امتحان کے بعد ہمارے پاس بھیجے جائیں اور اگر وہ مستحق انعام معلوم ہوتے ہیں تو ہماری جانب سے مترجموں کو رقمی انعام دیا جاتا ہے۔

* * * * * *

مجلس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے جدّت پسند تعلیم یافتہ طبقے کے دل و دماغ میں مغربی علوم بھر دیے جائیں تاکہ وہ اپنے باقی ہم وطنوں کے سامنے اپنی زبان میں ان کی ترجمانی کر سکے۔ اس غرض کے لیے جہاں ایک طرف طلبہ کو یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ گوناگوں معلومات کو جو انگریزی ادب میں موجود ہے حاصل کریں اور بہترین انگریزی نمونوں پر اپنے مذاق کی بنا رکھیں وہاں دوسری طرف ہر کوشش اس امر کے لیے کی جاتی ہے کہ انھیں اپنی دیسی زبان میں روانی اور شستگی کے ساتھ لکھنے کی عادت ہو جائے۔

مجلس کی اولین خواہش یہ ہے کہ ہر ضلع کے مستقر پر ایک درس گاہ جو ندکورۂ بالا اصول پر مبنی ہو قایم کی جائے۔ بڑے شہر رفتار ترقی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ ایسے مخصوص افراد جو اپنے حالات کے لحاظ سے مفید اغراض کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی فرصت پاتے ہیں اور اپنی مثال کی تقلید کرانے میں اثر سے کام لیتے ہیں دیگر مقاموں کی بہ نسبت شہروں ہی میں بہ تعداد کثیر جمع رہتے ہیں۔ مالکان اراضی بھی جو اضلاع پر اپنے علاقوں میں رہتے ہیں اپنے صوبے کے بڑے شہروں سے قریبی تعلق قایم رکھتے ہیں جہاں عموماً ان کے شہری مکان اور مقیم کارندے ہوتے ہیں۔

انھیں مقامات سے حکومت کے ذیلی عہدہ داروں کا انتخاب ہوتا ہے اور وہ مضافات میں اپنی خدمات کی انجام دہی کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ یورپی عہدہ دار بھی وہاں موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ درس گاہوں پر عام نگرانی رکھیں اور اپنی اعانت اور تجربے سے اساتذہ کا ہاتھ بٹائیں۔ ان اہم اعضا کے ذریعے دوران خون کی اصلاح کرنے سے کل نظام جسمانی میں تازہ روح پیدا ہو جائیگی، ابتدا میں اس سے دولت مند ذی علم اور کاروباری اشخاص مستفید ہونگے، اساتذہ کی ایک نئی جماعت تربیت پاکر نکلیگی، دیسی زبانوں میں کتابوں کی تعداد بڑھتی جائیگی اور ان وافر ذرائع کی مدد سے ہم اس قابل ہو جائینگے کہ رفتہ رفتہ اپنے دائرۂ عمل کو شہر سے ملک تک اور قلیل تعداد سے کثیر تعداد تک وسیع کر سکیں حتّٰی کہ ہر موضع میں ایک ابتدائی مدرسہ قایم ہو جائے۔ غریبوں کے متعلق مجلس کا ترددامیروں کی بہ نسبت کچھ کم نہیں ہے لیکن جب اس کے اختیاری ذرائع بہت محدود تھے اس وقت تمام طبقوں کے لاکھوں آدمیوں کی تعلیم کا مسئلہ پیش تھا۔ ان میں سے انتخاب کرنا نہایت ضروری تھا اور اسی لیے مجلس نے سب سے پہلے اپنی توجہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی طرف پھیر کر ان کا انتخاب کیا کیونکہ پہلے انہیں تعلیم یافتہ بنانے سے ان کے ذریعے اسی قسم کے فوائد بہت جلد باقی طبقوں تک پہنچائے جا سکتے تھے۔ وہ ہمارے مدرسین، مترجمین اور مصنفین بنینگے جن کے فرائض میں سے کسی کو غریب آدمی اپنے محدود ذخیرۂ علم سے انجام نہیں دے سکتا۔ وہ عوام کے ہادی ہیں۔ پہلے اپنے نظام تعلیم سے انہیں روشناس کرنے پر ہم اس قابل ہونگے کہ چند ہی سال کی مدت میں مناسب کتب اور مدرسین کی کافی تعداد فراہم کر کے اور ملک کی تمام دولت و قوت اپنے حق میں حاصل کر کے ایک ایسا عام نظام تعلیم قایم کر دیں جس کے ذریعے ہر طبقے کا ہر شخص اسی قدر علم حاصل کر سکے گا جس قدر اسے حاصل کرنے کی فرصت ہو۔

جب اس قسم کی تحریک حکام تعلیمات کے طرز عمل کی موئید تھی تو

یہ لازمی امر تھا کہ ابتداً عوام کی ضروریات نظرانداز کر دی جائیں۔ "عمل ترشیح" کی تھوڑی بہت کامیابی طویل و تکلیف دہ مدتِ انتظار کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ کئی سال قبل یعنی ۱۸۳۵ء میں ایک نہایت جفاکش پادری مسٹر آڈم جو ہندوستانیوں اور ان کی زندگی کے طریقوں سے واقف تھا لارڈ ولیم بنٹنگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دیسی تعلیم کے متعلق جو ہندوستانی اساتذہ کے ذریعے دی جاتی تھی اپنے خیالات ظاہر کیے۔ اس کی روداد کے اس حصے سے جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے اس زمانے کے مدارس کی افسوسناک حالت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی اصلاح کے لیے مسٹر آڈم نے جو تجاویز پیش کیں انہیں تقریباً "ناقابل عمل" اور بہت گراں مجلس تعلیمات نے خیال کیا جس کے ارکان کو یہ توقع تھی کہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں میں تعلیم کی ترقی سے مضافاتی دیسی مدارس پر مفید اثر پڑیگا اور مطلوبہ نتائج بروقت برآمد ہونگے۔ ۱۸۴۵ء میں جب تک صوبہ ہائے شمال مشرقی کے لفٹیننٹ گورنر مسٹر تھامسن نے اس مسئلے پر توجہ نہ کی اور عہدہ داران اضلاع کے نام ضروری احکام جاری نہ کیے اس خصوص میں کوئی حقیقی ترقی نہ ہو سکی۔

*دیسی تعلیم: دیسی نصاب

اساتذوں کی معاش کا دار و مدار کلیۃً ان کے شاگردوں پر ہے اور چونکہ ان کی عزت نہیں کی جاتی اور انہیں بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے اس لیے شریف، قابل یا ذی علم اشخاص کو اس پیشے میں داخل ہونے کے لیے کوئی ترغیب نہیں ہے۔ مدارس عموماً بعض معزز ترین ہندوستانی باشندوں کے مکانوں میں یا ان کے بہت قریب قایم ہیں۔ خاندان کے تمام بچے ملکی دیسی زبان میں تعلیم پاتے ہیں اور استادوں کی آمدنی میں اضافہ ہونے کے لیے انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ شریف گھرانوں کے اتنے بچوں کو جتنے وہ قرب وجوار میں فراہم کر سکتے ہیں

*Source.—"Reports of Vernacular Education," by W. Adam. (Calcutta Government Press.)

اپنے شاگردوں کے طور پر مدارس میں داخل کر لیں۔ یہ طالب علم ایک کھردری تختی پر انگلی رکھ کر حروف تہجی پڑھنا شروع کرتے ہیں اور بعد کو یہ حروف زمین پر قلم سے لکھتے ہیں۔ اس طرح یہ مشق آٹھ دس روز تک جاری رہتی ہے۔ اس کے بعد انہیں نرکل کا قلم انگلیوں میں نہیں بلکہ مٹھی میں پکڑ کر تاڑ کے پتوں پر کوئلے کی بنی ہوئی سیاہی سے جو مٹ جاتی ہے حروف علت کو حروف صحیح کے ساتھ ملا کر لکھنا، حروف مرکب، اجزائے لفظ اور لفظ بنانا، پہاڑے، رقمی ہند سے اور ناپ تول کے پیمانے سیکھنا، اشخاص، اقوام اور مقامات کے نام واضح طور پر لکھنے کا صحیح طریقہ معلوم کرنا ان سب چیزوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ عمل تقریباً ایک سال تک جاری رہتا ہے۔ بعد ازاں طالب علموں کو کیلے کے پتوں پر دو دچراغ کی بنی ہوئی سیاہی سے لکھنے اور علم حساب سیکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے جو تقریباً چھ ماہ تک جاری رہتی ہے اور اس مدت میں انہیں جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم نیز مختلف اشخاص کو خطوط لکھنے کے مناسب آداب والقاب کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان مدارس میں سے کسی میں بھی ملکی زبان کے املا کی تحصیل نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض مدارس میں دو تین زیادہ پڑھے لکھے لڑکے ملک کی مشہور ترین نظموں کے کچھ حصے لکھ لیتے ہیں تاہم خود قلمی نسخہ اس قدر مشکل سے دستیاب ہوتا ہے کہ ان لڑکوں کو نہایت مذموم طور پر ہجے کرنے کی مستقل عادت ہو جاتی ہے جس کی اصلاح استاد اپنی ادھوری لیاقت کے باعث نہیں کر سکتا۔

*دیسی مدرسے کا انتظام | سزا کے طریقے:۔ ایک لڑکے کو اس کا چہرہ زمین کی طرف کر کے جھکایا جاتا ہے پھر ایک وزنی اینٹ اس کی پیٹھ پر اور دوسری گردن پر رکھی جاتی ہے اور اگر وہ مقررہ آدھ گھنٹے کی مدت کے اندر ان میں سے کسی ایک کو گرا دے تو اسے بید سے

---

*Source.—Calcutta Review. Vol. IV., p. 384.

سزا دی جاتی ہے۔
ایک لڑکے کو آدھ گھنٹے تک ایک پاؤں پر کھڑے رہنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اگر وہ انقضائے مدت سے قبل ہلے یا تھر تھرائے یا اوپر اٹھا ہوا پاؤں نیچے چھوڑ دے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے۔
ایک لڑکے کو چند لمحوں کے لیے اس کا سر نیچے کی جانب کر کے قریب کے کسی درخت کی شاخ سے الٹا لٹکا دیا جاتا ہے۔
گزنہ پانی میں ڈبو کر ایک لڑکے کے جسم پر مل دیا جاتا ہے جس کے باعث جسم پر خارش اور آماس پیدا ہو جاتی ہے درد بہت ستاتا ہے اور اکثر پورے ایک دن تک رہتا ہے لیکن خارش اور درد خواہ کتنا ہی زیادہ ہو مظلوم کو یہ اجازت نہیں ہوتی کہ آرام کے لیے وہ اپنی جلد کو چھوئے یا سہلائے کیونکہ اسے مزید سزائے تازیانہ کا خوف دلایا جاتا ہے۔
ایک لڑکے کو گزنہ یا بلی یا کسی دوسرے موذی جانور کے ساتھ ایک تھیلے میں بند کر دیا جاتا ہے اور پھر اسے زمین سے گھسیٹا جاتا ہے۔
ایک لڑکے کو خود اپنے کان کھینچنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اگر وہ کافی طور پر کان نہ کھینچے تو اس پر اور زیادہ سخت سزا نازل ہوتی ہے۔
شرارتیں جو مدرسے کے استاد کے ساتھ کی جاتی ہیں:۔ استاد کا حقہ تیار کرتے وقت لڑکوں کی یہ عام شرارت ہوتی ہے کہ تمباکو میں مرچ اور کوئی تیز مصالحہ شامل کر دیتے ہیں کیونکہ جب وہ حقہ پیتا ہے تو اسے سخت ٹھسکا لگتا ہے اور اس پر سارا مدرسہ قہقہے سے گونج اٹھتا ہے یا اس چٹائی کے نیچے جس پر وہ بیٹھتا ہے کانٹے اور گوکھرو بچھا دیے جاتے ہیں جن کا اثر شرمندہ اور خوف زدہ استاد کے پیچ و تاب سے جلد ظاہر ہوتا ہے،
یا رات کے وقت جب کبھی اس کے شاگرد اسے راستے میں جا پکڑتے ہیں تو وہ کنکر، اینٹ یا پتھر اس پر برساتے ہیں یا ذلیل گیت گاتے ہیں جن میں وہ دیوتاؤں سے خصوصاً کالی سے

یہ استدعا کرتے ہیں کہ استاد کو موت کے گھاٹ اتار دے اور یہ عہد کرتے ہیں کہ اگر ان کی استدعا قبول ہوئی تو وہ شکر اور ناریل کا نذرانہ پیش کرینگے۔

گزشتہ ساٹھ سال کا تعلیمی انتظام سنہ ۱۸۵۴ء کے اس مشہور مراسلے میں پیش کیا گیا تھا جو اس زمانے کے صدر مجلس نگران سر چارلس ووڈ[1] کے توسط سے حکومت ہند کو روانہ کیا گیا تھا۔ اس مراسلے کا مقصد یہ تھا کہ یورپی علوم کو باشندگان ہند کے تمام طبقوں میں اس طرح پھیلا دیا جائے کہ اعلیٰ شعبہ ہائے علوم میں انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم ہو اور عوام کی بڑی تعداد ہندوستان کی دیسی زبانوں میں تعلیم پائے۔ اس تعلیم کا انتظام محکمۂ تعلیمات عامہ کے ذمے تھا۔ اعلیٰ علوم کی ترغیب کے لیے جامعات قایم ہونے والی تھیں اور رقمی امداد کے طریقے کے ذریعے خانگی کوششوں اور فیاضیوں سے بدرجۂ غایت فایدہ اٹھانا تھا۔ نظما نے مزید مصارف کی ضرورت کو پوری طرح محسوس کر لیا لیکن انہیں یہ اعتماد تھا کہ جو کچھ صرفہ ان پر عاید ہوگا وہ "ملک کی ترقی سے کافی طور پر وصول ہو جائیگا کیونکہ عام اشاعت علوم کا لازمی نتیجہ زیادہ باقاعدہ عادات، زیادہ محنت، تعیشات زندگی کی رغبت، ان کے حصول کی کوشش اور باشندگان ملک کی روز افزوں خوش حالی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔"*

تعلیمی مسلک کا بیان

۹۔ **مشرقی زبانیں**: ہم ان متعدد ممتاز علمائے مشرق کی قابل تحسین کوششوں کی کامیابی سے ناواقف نہیں ہیں جو انہوں نے ہندو فلسفہ کے بعض حصوں میں بزرگ اخلاق اور زیادہ ترقی یافتہ علوم کے بنیادی مضامین شامل کرنے کے لیے کیں؛ اور ہم ہرگز ان مفید اثرات کی تحقیر نہیں کرنا چاہتے جو اس طرح ہندوستان کے

---

[1] یہ بعد کو لارڈ ہیلی فیکس بن گیا۔

*Source.—Despatch from the Court of Directors to the Governor General in Council. 1854, "Selections from the Records of the Government of india." (Government Press, Calctta.)

تعلیم یافتہ طبقوں پر ان کی زندگی کی مختلف حیثیتوں میں مترتب ہوئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہماری پیش کردہ وجوہ بالا کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ انہیں یورپی مصنفین کے کارناموں سے نیز ہر قسم کے مضامین سے متعلق یورپیوں کی محنت و فکر کے نتائج سے جن کے بموجب انہیں تعلیم دینی ہے واقف کرایا جائے، اور ایسی تعلیم دینے کے ذرائع وسیع کرنا ہر عام نظام تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے۔

۱۷۳۔ ذریعۂ تعلیم، دیسی زبانیں:۔ ہمارا یہ مقصد ہے نہ خواہش کہ ملک کی دیسی زبانوں کی بجائے انگریزی زبان قایم کر دی جائے۔ ہمیں ہمیشہ ان زبانوں کے استعمال کی اہمیت کا بہت زیادہ احساس رہا ہے جو عوام کی بڑی تعداد کی تفہیم کا واحد ذریعہ ہیں۔ یہی زبانیں نہ کہ انگریزی ہم نے فارسی کی بجائے انتظام معدلت کے لیے نیز عہدہ داران حکومت اور عوام کی باہمی مراسلت کے لیے قایم کی ہیں۔ لہذا یہ امر ناگزیر ہے کہ ہر عام نظام تعلیم میں ان زبانوں کی تعلیم پر محنت شاقہ کے ساتھ توجہ کی جائے کیونکہ ترقی یافتہ یورپی علوم سے کثیر تعداد عوام کو واقفیت پیدا کرائی ہو تو وہ محض انہیں دیسی زبانوں میں سے کسی ایک کے ذریعے کرائی جا سکتی ہے۔

۱۷ او ۱۸۔ تعلیمی انتظام:۔ ہم نے ہندوستان کے مختلف احاطوں میں نظم و نسق حکومت کے ایک جزو کی حیثیت سے ایک محکمۂ تعلیمات قایم کرنے کا مصمم قصد کر لیا ہے، چنانچہ ہماری یہ تجویز ہے کہ ہر پریسیڈنسی اور لفٹیننٹ گورنری کے لیے ایک عہدہ دار متقرر کیا جائے جس کے ذمے خاص کر تعلیمی معاملات کا انتظام رہیگا اور جو اپنے طرز عمل کے متعلق حکومت کے نزدیک براہ راست جوابدہ ہوگا۔ ایک موزوں طریق معائنہ بھی مستقبل میں ہمارے نظام تعلیم کا ایک لازمی جزو ہوگا اور ہماری خواہش یہ ہے کہ مہتمان تعلیمات کی ایک کافی تعداد مقرر کی جائے۔

۲۵۔ جامعات:۔ مجلس تعلیمات نے اس تحریک میں جس کا حوالہ ہم نے دیا ہے جامعۂ لندن کو اپنی اغراض کے لیے بطور نمونہ منتخب کیا ہے

اور ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ مذکورہ جامعہ کی تشکل تنظیم اور کارگزاری ہندوستان کی ضروریات کے ساتھ بہترین مناسبت رکھتی ہے اور اس کی تقلید مفید ہو سکتی ہے گو تفصیلات میں بعض تغیرات لازم ہونگے۔

۴۱ و ۴۲۔ عوام کی تعلیم:۔ اب ہماری توجہ ممکنہ حد تک ایک ایسے معاملے کی طرف منعطف ہونی چاہیے جو نسبتاً زیادہ اہم ہے اور جس سے متعلق ہمیں لازماً اعتراف ہے اب تک بہت زیادہ غفلت برتی گئی یعنی یہ کہ مفید اور کارآمد علوم جو زندگی کی ہر منزل کے لیے موزوں ہوں کس طرح عمدگی کے ساتھ عوام کی اُس کثیر تعداد تک پہنچائے جا سکتے ہیں جو اپنی مجرد کوششوں کے ذریعے کوئی قابل قدر تعلیم حاصل کرنے سے بالکل قاصر ہے، لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ اس مقصد کی جانب آئندہ زیادہ خصوصیت کے ساتھ حکومت کی عملی تدابیر کا رخ دیکھیں اور اس کے حصول کے لیے ہم مصارف کے معتدبہ اضافے کو منظور کرنے پر آمادہ ہیں۔

ایسے مدارس ہندوستان کے ہر ضلع میں موجود ہونے چاہییں جن کا مقصد یہ نہ ہو کہ چند نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے بلکہ یہ ہو کہ موجودہ حالات کی بہ نسبت زیادہ مواقع ایسی شائستہ تعلیم کے حصول کے لیے مہیا کیے جائیں جس کے ذریعے تعلیم یافتہ اشخاص زندگی کی ہر حیثیت میں سوسائٹی کے زیادہ مفید ارکان بن سکیں۔ ان مدارس کی نگرانی مسلسل اور محتاط طور پر ہونی چاہیے اور ان کے طلبہ کو دیگر مدارس میں ایسے وظائف مقرر کر کے تعلیمی ترغیب دی جا سکتی ہے جو ان میں سے بہترین طلبہ کو بطور صلۂ قابلیت عطا کیے جائیں گے۔

۵۱ و ۵۲۔ رقمی امداد:۔ اس امر کے عدم امکان کے لحاظ سے کہ ہندوستانی باشندوں کی تعلیم کے کافی ذرائع مہیا ہونے کے لیے جو کچھ کیا جانا چاہیے وہ تنہا حکومت ہی کرے نیز اس امر کے لحاظ سے کہ نقد رقمی امداد کوششوں سے حاصل کی جا سکتی ہے مگر ان کی ترغیب سلطنت کی جانب سے اب تک نہیں دی گئی ہم اس لازمی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس خصوص میں ہندوستان کی

ضروریات کی فراہمی کا مفید ترین طریقہ یہ ہوگا کہ حکومت کے ذریعے اس امداد کو جاری رکھا جائے جو تعلیم یافتہ اور دولت مند باشندگان ہند اور دیگر نیک نہاد اشخاص کی کوششوں اور فیاضیوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

لہذا ہم نے ہندوستان میں رقمی امداد کا طریقہ اختیار کرنے کا تصفیہ کیا ہے جو اس ملک میں بہت بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رہا ہے اور اس طرح سرکاری رقوم کے علاوہ مقامی ذرایع سے امداد حاصل کرنے کی بنا پر ہم اطمینان کے ساتھ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ تعلیم کی رفتار ترقی اس ترقی کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہو جائیگی جو حکومت کی جانب سے محض اضافہ مصارف کی صورت میں ظاہر ہوگی نیز مذکورہ طریقے سے مزید فایدہ یہ حاصل ہوگا کہ مقامی اغراض کے لیے مقامی جد و جہد اور اتحاد پر اعتماد کرنے کی قوت نشو و نما پاتی رہیگی جو خود بنفسہ کسی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کم اہم نہیں ہے۔

۴۳۔ تعلیم نسواں:۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں کی اہمیت کے متعلق مبالغے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ہم نے مسرت کے ساتھ اُن آثار کا مشاہدہ کیا ہے جو متعدد باشندگان ہند اپنی دختروں کو عمدہ تعلیم دینے کی روز افزوں خواہش سے ظاہر کر رہے ہیں۔ اس ذریعے سے قوم کی تعلیمی اور اخلاقی حالت میں مردوں کی تعلیم کی بہ نسبت ایک بہت زیادہ موزوں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے پہلے ہی بیان کر دیا ہے کہ زنانہ مدارس اُن مدارس میں شامل ہیں جنہیں رقمی امداد دی جا سکتی ہے اور ہم اُن کوششوں سے جو اس خصوص میں کی جا رہی ہیں اپنی دلی ہمدردی ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۴۴۔ مذہب:۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کے متعلق ہماری جو رائے ہے اس کی نسبت بہت غلط فہمیاں موجود ہیں۔ یہ درس گاہیں ہندوستان کی کل آبادی کے فایدے کے لیے قایم کی گئیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ لازم تھا اور ہے کہ جو تعلیم ان درس گاہوں میں دی جائے وہ قطعی دنیوی ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انجیل کالجوں اور مدرسوں کے کتب خانوں میں

رکھی گئی ہے اور طلبہ بلا مزاحمت اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ عمل ایسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں ہماری خواہش یہ نہیں ہے کہ ہم ایسی تشریحات کو ممنوع قرار دیں یا ان سے بیزاری کا اظہار کریں جو عیسائی مذہب کے معاملے کے متعلق طلبہ اپنے استادوں سے بطور خود دریافت کریں بشرطیکہ ایسی معلومات مدرسے کے غیر اوقات میں مہیا کی جائے۔ چونکہ اس قسم کی تعلیم دونوں جانب سے بالکل اختیاری ہوگی اس لیے اس اقل بدگمانی کو بھی روکنے کے لیے کہ ہم انہیں عیسائی بنانے کی غرض سے حکومت کے اثر کو کام میں لانے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ لازم ہے کہ اس معاملے کی طرف مہتمان تعلیمات اپنے مقررہ معائنوں کے وقت کوئی توجہ نہ کریں۔
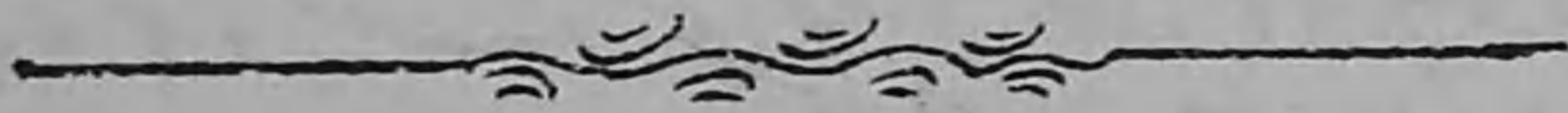
ساتواں باب

صحافت کی آزادی

یہ فطری بات تھی کہ مغربی علوم اور تخیلات کے وارد ہوتے ہی ہندوستانی زندگی میں عام صحافت کو بڑا دخل ہو جائے۔ اس مسئلے کے متعلق جو پہلے بھی پیش تھا اور اب بھی ہے کہ حکومت کو صحافت پر کس حد تک نگرانی رکھنی چاہیے آرا میں وسیع اختلافات ہیں۔ پہلا ہندوستانی اخبار موسوم بہ "ہکیز گزٹ" ۱۷۸۱ء میں شائع ہوا۔ مسٹر سدرلینڈ[1] کی شہادت کے مطابق جو ۱۸۳۲ء میں مجلس منتخبہ کے روبرو دی گئی تھی صحافت "سرکاری عہدہ داروں پر حملے کرنے میں سختی بلکہ کمینگی کی حد تک پہنچ گئی تھی"۔ لیکن ان قیود کے سوا جو قانون انگلستان کی رُو سے آزادیٔ صحافت پر عاید کی گئی تھیں مزید قیود غیر ضروری سمجھی گئیں۔ ہندوستانی صحافت پر سب سے پہلے مارکوئیس آف ولزلی نے فرانس کے ساتھ جنگ کے نازک زمانے میں احتساب قائم کیا۔ اولین ضوابط نے اخباروں کو

---

[1] ملاحظہ ہو مسٹر وارڈن رکن مجلس بمبئی کی شہادت جو ۳۰ اپریل ۱۸۳۲ء کو مجلس منتخبہ کے روبرو دی گئی تھی۔

عام احکام یا بحری خبروں اور جہازوں کی آمد و رفت کی اطلاعات شائع کرنے سے منع کر دیا۔ مقصود یہ تھا کہ تجارت اور سلطنت کے مفاد کو ہمارے دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے۔ ہندوستانی سمندر اس زمانے میں فرانسیسی قزاقی جہازوں سے بھرے ہوئے تھے اور یہ انکشاف ہوا کہ جہازوں کے متعلق جو اطلاعیں اخبار میں طبقے کی دلچسپی کے لیے درج کی جاتی تھیں وہ ہر اس مقام تک پہنچائی جاتی تھیں جہاں ان جہازوں کے افسر ہوتے تھے جنہیں ان اطلاعوں سے اس امر کا موقع ملتا تھا کہ تجارتی جہازوں کو راستے میں روک لیں اور برطانوی محافظ جہازوں سے بچ نکلیں'' ۱۸۲۳ء میں مسٹر آدم نے جو گورنر جنرل کی حیثیت سے عارضی طور پر لارڈ ہیسٹنگز کا جانشین ہوا صحافت کی نگرانی کے متعلق سخت ترین ضوابط نافذ کیے۔ ہر اخبار حکومت سے اجازت نامہ حاصل کر کے شائع کرنا پڑتا تھا جو کسی امر کی تحقیقات یا اطلاع کے بعد یا اس کے بغیر حکومت کی صوابدید پر منسوخ ہو سکتا تھا۔ معتمد حکومت کا یہ فرض تھا کہ وہ حکومت کے طرز عمل پر ''ناگوار'' نکتہ چینی کو روک دے۔

مسٹر وارڈن کو جس نے یہ مشکل کام پندرہ سال کی مدت تک بمبئی میں انجام دیا تھا ایک موقع پر جبکہ اس نے لارڈ کارنوالس کے گورنر جنرل مقرر ہونے کی اطلاع اخباروں میں شائع کرنے کی اجازت دی تھی لارڈ ولزلی نے اس بنا پر سرزنش کی تھی کہ حکمرانوں کے قریب الوقوع تبدل کے قبل از وقت اظہار سے اہم معاملات کے درہم برہم ہو جانے کا امکان تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی قسمت میں اکثر یہ رہا ہے کہ جب کبھی وہ کسی جمعے کی صبح کو ''قریب کے جزیرہ سلسٹی میں دفتر کی تکان دور کر کے کچھ آرام پانے کے لیے جاتا'' تو وہ بمبئی واپس طلب کیا جاتا تاکہ وہ دار العوام کی اُن تقریروں کو شائع نہ ہونے دے جن میں مقتدر حکام ہند کے اختیار کردہ طرز عمل پر سخت نکتہ چینی ہوتی تھی۔ یہ امر کہ حکومت سخت سے سخت سزا دینے میں تامل نہیں کرتی تھی ذیل کی مراسلت سے واضح ہے:۔

* * * * * *

صحافت پر سخت نگرانی* (۱)

بنجدمت مسٹر ولیم آدم و مسٹر ولیمز ہالکرافٹس مالکان "کلکتہ کرانیکل"

محکمۂ امور عامہ
کونسل چیمبر - ۳۱ مئی ۱۸۲۷ء

حضرات!

"کلکتہ کرانیکل" کے مضامین کا عام طرز گزشتہ کچھ مدت سے حکومت اور معزز مجلس نظما کے ساتھ نہایت تحقیر آمیز ہے اور خصوصاً ۲۹ تاریخ ماہ حال کے پرچے میں کئی فقرے صحافت سے متعلق ضوابط کی عین خلاف ورزی میں لکھے گئے ہیں، لہٰذا مجھے آپ کو یہ اطلاع دینے کی ہدایت ہوئی ہے کہ کونسل کے معزز نائب صدر نے یہ تصفیہ فرمایا ہے کہ جو اجازت نامہ ۲۵ جنوری گزشتہ کو اخبار "کلکتہ کرانیکل" طبع اور شائع کرنے کے متعلق آپ کو دیا گیا تھا وہ منسوخ کر دیا جائے چنانچہ اسے بذریعۂ ہذا آج کی تاریخ سے منسوخ کیا جاتا ہے۔

الطاعت کیش
سی۔ لشنگٹن
اعلیٰ معتمد حکومت

بدقسمت مالکان اخبار نے جواب میں حکومت سے یہ استدعا کی کہ وہ مخصوص مضامین بتائے جائیں جو اس کی اس سخت ناراضی کے اظہار کا باعث ہوئے ہیں اور اس امر پر زور دیا کہ انہیں کوئی راست تنبیہ نہیں کی گئی تھی۔

(۲)

محکمۂ امور عامہ
کونسل چیمبر - یکم جون ۱۸۲۷ء

---

*Source.—Minutes of Evidence before Select Committee, 1832.

جناب من،
آپ کا خط و یروزہ حکومت کے ملاحظے میں پیش کیے جانے پر مجھے آپ کو یہ اطلاع دینے کی ہدایت ہوئی ہے کہ کونسل کے معزز نائب صدر کے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ان قابل اعتراض فقروں کے متعلق جو ۲۹ تاریخ ماہ گزشتہ کے "کلکتہ کرانیکل" میں درج تھے میرے مراسلۂ دیروزہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے زیادہ مخصوص طور پر ان کا ذکر کیا جائے۔

۲۔ مجھے یہ بھی ظاہر کر دینے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ آپ کے خط کے باقی حصے کا کوئی جواب اس کے سوا ضروری نہیں ہے کہ جو تنبیہیں عام طور پر دوسرے مدیران اخبارات کو دی گئی تھیں وہ آپ کی اطلاع کے لیے کافی تھیں اور یہ کہ حکومت "کلکتہ کرانیکل" کی اشاعت جاری رکھنے کے متعلق آپ کو اجازت دینا مناسب نہیں سمجھتی۔

اطاعت کیش
سی لشنگٹن
اعلیٰ معتمد حکومت

"کلکتہ کرانیکل" اور دیگر اخبارات کی نسبت حکومت کا طرز عمل ایک حد تک جابرانہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں صحافت پر نگرانی کی ضرورت تھی جس کی پُرزور نائید ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن جس نے "بمبئی گزٹ" کے مدیر مسٹر فیر کو جلاوطن کر دیا اور سر تھامس منرو جیسے آزاد خیال مدبروں نے کی۔ موخرالذکر نے اس پر زور دیا کہ آزاد صحافت سے ترقی ملک میں [illegible] اندازی ہوگی اور بآسانی فوج میں عام بغاوت ہو سکیگی جس میں عوام کی جماعت عظیم بھی شریک ہو جائیگی۔

اگر صحافت آزاد ہو تو ہم	*ہندوستان میں آزاد صحافت کے خطرات

*Source.—(i) Evidence of Mountstuart Elphinstone before the Select Committee. Dated August 5, 1832.

ایک ایسی حالت میں مبتلا ہو جائینگے جس کا تجربہ اب تک کسی سلطنت کو نہ ہوا ہوگا۔ دوسرے ممالک میں صحافت، ملک کی اصلاح اور عوام کی ذہنیت کے ساتھ ساتھ بتدریج ترقی پاتی گئی ہے لیکن ہمیں بیک وقت یورپ کے زیادہ ترقی یافتہ نظریات اور ایشیا کے تعصبات و مذہبی جذبات کا مقابلہ کرنا پڑیگا اور یہ دونوں چیزیں اُن اشخاص کی ادھوری تعلیم کے باعث جن سے ہر معاملے میں خطاب کیا جائیگا زیادہ مہیب ہو جائینگی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک اجنبی حکومت جو علانیہ تلوار کے زور سے قائم کی گئی ہو مذکورہ حالات میں اپنی جگہ پر مدت دراز تک برقرار رہ سکتی ہے؟

* میں اس ملک میں آزاد صحافت کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم نے اپنی قوت کو جس اصول پر قائم رکھا ہے اس کی رُو سے رعایا کو کبھی آزادی رہی ہے نہ آیندہ کبھی دی جا سکتی ہے۔ میں رعایا کے امن و امان اور حکومت کے قیام کے لیے یہ لازم سمجھتا ہوں کہ تمام موجودہ قیود جاری رکھی جائیں۔ اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں صحافت کی انتہائی آزادی کو ترجیح دیتا لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لیے کوئی چیز اس آزادی سے زیادہ خطرناک نہیں ہو سکتی مفید معلومات رعایا میں پھیلانے اور بہتر حکومت کی طرف مائل رہنے کی بجائے وہ رعایا میں عدول حکمی، بغاوت اور پریشانی پیدا کر دیگی۔۔۔۔ آزاد صحافت اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں اور مل کر زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتیں۔ کیونکہ اس سوال کا کہ آزاد صحافت کا پہلا فریضہ کیا ہے جواب یہ ہے کہ ملک کو اغیار کی حکومت سے آزاد کیا جائے اور اس ایک مقصد عظیم کے لیے دیگر تمام کم اہم امور کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہی نتیجہ لازمی طور پر پیدا ہوگا اگر ہم فی الواقع صحافت کو ہندوستانیوں اور یورپیوں دونوں کے لیے آزاد کر دیں۔

---

*Source.—(ii) "Memoir of Sir Thomas Munro." Dated 12th April, 1822.

آزاد صحافت کے حامیوں کا بیان یہ ہے کہ وہ ہمارے نظام حکومت ہند کی بہتر ہندوستانیوں کی حالت اور ان کے دل و دماغ کی اصلاح چاہتے ہیں لیکن یہ پسندیدہ مقاصد مجھے یقین ہے ان کے تجویز کردہ ذرایع سے قطعاً حاصل نہیں ہو سکتے۔ دو اہم امر ہیں جو ہمارے یہاں کے معاملات کے انتظام میں ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہییں۔ پہلا امر یہ ہے کہ ہماری حکمرانی طویل سے طویل زمانے تک قائم رہنی چاہیے اور دوسرا یہ کہ جب کبھی ہم اس سے سبکدوش ہونے پر مجبور ہوں تو ہم ہندوستانیوں کو باہمی تعلق کے اثر سے ایسی ترقی یافتہ حالت میں چھوڑیں کہ وہ بطور خود ایک آزاد یا کم سے کم باقاعدہ حکومت قائم کرنے کے قابل ہوں۔ اگر اس مقصد کی کبھی تکمیل ہو سکتی ہے تو وہ صرف مشروط صحافت کے تحت ممکن ہے۔ آزاد صحافت اس مقصد کے حصول میں سہولت پیدا کرنے کی بجائے اسے بالکل ناقابل عمل بنا دیگی کیونکہ عملِ اصلاح میں عجلت کرنے سے اُن تمام فوائد کا خاتمہ ہو جائیگا جو زیادہ محتاط و معتدل کارروائی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ایسی قیود جیسی کہ تجویز کی گئی ہیں ہندوستانیوں میں علوم کی ترقی کو نہیں روکینگی بلکہ اسے اپنی حقیقی رفتار پر چھوڑ کر اور فوجی فساد و شورش سے محفوظ کر کے اس کی ضامن ہو جائینگی۔ اس کی حقیقی رفتار یہ نہیں ہے کہ اخبار اور رسالے اُن ہندوستانیوں میں گشت کرائے جائیں جو یوریپیوں کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے ہوں بلکہ یہ ہے کہ تعلیم آہستہ آہستہ عوام کی ساری جماعتوں میں پھیلائی جائے اور اخلاقی و مذہبی تعلیم کی اشاعت قوم کے ہر طبقے میں کی جائے۔ آزادی اور سوراج کی خواہش جو ہر ملک میں علوم کی ترقی کے ساتھ ہی ظاہر ہوتی ہے عوام میں پیدا ہونی اور پھیلنی چاہیے قبل اس کے کہ وہ فوج تک پہنچے، اور اس میں کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ہندوستان میں عام ہو کر رہیگی بشرطیکہ ہم اسے غیر موزوں عجلت سے ایسے تغیرات کو جن کے لیے لازماً پشت ہا پشت چاہییں چند ہی سال میں بروئے عمل لانے کی کوشش کر کے

نذر و کیں۔ مہر آمیز و منصفانہ حکومت کرنے ہیئے ہندوستانیوں میں مفید کتب
کی اشاعت کو ان کے مذاہب پر حملے کیے بغیر فروغ دیتے ہوئے ان کے
متعدد مدارس کی حفاظت کرتے ہوئے ایسے مدارس کی جہاں بہتر بن نظام تعلیم
قایم ہے اعزازی یا مالی امتیازات کے ذریعے قدر افزائی کرتے ہوئے ایسے اشخاص
کو جو امداد کے محتاج ہوں محاصل ملکی کی کچھ رقم کبھی کبھی بھتے کے طور پر دینے سے
اور سب سے مقدم یہ کہ ہندوستانیوں کے دل و دماغ کی اصلاح کی محنت
برداشت کر کے انہیں ملک کے دیوانی نظم و نسق میں ایک بڑا حصہ دینے اور
حصول علم کی ترغیب کے طور پر انہیں اعلیٰ خدمات و مناصب پر مامور کرنے کی
توقع دلانے سے ہم بتدریج توہمات کو مٹا سکتے ہیں اور ہندوستان کے
باشندوں میں وہ تمام ترقی یافتہ خیالات اور نظریات پیدا کر سکتے ہیں جو
ہمارے ملک میں رائج ہیں۔

اگر ہم متضاد طریقہ اختیار کریں۔ اگر ہم چند یورپی مدیران اخبارات
کے محض نفع کی خاطر ایک بے لگام صحافت کو ہندوستانیوں کے درمیان
یورپی کردار و اقتدار کی بالکلیہ تحقیر کرنے کی اجازت دیں تو گویا ہم اپنی ہندوستانی
افواج میں اضطراب کا بیج بوئینگے اور بغاوت کے خدشے سے کبھی محفوظ
نہ رہینگے۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی موجودہ فہم کی
بہ نسبت زیادہ سمجھ دار ہو جائیں یا افراد و اقوام کے حقوق سے واقفیت
حاصل کریں۔ جو کچھ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ان کے دلوں سے ان کے
سرداروں اور یورپی کردار کا موجودہ احترام عظیم محو ہو جائے اور بہ صورت
جب کبھی پیش آئیگی تو وہ اپنے ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ
قوت اور مال غنیمت کے لیے ہمارے خلاف کھڑی ہو جائینگی۔ ہم ایک ایسی
آزمائش کر رہے ہیں جو دنیا میں آج تک کبھی نہیں کی گئی یعنی ایک غیر ملک پر
دیسی فوج کے ذریعے حکومت کر رہے ہیں اور اس فوج کو آزاد صحافت
کے ذریعے یہ سکھا رہے ہیں کہ ہمیں خارج کر کے اسے اپنے ملک کو آزاد کرنا چاہیے۔
صرف ہندوستانیوں کے متعلق ہی صحافت کو خوف کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے

اور صرف اسی وقت جب وہ ہماری ہندوستانی افواج میں شورش پیدا کردیگی اس کے خطرناک اثرات محسوس ہونگے۔ بہت سے اشخاص غالباً ہندوستانی صحافت کی کوششوں کی خوب مدح سرائی کرینگے اور بہت آرزو کے ساتھ ہندوستانیوں میں عاجلانہ اشاعت علوم کی امیدیں باندھینگے، لیکن اس کے برخلاف اسی صحافت کی بنا پر ایک ایسے انقلاب عظیم کی تیاری ہو رہی ہے جو ہمارے اقتدار کو زور کے ساتھ قبل از وقت برخاست کرکے تمام مذکورہ امیدوں پر پانی پھیر دیگا اور ہندوستان کو ایسی ناقابلِ اصلاح حالت میں ڈال دیگا جو اُس حالت کی بہ نسبت جسے ہم نے ابتدا میں دیکھا تھا زیادہ خستہ ہوگی۔

مذکور بالا آرا کے نظر کرتے اُن اخبارات کی سرکاری فہرست کو یہاں درج کرنا جو اس زمانے میں آبادی کے تین اہم مرکزوں سے شائع ہوتے تھے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

* مطبوعات ہند ۱۸۳۱ء کے اوائل میں

کلکتہ

روزنامے:- انگریزی اخبار	ناشر
بنگال ہرکورو اینڈ کرانیکل	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
جان بل	جیو۔ پرٹ چارڈ
انڈیا گزٹ	جے۔ بی۔ اسکاٹ اینڈ کمپنی
انھیں ناموں کے سہ روزہ اخبار:-	
انڈیا گزٹ	جے۔ بی۔ اسکاٹ اینڈ کمپنی
بنگال کرانیکل	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی

*Source.—Evidence of James Sutherland before the Select Committee of 1832.

دو روزہ اخبار :-	
گورنمنٹ گزٹ	جی ۔ ایچ ۔ ہٹمن
بنگال ہیرلڈ	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
کلکتہ لائبریری گزٹ	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
اورینٹل آبزرور	جیو ۔ پرٹ چارڈ
دیسی اخبار :-	
جام جہاں نما	ہری ہر دت
سماچار چندریکا	بھوانی چرن بنرجی
سمبد تیمیر ناشک	کشنو موہن داس
بنگا دوت	بھولو ناتھ سین
سمبد کومودی	گوبند چٹرجی
ماہواری رسالے :-	
کلکتہ میگزین	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
گلیننگس آف سائنس	ڈبلیو ۔ تھیاکر اینڈ کمپنی
کیلی ڈاسکوپ	جے ۔ جے ۔ فلیوری
کرسچین انٹیلیجنس	جے ۔ چ ۔ مشن پریس
سہ ماہی رسالے :-	
بنگال آرمی لسٹس	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
آرمی لسٹ ایچ ۔ ایم ۔ فورسس ان انڈیا	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
کلکتہ کوارٹرلی رجسٹر	جے ۔ بی ۔ اسکاٹ اینڈ کمپنی
سال نامے :-	
بنگال اینول	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
بنگال سوونیر	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
بنگال المیناک	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
کمپینین اینڈ اکس ٹو بنگال المیناک	سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی

بنگال ڈائرکٹری — سیموئل اسمتھ اینڈ کمپنی
کلکتہ ڈائرکٹری — جے۔ بی۔ اسکاٹ اینڈ کمپنی

مدراس میں تین انگریزی اخبار شایع ہوتے تھے: (۱) گورنمنٹ گزٹ (۲) مدراس گزٹ اور (۳) مدراس کوریر۔ بمبئی میں دو اخبار تھے: (۱) ڈیلی گزٹ اور (۲) کوریر۔

"ہرکورو" کی روزانہ اشاعت کی تعداد تقریباً آٹھ سو تھی اور قیمت سات آنے۔ بنگال میں لارڈ ولیم بنٹنک نے ڈاک کے محصول میں بہت ہی تخفیف کر دی تھی۔ دو مقررہ شرحیں تھیں۔ (۱) حد معینہ کے اندر کے تمام مقامات کے لیے دو آنے اور (۲) اس حد کے باہر کے تمام مقامات کے لیے چار آنے۔ مدراس اور بمبئی میں ڈاک کی شرحیں نسبتہً بہت زیادہ تھیں۔ مثلاً مدراس سے کلکتہ تک ایک اخبار کے لیے ڈاک کا محصول ایک روپیہ چودہ آنے تھا۔

مسٹر آڈم کے قانون صحافت کی سختی سے نیز اس کامل پابندی سے جس کے ساتھ اس کی شرائط کی تعمیل کرائی گئی انگریز اور ہندوستانی دونوں طبقوں کے عوام میں بڑے غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا۔ رام موہن رائے نے موخرالذکر طبقے کی صدائے احتجاج میں نمایندگی کی اور دیسی صحافت کی تائید میں ایک یادداشت پیش کی جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

*آزاد صحافت کے فواید

یادداشت سے برطانوی حکومت کے ساتھ ہندوستانیوں کی وفاداری اور دلبستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے کروروں روپیے کی رقم حکومت کے سپرد کر دی ہے۔ زمینداروں نے حکومت پر اعتماد کر کے اپنے علاقوں کو

---

*Source.—Summary of Ram Mohan Roy's Memorial, reproduced in S.D. Collet's "Life and Letters of Raja Ram Mohan Roy." (Harold Collet.)

کمزور کرنے کی بجائے جیسا وہ پہلے کیا کرتے تھے اب انہیں ترقی دی ہے۔ انہوں نے نپولین کے معرکوں کے زمانے میں برطانیوں کی فتح کے لیے دعا کی تھی۔ وہ ادبی و سیاسی اصلاحات سے جو برطانوی اثر کے باعث عمل میں آئیں مسرور ہوئے ہیں۔ وہ کلکتہ میں جہاں برطانوی راج کی خوب شہرت ہے سب سے زیادہ وفادار ہیں۔ وہ کم تر محاصل کے ساتھ ساتھ ملکی اور مذہبی معاملات میں آزاد رہ کر برطانیہ نژاد اور عایا سے کچھ کم وفادار نہیں ہیں۔ ان اداروں میں جو ہندوستانیوں کی ذہنیت کی اصلاح اور ان کی حالت کی بہتری کی طرف متوجہ تھے ہندوستانی صحافت بھی تھی خصوصاً چار ہندوستانی اخباروں کی طباعت جن میں سے دو فارسی میں تھے اور دو بنگالی میں۔ ان اخباروں نے حکومت کی تحقیر کرنے یا اختلاف بڑھانے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔" ہندوستانی مصنفوں اور مدبروں نے ہمیشہ اپنے کو" ایسے مضامین کی اشاعت سے" باز رکھا ہے" جو حکومت کے حق میں مضر ہوں۔ بریں ہمہ قانون نافذ کر دیا گیا ہے جس میں تمام اخبارات کے ساتھ ایسے اجازت نامے کی شرط لگا دی گئی ہے جو حکومت کی صوابدید پر منسوخ ہو سکتا ہے۔

مزید براں یادداشت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جدید قانون سے ایک خاص قسم کی معلومات کی اشاعت کا" کامل انسداد" ہو جائے گا۔ واقف کار ہندوستانی برطانوی حکومت کے قابل ستائش نظام کی خوبیاں عوام کو سمجھانے سے قاصر رہینگے۔ ہندوستانی اشخاص حکومت کو اُن غلطیوں اور ناانصافیوں کی اطلاع دینے سے محروم رہ جائینگے جو اس کے انتظامی عہدہ داروں کی جانب سے ملک کے مختلف حصوں میں ظہور پذیر ہوں۔ ایسے حق سے محروم کر دیے جانے کے بعد جس کا ناجائز استعمال انہوں نے نہیں کیا آیندہ ہندوستانیوں کا برطانوی پناہ کے مخصوص حق پر فخر کرنا درست نہ ہو سکیگا۔ لیکن برطانوی حکومت یقیناً ایشیائی مطلق العنانی کی مثال کی تقلید اس توقع پر نہ کریگی کہ عوام کو جہالت میں

مبتلا رکھنے سے اقتدار برقرار رہیگا۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک عمدہ حکومت اس وقت قوی تر بن جاتی ہے جبکہ اس کی رعایا زیادہ روشن خیال ہوتی ہے۔ ہر نیک حاکم کو جو انسانی کمزوریوں سے واقف ہو اور دوامی حاکم کا احترام دل میں رکھتا ہو اس امر سے آگاہ ہونا چاہیے کہ ایک بڑی سلطنت کے انتظام میں غلطی کے سرزد ہونے کا امکان ہے اور نتیجۃً جو شکایات پیدا ہوتی ہیں ان کی تحقیق کے فوری ذرائع کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لیکن واحد موثر ذریعہ "مطبوعات کی غیر مشروط آزادی" ہے جو ملک کے باقاعدہ قانون کے تحت ہو۔

محولِ بالا یادداشت صدر عدالت کے سامنے پیش کی گئی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی، لہٰذا ایک دوسری یادداشت جو رام موہن رائے ہی نے مرتب کی تھی ملک معظم باجلاس کونسل کے ملاحظے میں پیش کی گئی۔ حکومت وقت نے یہ فیصلہ کیا کہ اُن جدید انتظامات کو بدلنا جو حال میں مسٹر آڈم نے جاری کیے ہیں خلاف عقل ہوگا لیکن جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا اُس سختی میں جس سے قانون کی تعمیل کرائی جاتی تھی معتدبہ کمی ہوتی گئی۔

ان تلخ حملوں کے باوجود جو عام صحافت میں لارڈ ولیم بنٹنک کی سیول اور فوجی اصلاحات کے متعلق کیے گئے اس نے صحافت کو عمدہ حکومت کی معاون خیال کیا اور اسے ممکنہ آزادی دینے کی خواہش کی۔ اگرچہ ان اصول پر حکومت عمل پیرا تھی تاہم قانونی قیود برابر جاری رہیں۔ لہٰذا سر چارلس مٹکاف نے قوانین صحافت کی تنسیخ کا فیصلہ کیا اور رائے عامہ کے اظہار کے لیے ایک بڑی آزادی عطا کردی۔ ضروری احتیاط کے طور پر اس نے یہ انتظام کیا کہ ہر کتاب یا اخبار پر طابع اور ناشر کا نام ہونا چاہیے جو قانون کی کسی خلاف ورزی کی صورت میں سزائے جرمانہ یا قید کا مستوجب ہوگا۔ اس طرح آزادی کو ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ملا دیا گیا۔ اس عمل کی بنا پر لارڈ ولیم بنٹنک کی خدمت میں ایک توصیفی سپاس نامہ پیش کیا گیا جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ صحافت سے متعلق

لہ۔ راجہ رام موہن رائے کی انگریزی تحریریں، صفحہ ۴۴۵ شائع شدہ پہینی آفس۔

اس کا طرز عمل" ان حالیہ ثبوتوں میں سے ایک ہے کہ ہندوستان کی حکومت معقول و محفوظ طور پر ان اشخاص کے سپرد کر دی گئی ہے جو اس کے طریقِ انتظام سے بخوبی واقف ہیں"۔

مٹکاف نے اپنے جواب میں جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے جدید قانون کی نوعیت اور اس کے نفاذ کی اغراض بیان کی ہیں۔

صحافت کی آزادی*

اگر یہ استدلال ہو کہ علم کی اشاعت ہندوستان میں ہماری حکمرانی کے لیے انجام کار مہلک ہوگی تو میں یہ بیان کرونگا کہ نتائج خواہ کچھ ہی ہوں ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم علم کے فوائد کو عام کر دیں۔ اگر ہندوستان، برطانوی سلطنت کے ایک جزو کی حیثیت سے صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ ہم اس کے باشندوں کو جہالت کی حالت میں مبتلا رکھیں تو ہماری حکومت ملک کے لیے ایک بلا ہوگی اور لازماً اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔

لیکن میں جہالت ہی میں خوف و خطر کی زیادہ معقول وجوہ پاتا ہوں۔ میں علم کے فروغ پانے سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ ہماری سلطنت کو مستحکم کریگا توہمات کو دور کریگا، شقاوت قلبی کو رفع کر کے نرمی پیدا کریگا، ہماری حکومت کے فوائد کے متعلق ایک معقول عقیدہ قائم کریگا، حاکم اور محکوم کو ایک دوسرے کا ہمدرد بنا دیگا اور جو اختلافات انہیں جدا رکھتے ہیں ان کو بتدریج کم کر کے آخر کار مٹا دیگا۔ بہر حال ہندوستان کی آیندہ حکومت کے متعلق مشیت ایزدی خواہ کچھ ہی ہو ہمارا صریحاً یہ فرض ہے کہ جب تک یہ ملک ہماری تحویل میں رہے ہم رعایا کی بہبودی کے لیے اپنی انتہائی قابلیت کو کام میں لائیں۔ ترقی علم جس کا ایک نہایت موثر ذریعہ آزادی صحافت ہے علانیہ فرض مذکور کا ایک لازمی جزو ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حکم ربانی سے ہمیں یہاں رہنے کی

---

*Source.—"Life of Lord Metcalfe." Vol. II.,PP. 262—4. J.W. Kaye. (Richard Bentley.)

اجازت صرف اس لیے ہے کہ ہم محاصل ملکی جمع کریں، ایسے محکموں کے مصارف جو قبضہ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں ادا کریں اور کمی کو پورا کرنے کے لیے قرض دار بن جائیں۔ بے شبہہ ہم یہاں بلند تر مقاصد کے لیے ہیں جن میں سے ایک اعلیٰ معلومات و تہذیب اور یورپی علوم و فنون کو اس ملک میں پھیلانا ہے تاکہ باشندگان ملک کی حالت ترقی پذیر ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے یقیناً کوئی اور چیز آزادیٔ صحافت سے زیادہ مفید نہیں ہو سکتی۔

* * * * * *

کامل ترین آزادی عطا کرنے کے لیے جو اغراض عام اصول کی بنا پر پیش نظر رہی ہونگی ان کے علاوہ صحافت ہند کی حالت میں کچھ ایسے امور بھی تھے جن کے باعث وہ تجویز جواب پیش کی گئی ہے تقریباً ناگزیر ہو گئی ہے۔ صحافت سالہا سال کی مدت سے جس میں سابق گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک کا کل دورِ حکومت شامل ہے عملاً آزاد رہی ہے اور اگرچہ بنگال میں قیود کے متعلق ایسے قوانین موجود تھے جن کی رُو سے حکومت کو نہایت زبردست اختیارات حاصل تھے تاہم ان کا استعمال عملی طور پر کسی غرض کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہایت نفرت انگیز تھے۔ ان سے حکومت کو ایسے من مانے اختیارات مل گئے جنہیں برطانوی رعایا خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کوئی حکومت اب عالمگیر رائے کو برانگیختہ کیے بغیر ان کا نفاذ نہیں کرا سکتی۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے صبر و تحمل سے کام لے کر جو آزادی عطا کی تھی اس کے بعد کسی حکومت کو ان قوانین کے نفاذ کی جرأت ہی نہ ہو سکتی تھی بجز اس صورت کے کہ تضحیک و تحقیر سے انتہائی بے حسی اس کے حصے میں آئی ہو۔ اگر ان کو مفید بھی فرض کیا جاتا تو بھی وہ بالکل بیکار تھے، اور چونکہ ان سے لازمی طور پر حکومت کی تحقیر ہوتی تھی اس لیے زیادہ مدت تک ان کو برقرار رکھنا ایک لغو فعل ہوتا۔

ان قوانین کا ذکر کرتے وقت میں اس شخص[1] کی طرف رجوع کرنے سے

---

[1] ۔ جان آدم۔

باز نہیں رہ سکتا جو ان کی منظوری کے زمانے میں برسرِ حکومت ہونے کے باعث ان کا بانی ہونے کا پورا الزام اپنے سر لیتا ہے۔ وہ دنیا کی نہایت اعلیٰ، پاک طینت اور نیک نہاد ہستیوں میں سے ایک تھا۔ ان قوانین کی تحریک کرتے وقت وہ یقیناً نہایت راست بازانہ و صادقانہ اغراض سے متاثر ہوا ہوگا جیسا کہ وہ ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ اب زندہ اور برسرِ حکومت ہوتا تو غالباً سب سے پہلے وہ ان قوانین کی تنسیخ کی تحریک کرتا جو اس نے سابق میں ضروری خیال کیے تھے مگر جو اب غیر مفید اور نفرت انگیز نظر آتے ہیں۔ اس امر کو کہ ان قوانین کے خلاف رائے عامہ کس حد تک پھیلی ہوئی ہے کوئی اور چیز اس رسوائی کی بہ نسبت زیادہ نمایاں طور پر ظاہر نہیں کر سکتی جسے قوانین مذکور نے ایک ایسے شخص کی یاد سے منسوب کر دیا جو ہر طرح کی ستائش کا کامل مستحق، اعلیٰ قابلیتوں اور اہم ترین سرکاری خدمتوں سے ممتاز اور نیکی و شرافت کا پتلا تھا۔ اس سے تمام واقف حال اشخاص محبت رکھتے تھے اور اس کی تعریف و تعظیم کرتے تھے لیکن عوام نے جو اس کے اوصاف سے لاعلم تھے محض ان قوانین کی بنا پر جن سے وہ نفرت کرتے تھے اسے بدنام کیا۔

بنگال اور آگرہ کے احاطوں میں سوال یہ تھا کہ آیا ان قوانین کو برقرار رکھا جائے یا منسوخ کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ قوانین اس قدر مطعون تھے کہ ان پر عمل نہ ہو سکتا تھا اور ان کا استعمال ہر لحاظ سے متروک ہو چکا تھا۔ بمبئی کے محکوم صوبوں میں بھی سوال مذکور اٹھا تھا لیکن ہندوستان کے دیگر حصص میں اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ پس اب سوال یہ تھا کہ آیا ان قوانین کو ان مقامات پر نافذ کیا جائے جہاں اب تک ان کا نفاذ نہیں ہوا ہے؟ کیا ان نفرت انگیز قیود کو وہاں عاید کیا جائے جہاں پہلے ہی سے کامل آزادی ہے؟ کیا قانون کی بجائے مطلق العنانی قائم کی جائے یا قانون ہی سے آزادی پر قیود عاید کر دی جائیں؟ مدراس میں کوئی مقامی قانون تھا نہ کوئی ذریعہ ایسا تھا جس سے کسی شائع شدہ چیز کے متعلق کسی شخص کو ذمہ دار قرار

دیا جائے۔ احاطۂ بمبئی میں پہلے ہی سے ایک قانون موجود تھا جو ایسا ہی آزادانہ تھا جیسا اب تمام ہندوستان کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ بمبئی اور مدراس میں ایسے قوانین بنانا جو کامل آزادی کے حامی نہ ہوں گویا ان پر ایسی قیود عاید کرنا تھا جو پہلے سے موجود نہ تھیں۔ یہ طریق کار یقیناً غلط ہوتا اور بالکل غیر ضروری تھا، البتہ مدراس میں جہاں آزادی ذمہ داری کے بغیر موجود تھی ایک قانون کی شدید ضرورت تھی۔ اس قسم کی صورت حال کے متعلق ہم جزوی طور پر قانون نہیں بنا سکتے تھے اور ہمارے غور وخوض کی حقیقت یہ ہے کہ جو قانون اب پیش کیا گیا ہے وہ بہترین ہونے کے علاوہ اتنا اطمینان بخش ہے جتنا ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ پوری آزادی عطا کرتا ہے اور اس کی تمام ذیلی شرائط کا منشا صرف مناسب ذمہ داری پیدا کرنا ہے۔ کسی مقام کے حالات یکساں طور پر قائم نہیں رہ سکتے، لہذا کسی مزاحم قانون کا نفاذ قانون سازی میں افسوسناک ترقی معکوس سے موسوم ہوتا اور زمانے کے اقتضا کے بالکل مخالف ہوتا۔

مٹکاف کے عمل کے بالواسطہ نتائج خواہ کچھ ہی نکلے ہوں لیکن اس عمل کا فوری اثر یہ ہوا کہ صحافت کے بھاری کام میں نمایاں ترقی ہوئی۔ مسٹر مارشمن جس نے سیرامپور کالج میں ایک عیسائی مبلغ کی حیثیت سے برسوں کام کیا تھا ایک ہفتہ وار رسالہ فرینڈ آف انڈیا کا مدیر تھا اور کپتان کیئی نے جو بعد کو سر جان کیئی ہو گیا ہرکورو جاری کیا۔ انہوں نے الگزینڈر ڈف کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ کلکتہ کے تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ایک ایسے رسالے کی شدید ضرورت ہے جس میں مفکر اشخاص خواہ ان کی رائیں سیاست اور مذہب کے متعلق کچھ ہی ہوں اظہار خیال کر سکیں۔ اس کا نتیجہ کلکتہ ریویو کی صورت میں ظاہر ہوا جس کا پہلا نمبر مئی ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا۔

* * * * * *

*"کلکتہ ریویو" کی پہلی اشاعت

اس کے (کلکتے کے) مکان میں ایک روز شام کا وقت بسر کرنے کے کچھ ہی مدت بعد مجھے اس کا ایک طویل خط ملا جس میں اس نے ہندوستان میں ایک اعلیٰ درجے کا سہ ماہی رسالہ جاری کرنے کی ضرورت کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے تھے، صرف سر ہنری لارنس، مسٹر جان مارشمن اور کپتان مارش وہ اشخاص تھے جن سے اس نے مشورہ کیا تھا اور اب اس امر کا یقین کرنے کے بعد کہ اشخاص مذکور اس تجویز سے متفق ہیں اس نے یہ معلوم کرنے کی خواہش کی کہ آیا میں ان کا شریک کار ہو کر باقاعدہ مضمون نگار ہو سکتا ہوں۔ میں ہمیشہ ایک ایسے زوردار رسالے کی شدید ضرورت محسوس کرتا رہا ہوں جو ہماری سلطنت ہند کے اہم مسائل کا حق ادا کر سکے۔ لہذا مجھے فوراً یہ جواب دینے میں کوئی پس و پیش نہیں ہوا کہ میں ایسے رسالے کی شدید ضرورت سمجھتا ہوں۔ میں نے صرف اتنا اور لکھا کہ سب کچھ ان اصول پر منحصر ہوگا جن پر رسالہ جاری کیا جائیگا۔ اگر یہ اصول سیاسی، تمدنی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی تمام حیثیتوں سے معقول ہونگے تو جو فایدہ ان سے حاصل ہوگا وہ نہایت عظیم الشان ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر وہ ان امور اور دیگر افتتاحی مضامین کے اعتبار سے غیر معقول ہونگے تو اسی مناسبت سے ان کا برا اثر بھی زیادہ ہوگا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ان کے ساتھ خوب متحد ہو کر اس جدید رسالے کو چلانے میں بخوشی شریک رہونگا بشرطیکہ وہ اولاً یہ عہد کرلیں کہ اس رسالے میں کوئی چیز ایسی شائع نہ ہوگی جو عیسائیت یا عام عیسائی رعایا کے مخالف ہو، اور ثانیاً یہ کہ جب کبھی مناسب موقع قدرتی طور پر پیدا ہو تو صحیح عیسائیت اور ہندوستان میں مبلغین کے ذریعے اس کی اشاعت کے متعلق صاف و صریح تشریحات کی جائینگی۔

*Source.— "Life of Alexander Duff." Vol. II., P. 92. George Smith. (Hodder & Stoughton.)

مسٹر کیبی نے فوراً مجھے یقین دلایا کہ یہ امور بجنسہ اس کے خیالات کے مظہر ہیں اور اگر میں پہلے نمبر کے لیے کوئی مضمون لکھنا چاہوں تو نفس مضمون کا انتخاب وہ کلیتہً مجھ پر چھوڑ دیگا۔ چونکہ پہلی ہندوستانی یا ولندیزی تبلیغی انجمن سے متعلق بعض نادر دستاویزات میرے یہاں موجود تھیں اس لیے میں نے تبلیغی انجمنوں کے کل معاملات پر ایک نہایت مفصل مضمون لکھا جس میں کوئی اہم پہلو ترک نہیں کیا گیا۔

آٹھواں باب

کمپنی کا آخری زمانہ

سنہ ۱۸۵۳ء میں سب سے آخری قانون منشور لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت میں منظور ہوا۔ یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ کمپنی کا زمانہ ختم ہونے کے قریب تھا کیوں کہ حسب سابق منشور کی تجدید بیس سال کی مدت کے لیے نہیں ہوئی بلکہ "محض اُس وقت تک جبکہ پارلیمنٹ کوئی دوسرا انتظام کرے۔" تاج کے اختیارات میں اضافہ ہوا اور یہ طے پایا کہ نظما میں سے چھ کا تقرر تاج کی طرف سے عمل میں آئے اور "ہندوستانی تقررات کے بارے میں مجلس نظما کو جو اقتدار حاصل ہے وہ منسوخ ہو جائے اور آئندہ مجلس نگراں کے وضع کردہ ضوابط کے مطابق اقتدار مذکور کام میں لایا جائے۔ ان ضوابط کی رُو سے سیول ملازمانِ متعہد کا انتخاب عام مقابلے کے ذریعے ہونے لگا۔" صوبۂ بنگال پر ایک لفٹیننٹ گورنر کا تقرر کر کے جیسے صوبہ جات شمالی مغربی کے لفٹیننٹ گورنر کے مماثل اختیارات دیے گئے حکومت ہند کو بنگال کی براہ راست نگرانی سے سبکدوش کر دیا گیا۔

سنہ ۱۸۵۳ء کے قانون سے جو اہم ترین تغیر ہوا وہ یہ تھا کہ قواعد وضوابط مرتب کرنے کی غرض سے گورنر جنرل کی کونسل کے[1] ارکان کی تعداد بڑھادی گئی۔ یہ ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے کہ ابتدا میں رکن قانونی کو کونسل کے عام اجلاس میں شریک ہونے اور رائے دینے کا حق حاصل نہ تھا البتہ اس کی شرکت و رائے دہی صرف ان اجلاسوں میں ہو سکتی تھی جو قانون سازی کے معاملات سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ اصول اب بنگال کے میر مجلس، ایک رکن عدالت عالیہ اور بنگال، مدراس، بمبئی و صوبہ جاتِ شمال مغربی کی مقامی حکومتوں کے ایک ایک نامزد کردہ رکن کو شامل کرکے وسیع کر دیا گیا۔ سوالات کرنے اور جماعت عاملہ کے کاموں پر تنقید کرنے کے بارے میں کونسل کو بہت کچھ آزادی دی گئی جس سے جدید ارکان نے پورا فائدہ اٹھایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۶۱ء کے قانون کی رو سے ان حقوق میں کمی کر دی گئی۔ سنہ ۱۸۵۳ء کے قانون کی منتخب و اہم دفعات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

سنہ ۱۸۵۳ء کا قانون منشور	۱۵۔ صوبۂ آگرہ کی شکست و ریخت۔

صوبہ جاتِ شمال مغربی کے لیے ایک لفٹیننٹ گورنر کا تقرر:۔ بنگال کے احاطۂ فورٹ ولیم کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے متعلق شاہ ولیم چہارم کے تیسرے اور چوتھے سالِ جلوس کے قانون مذکور کی دفعات معطل رہینگی تا آنکہ مجلس نظما، مجلس مامورین برائے معاملات ہند کے زیر نگرانی و ہدایت کوئی دوسرا حکم صادر نہ کرے اور قانون مذکور بالا کی ان دفعات کے دوران تعطل میں صوبہ جات شمال مغربی کے لیے جو اس وقت احاطۂ فورٹ ولیم بنگال کے زیر حکومت تھے ایک لفٹیننٹ گورنر کے تقرر کی اجازت دینے والی دفعہ بحال رہیگی اور اس کے تحت جو تقررات اور انتظامات ہونگے وہ بھی قائم رہینگے۔

---

[1] سنہ ۱۸۵۳ء کے قانون میں رکن قانونی کو کامل حقوق دیے گئے۔

۱۶۔ بنگال کے لیے ایک گورنر یا لفٹیننٹ گورنر کا تقرر:۔ مذکورِ بالا نگرانی وہدایت کے تحت مجلس نظما کے لیے یہ قانوناً جایز ہوگا کہ قانون ہذا کے منظور ہو جانے کے بعد کسی وقت اگر وہ مناسب سمجھے تو اعلان کر دے کہ ہندوستان کا گورنر جنرل احاطۂ فورٹ ولیم بنگال کا گورنر نہ ہوگا بلکہ اس احاطے کے لیے ایک علیحدہ گورنر مقرر ہوگا اور ایسی صورت میں احاطۂ مذکور کے لیے وقتاً فوقتاً ایک علیحدہ گورنر کا تقرر ہوتا رہے گا۔ اس گورنر کے وقت تقرر سے نیز اس کے بعد قانون مذکور کی بنا پر ہندوستان کے گورنر جنرل کو احاطۂ فورٹ ولیم بنگال کے لیے ڈپٹی گورنر مقرر کرنے کا جو اختیار حاصل تھا وہ منسوخ سمجھا جائیگا اور جب تک مذکورِ بالا نہج پر اس احاطے کے لیے ایک علیحدہ گورنر مقرر نہ ہو اس وقت تک مجلس نظما کے لیے یہ قانوناً جایز ہوگا...... کہ ہند کے گورنر جنرل با جلاس کونسل کو یہ ہدایت کر دے کہ وہ وقتاً فوقتاً کمپنی مذکور کے کسی ملازم کو جو ہندوستان میں دس سال ملازمت کر چکا ہو احاطۂ فورٹ ولیم بنگال کے علاقوں میں سے اس حصے کا لفٹیننٹ گورنر بنا دے جو فی الوقت مذکورِ بالا صوبہ جات شمال مغربی کے لفٹیننٹ گورنر کے زیر حکومت نہ ہو اور اس طرح جو لفٹیننٹ گورنر مقرر ہو اس کے اختیارات کی تصریح وتشریح کر دے۔

۱۹۔ مقامی حکومتوں کی جغرافی حدود بدلنے کا اختیار:۔ مذکورِ بالا نگرانی وہدایت کے تحت مجلس نظما کے لیے یہ قانوناً جایز ہوگا کہ وہ وقتاً فوقتاً اعلان کے ذریعے اس امر کا تعین کرتی رہے کہ کمپنی مذکور کی حکومت کے موجودہ ماتحت علاقوں میں سے کونسا حصہ یا کونسے حصے ان احاطوں اور لفٹیننٹ گورنروں میں سے ہر ایک کے زیر اقتدار ہیں یا رہینگے جو فی الحال ان علاقوں میں قایم ہیں نیز اس کے لیے یہ جایز ہوگا کہ مجلس نظما اپنی سہولیت وصوابدید پر ان احاطوں اور لفٹیننٹ گورنروں کے علاقوں کی کوئی تقسیم وانتظام یا ان کے متعلق جدید تقسیم وانتظام عمل میں لائے۔

۲۰۔ ملکۂ معظمہ سے کونسل کی جزرکنیت کی منظوری:۔ ہندوستان کی کونسل یا کسی احاطے کی کونسل میں جب کسی رکن معمولی کا تقرر مجلس نظما کی طرف سے

عمل میں آئے، تو اس کی منظوری لازماً ملکۂ معظمہ سے حاصل کرنی ہوگی جس کا اجرا شاہی مہر کے ساتھ بہ ثبت دستخط صدر مجلس ماموریں برائے معاملات ہند ہوگا۔

۲۱- رکن قانونی کو کونسل میں شرکت و رائے زنی کی اجازت:- شاہ ولیم چہارم کے سال جلوس سوم و چہارم کے قانون مذکور کا وہ حصہ جس کی رو سے ہندوستان کی کونسل کے چوتھے رکن معمولی کو کونسل مذکور میں بجز اُن اجلاسوں کے جو قوانین و ضوابط وضع کرنے کے لیے منعقد ہوں شریک ہونے اور رائے دینے کا حق حاصل نہ تھا منسوخ کیا جاتا ہے۔

۲۲- قانون سازی کا انتظام:- ہند کے گورنر جنرل باجلاس کونسل کو قوانین و ضوابط وضع کرنے کے جو اختیارات اب حاصل ہیں انہیں بہتر طریقے پر کام میں لانے کے لیے گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ارکان کے علاوہ مندرج ذیل مختلف اشخاص شاہ ولیم چہارم کے سال جلوس سوم و چہارم کے قانون مذکور کے تحت ہندوستان کی کونسل کے ارکان قرار پائینگے اور ان کا تعلق قوانین و ضوابط وضع کرنے کے جملہ اختیارات مذکورِ بالا سے ہوگا اور وہ مشیرانِ قانونی کے نام سے موسوم ہونگے (یعنی)

ا- ہر احاطے اور ہر لفٹیننٹ گورنر کے علاقے سے جو فی الوقت مذکورِ بالا علاقوں میں قائم ہو ایک ایک رکن جس کا تقرر وقتاً فوقتاً ہر احاطے کے گورنر اور ہر علاقے کے لفٹیننٹ گورنر کی طرف سے علی الترتیب عمل میں آئے اور ایسے رکن کا انتخاب اُن اشخاص میں سے ہو جو کسی احاطے یا لفٹیننٹ گورنر کے علاقے میں کمپنی کی سیول ملازمت میں رہ چکے ہوں یا اس وقت موجود ہوں جبکہ تقرر مذکور ہو رہا ہو اور جنہیں کمپنی کی ملازمت میں دس سال گزر چکے ہوں:

ب- فورٹ ولیم بنگال کی عدالت عظمیٰ کا میر مجلس یا ایسی صدر عدالت کا میر مجلس یا چیف جج جو مذکورِ بالا علاقوں میں جنہیں صدر عدالت کے اختیارات عطا کیے جائیں بعد کو قائم ہو:

ج- مذکورِ بالا صدر عدالت کے دیگر ججوں میں سے ایک یا اسی قسم کی آیندہ قایم ہونے والی صدر عدالت پر ملکۂ معظمہ کے مقرر کردہ ججوں میں سے ایک جس کی

نامزدگی گورنر جنرل موصوف کی طرف سے عمل میں آئی ہو۔
نیز مجلس نظما کے لیے یہ قانوناً جائز ہوگا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو مجلس مامورین
برائے معاملات ہند کی نگرانی و حکم کے تحت ہندوستان کے گورنر جنرل کو
اختیارات عطا کرکے یہ ہدایت کردے کہ وہ وقتاً فوقتاً مذکورِ بالا مشیرانِ قانونی
کے علاوہ ایسے دو شخص کا انتخاب کرے جو کمپنی کی ملازمت میں دس سال رہ چکے ہوں
اور انہیں قانون ہذا کے تحت کونسل مذکور کے مشیرانِ قانونی کی حیثیت سے مقرر
کرے بشرطیکہ ان مشیرانِ قانونی کو جو قانون ہذا کے تحت ہندوستان کی کونسل
میں منتخب ہونگے کونسل مذکور میں بجز اُن اجلاسوں کے جو قوانین وضوابط وضع
کرنے کے لیے منعقد ہوں شرکت کرنے اور رائے دینے کا حق نہ ہو۔

۴۴۔ وضع کردہ قوانین کے لیے گورنر جنرل کی منظوری کی ضرورت بشرطیکہ
کوئی قانون یا ضابطہ جو کونسل مذکور نے وضع کیا ہو اُس وقت تک نافذ یا شائع
نہ ہوسکیگا جب تک کہ اُسے گورنر جنرل موصوف کی منظوری حاصل نہ ہو جائے
خواہ وہ اُس کے وضع ہونے وقت کونسل میں موجود رہا ہو یا نہ ہو۔

۴۵۔ تنخواہیں :۔ مندرجِ ذیل مختلف عہدہ داروں کو سالانہ
تنخواہیں ایصال ہونگی جو علی الترتیب ان عہدہ داروں کے ناموں کے محاذی
درج ہیں لیکن ان تنخواہوں میں مجلس نظما مجلس مامورین کی منظوری سے ایسی
تخفیف کرسکیگی جیسے وہ وقتاً فوقتاً مناسب سمجھے:

ا۔ سپہ سالار افواج ہند کو اس کے مشاہرے اور بھتے کی بجائے
ایک لاکھ روپیے سکۂ کمپنی:

ب۔ ہر لفٹیننٹ گورنر کو ایک لاکھ روپیے سکۂ کمپنی؛

ج۔ ہند کی کونسل کے ہر رکن معمولی کو اسّی ہزار روپیے سکۂ کمپنی:

د۔ ہند کی کونسل کے ہر مشیر قانونی کو (جو کسی اور خدمت پر مامور نہ ہو)
پچاس ہزار روپیے سکۂ کمپنی:

مذکورِ بالا تنخواہیں شاہ ولیم چہارم کے سال جلوس سوم و چہارم کے
قانون مذکور کے اُن قواعد وضوابط کی پابند ہونگی جو تنخواہوں کے تعین سے

متعلق ہیں لیکن کسی ایسے عہدہ دار کی تنخواہ جو اس قانون کے نفاذ سے قبل مامور ہو چکا ہو آئین ہذا کے تحت کم نہ کی جائیگی۔

کچھ مدت سے ہر دو سیاسی جماعت کے رہنما خصوصاً ڈسرائیلی اس بات کو محسوس کرنے لگا تھا کہ اب ہندوستانی معاملات کے انتظام کو براہ راست تاج اور پارلیمنٹ کے تحت لے لینے کا وقت آ گیا ہے۔ کمپنی کی حکومت اور حکومت دوعملی کے نظام پر گرم بحثیں ہو رہی تھیں۔ لہٰذا ہم نے کمپنی کی اس عرضداشت کو جو ارل گرے نے دارالامرا میں پیش کی تھی اور لارڈ پامرسٹن کی اس تقریر کو جس میں اس نے حکومتِ دوعملی کے نظام کے نقائص کا ذکر کیا تھا نیز مسٹر ل کے اس مضمون کو جس میں اس نے حکومت کمپنی کی حمایت کی ہے ذیل میں بجنسہ درج کر دیا ہے۔

*نظامِ حکومتِ دوعملی کی تائید

(ایسٹ انڈیا کمپنی کی عرضداشت)

بملاحظہ معزز ارکان دارالامرا و دارالعوام سلطنت متحدۂ برطانیۂ عظمیٰ و آئرلینڈ بہ اجلاس پارلیمنٹ

بہ عرض عالی می رسانند

سائلین نے ابتدا میں اپنے ذاتی مصارف سے اور اپنے ہی سیول و فوجی ملازموں کی مدد سے اس ملک کے واسطے مشرق کی عظیم الشان سلطنت حاصل کی۔

اس سلطنت کی بنیاد جس زمانے میں سائلین نے ڈالی اس وقت سائلین پارلیمنٹ کی نگرانی میں تھے نہ اس سے انہیں کوئی اعانت حاصل ہوتی تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جبکہ پارلیمنٹ کے زیر نگرانی حکومتی جماعتوں کی مسلسل تبدیلی کے باعث بحر اوقیانوس کی دوسری طرف ایک زبردست سلطنتِ تاج برطانیۂ عظمیٰ کے قبضے سے نکل رہی تھی۔

اس وقت سے اب تک تقریباً ایک صدی کا زمانہ گزرا ہے اس دوران میں اس ملک کے ہندوستانی مقبوضات کی حکومت و حفاظت کے تمام مصارف انھیں مقبوضات کے محاصل سے پورے ہوئے ہیں اور برطانوی خزانے پر مطلق کوئی

---

*Source.—Petition of the East India Company. (Hansard.)

اس قسم کی شہادت سائلین کے علم و یقین کی حد تک تاج کے بار نہیں پڑا ہے۔ اس قسم کی شہادت سائلین کے دیگر متعدد غیر ملکی مقبوضات میں سے کسی کے متعلق نہیں پیش کی جا سکتی۔

اس امر کو صریحاً نامناسب خیال کر کے کہ برطانوی مقبوضات میں سے کسی علاقے کی حکومت اپنی مرکزی حکومت سے بے نیاز نہ ہونی چاہیے پارلیمنٹ نے ۱۷۸۳ء میں یہ قاعدہ مقرر کیا کہ حکومت انگلستان کے ایک شعبے کو سائلین کی حکومت ہند کی جملہ کارروائیوں پر نظر ڈالنے اور ان پر نگرانی رکھنے کا کامل اختیار ہونا چاہیے چنانچہ اس وقت سے حکومت ہند کے اس شعبے میں جس کا تعلق انگلستان سے ہے سائلین اور تاج کے ایک وزیر کے باہمی مشورے اور مشترک ذمہ داری پر کام چل رہا ہے۔

اس انتظام پر مختلف اوقات ما بعد میں جماعت مقننہ نے مکرر غور و خوض کیا اور پارلیمنٹ کی طرف سے اس کے عملی نتائج کے متعلق متعدد مرتبہ احتیاط کے ساتھ مکمل تحقیقات کی گئی جس کا نتیجہ ہر مرتبہ یہی نکلا کہ ہند کے نظم و نسق میں سائلین جو اختیارات استعمال کرتے تھے ان کی تجدید ہوتی گئی۔

اس قسم کی تجدید کا آخری موقع جسے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری ۱۸۵۳ء میں پیش آیا جبکہ اس انتظام کو جو تقریباً ڈیڑھ صدی سے جاری تھا بعض تغیرات کے ساتھ قانوناً منظور کیا گیا اور وہ اب تک قائم ہے۔

با ایں ہمہ سائلین کو ملکہ معظمہ کے وزرا نے اپنے اس ارادے کی اطلاع دی ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں ایک مسودۂ قانون اس غرض سے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ملکہ معظمہ کے مشرقی مقبوضات ہند کی حکومت براہ راست تاج کے زیر اقتدار ہو جائے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہوگی جس کے باعث یقیناً ایسٹ انڈیا کمپنی آلۂ حکومت کی حیثیت سے قائم نہ رہ سکیگی۔

سائلین کو ان وجوہ سے مطلع نہیں کیا گیا جن کی بنا پر ملکہ معظمہ کے وزرا نے کسی جدید تحقیقات کے بغیر ایسے نظام حکومت کے موقوف کرنے کی تجویز کی ہے جس کی توثیق اور منظوری پارلیمنٹ کی طرف سے کامل غور و خوض اور تحقیقات کے بعد عمل میں آئی ہے اور اسے پانچ سال بھی نہیں گزرے ہیں۔ چونکہ اس

ترمیم شدہ نظام کو نافذ ہوئے پورے چار سال بھی نہیں گزرے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مدت میں اس کی کافی آزمائش نہیں ہوئی ہے۔

سائیلین کو اس امر کا علم نہیں کہ ملکۂ معظمہ کے وزرا نے ترمیم شدہ نظام کو ناکام ثابت کیا ہے یا سائیلین پر کوئی سنگین یا معمولی الزام قائم کیا ہے۔ لیکن جس زمانے میں مذکورۂ بالا تجویز پیش کی گئی ہے اس کے لحاظ سے سائیلین یہ خیال کرنے پر مجبور ہیں کہ اس تجویز کا باعث وہ افسوسناک حادثات ہیں جو حال ہی میں ہندوستان میں واقع ہوئے ہیں۔

سائیلین ہر طرح اس بات پر آمادہ ہیں کہ بنگال کی فوج کی بغاوت کے متعلق پوری تحقیقات کی جائے اور جن اسبابِ قریب یا بعید کے باعث بغاوت مذکور پیدا ہوئی ان کا پتہ لگایا جائے۔ سائیلین نے حکومت ہند کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ برسرِ موقع تحقیقات کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کرے اور سائیلین کی یہ دلی خواہش ہے کہ اسی قسم کی تحقیقات اس ملک میں بھی معزز دارالامرا کی طرف سے عمل میں آئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا مقامی حکومت ہند کے دستور میں یا اس کے انتظامی عہدہ داروں کے طرزِ عمل میں کوئی خرابی ایسی ہے جس سے بغاوت کے پیدا ہونے میں مدد ملی ہو یا اس کو فرو کرنے کی تدابیر میں کسی طرح کی مزاحمت ہوئی ہو نیز یہ معلوم ہو سکے کہ آیا خود بغاوت یا اس سے متعلق کوئی صورتِ حال ہندوستان کے موجودہ نظامِ حکومت کے ناکام ہونے کی کوئی شہادت پیش کرتی ہے۔

اگر یہ صحیح بھی ہو کہ مذکورۂ بالا نظامِ حکومت ناکام رہا تو یہ ناکامی اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کے مناصب سے محروم کر کے انہیں ملکۂ معظمہ کی حکومت کو منتقل کر دیا جائے کیونکہ موجودہ نظام میں ملکۂ معظمہ کی حکومت ہی کا حکم ناطق ہے۔ مجلسِ نظما کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مجلس مذکور تجاویز پیش کرے اور مسودات ہدایات مرتب کرے۔ اگر وہ اس کام میں کوتاہی کرے تو یہ کوتاہی خواہ اس کے لیے کیسی ہی ذلت کا باعث ہو ملکۂ معظمہ کی حکومت کو کسی طرح بری الذمہ نہیں کر سکتی کیونکہ وزیرِ ہند کو

یہ اختیار حاصل ہے اور اس نے اکثر اسے استعمال بھی کیا ہے کہ مجلس نظما سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ کسی مسئلے پر بھی غور و خوض کر کے مراسلہ ہدایات کا مسودہ اس کی منظوری کے لیے تیار کرے۔ پس ملکہ معظمہ کی حکومت پر اُن تمام امور کی جو انجام پا چکے ہیں یا انجام پانے سے رہ گئے ہیں کامل ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف سائلین صرف اسی حد تک ذمہ دار ہیں جس حد تک انہوں نے کسی کام کے مکمل یا متروک ہونے میں مدد دی ہے۔

ان حالات کے تحت اگر ہندوستان کی حکومت کو ناکامی ہوئی ہے تو سائلین کی گزارش یہ ہے کہ اس امر کی توقع کسی قدر غیر معقول ہوگی کہ ناکامی کا علاج، مقتدر حکومت کی اس شاخ کو جو تنہا زیادہ خطا دار نہیں گردانی جا سکتی اور جو ممکن ہے بے خطا ہی ثابت ہو معدوم کرنے سے ہو سکتا ہے کیونکہ جملہ اختیارات اس شاخ میں جمع ہو جائیں گے جو ہر اصلی یا فرضی خطا میں لازمی و یقینی طور پر شریک رہی ہے۔ اس امر کا باور کرنا کہ اگر کوئی وزیر تاج مجلس نظما کی اعانت کے بغیر حکومت ہند کا کام چلاتا تو حکومت مذکور خطا سے نسبتاً زیادہ مبرا ہوتی گویا یہ باور کرنا ہے کہ وزیر موصوف نے حسب خواہش حکومت ہند کے کامل اختیارات رکھنے کے باوجود اچھی طرح حکومت نہیں کی کیونکہ اسے تجربہ کار اور ذمہ دار مشیروں کی اعانت حاصل تھی۔

بہر صورت سائلین کا منشا یہ نہیں ہے کہ دیگر شرکائے حکومت کو ذمہ دار گردان کر خود کو بری الذمہ ثابت کریں۔ ہندوستان کی حکومت جس عملی طریقے پر چلائی جاتی رہی ہے اس کی پوری ذمہ داری کو سائلین قبول کرتے ہیں۔ یہ ذمہ داری سائلین کے لیے خفت کی نہیں بلکہ فخر و مباہات کی شے ہے۔ سائلین کو اس امر کا احساس ہے کہ معاملات ہند کے انصرام میں اُن کے مشورے اور ان کی تحریکیں عظیم و قوی عنصر بنی رہی ہیں جیسا کہ ان کو ہونا بھی چاہیے تھا۔ سائلین کو اس امر کا بھی یقین کامل ہے کہ ہندوستان اور اسکی حکومت پر جس قدر زیادہ توجہ مبذول کی جائیگی اور جس قدر زیادہ روشنی اس پر ڈالی جائیگی اسی قدر یہ زیادہ واضح ہوتا جائیگا کہ جس حکومت میں سائلین نے

شرکت کی ہے وہ نہ صرف نیت کے لحاظ سے نہایت پاکیزہ رہی ہے بلکہ عمل کے لحاظ سے بھی نہایت فیاض واقع ہوئی ہے اور اس کی شہرت اقوام عالم میں ہمیشہ رہی ہے۔ یہ حکومت گزشتہ اور خاصکر موجودہ قرن میں ہر شعبے کے لحاظ سے دنیا کی بہت جلد ترقی کرنے والی حکومتوں میں شمار کی گئی ہے اور اس وقت جبکہ تغیر کی تحریک پیش کی جارہی ہے اس حکومت میں کسی سابق دور کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم اصلاحات تیز تر رفتار کے ساتھ عمل میں آنے والی ہیں۔ سائلین اس امر سے مطمئن ہیں کہ ہندوستان میں جو کچھ مزید اصلاحات آیندہ نافذ کی جائینگی وہ صرف یہی ہونگی کہ سائلین کے اختیارات بلکہ بڑی حد تک ان کی خاص ہدایات کے تحت ان اصول کو جو ابتدا میں مقرر ہو چکے ہیں وسعت دی جائے اور ان بنیادوں پر جو پہلے ہی ڈالی جاچکی ہیں عمارتیں قائم کی جائیں۔

لیکن مذکورہ بالا اثرات انگلستان یا ہندوستان میں عوام کے قلوب پر پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے اگر سائلین کو ہندوستان کی حکومت سے خارج کر دیا جائے۔ مدبرین کا یہ دستور نہیں رہا ہے کہ کسی ایسے نظام حکومت کو کلیتہً منسوخ کرنے کی تحریک کریں جس کے عملی نتائج پر لعن طعن نہ ہوئی ہو۔ اگر اس وقت پیش شدہ تجاویز کا نفاذ عمل میں آئے تو اس سے عام طور پر یہی نتیجہ اخذ ہو سکیگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جسے ہندوستان کی حکومت کا اہم حصہ سونپا گیا تھا اپنے فرائض اس بداسلوبی سے انجام دیے ہے کہ ایک سنگین بغاوت برپا ہوگئی اور ہندوستان برطانوی سلطنت کے قبضے سے نکلنے کے قریب تھا اور یہ کہ جب طویل مدت کی بدانتظامی کا یہ انجام ہوا تو عوام کے غیظ و غضب کا لحاظ کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کی بدعنوانیوں کے باعث انصافاً برخاست کیا گیا ہے۔

اگر محض ایسٹ انڈیا کمپنی کا طرز عمل معرض بحث میں ہوتا تو سائلین تاریخ کے فیصلے کا انتظار کرنے کے لیے رضامند ہو جاتے کیونکہ وہ مطمئن ہیں کہ آنے والی نسلیں ان کے ساتھ انصاف کرینگی اور انہیں یقین ہے کہ

اب بھی ان کے ساتھ انصاف نہ صرف ملکہ معظمہ کے وزرا بلکہ اُن تمام اشخاص کے دلوں میں ہو رہا ہے جو معاملہ زیر بحث کے موزوں حکم ہونے کا کوئی حق رکھتے ہیں۔ لیکن سائلین اگرچہ اس امر کا انتظار کر سکتے ہیں کہ معزولی کا فیصلہ جس کے متعلق دنیا بھر میں یہ سمجھا جائیگا کہ برطانوی قوم نے ان کے اور اُن کی حکومت کے لیے صادر کیا ہے منسوخ ہو جائے تاہم اس کا جو اثر ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر پڑنے کا امکان ہے اسے سائلین انتہائی بیقراری کے ساتھ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے نزدیک خواہ نام سے حقیقت کا کیسا ہی غلط اظہار ہو ہندوستان کی برطانوی حکومت گویا ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہے۔ ان کے خیال میں کمپنی کی معزولی آیندہ کچھ مدت تک اُس سارے نظام حکومت کی معزولی ہوگی جس کے ساتھ کمپنی وابستہ ہے۔ اس معزولی کے ساتھ ہی جو جدید انتظام زبردست برطانوی قوت کے اثر سے نافذ کیا جائیگا اس سے ایک عام شورش جس کے خطرات بنفسہ نہایت وحشت انگیز ہونگے اس ملک میں اکثر اخباروں کے ذریعے اور ہندوستان میں انگریزوں کی طرف سے پیدا ہوگی اور اس بین دلیل پر حکومت کے گزشتہ طرز عمل کو مطعون کیا جائیگا کہ اس میں ہندوستانیوں کے ساتھ بہت صبر و تحمل اور پاس و لحاظ سے کام لیا گیا ہے۔

باشندگان ہند کو پہلے پہل اس امر کا یقین نہ آئیگا کہ خود جدید حکومت یا جدید نام کی حکومت جس کے قیام کی تجویز کی گئی ہے اپنے پیش رووں کے عہد و پیمان کی پابند رہیگی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات جلد نہ آئیگی کہ ایک حکومت کو صرف اس لیے معزول کیا گیا ہے کہ اس کی بجائے دوسری حکومت ایسی قائم ہو جو انھیں اصول اور انھیں انتظامات پر کار بند رہے۔ وہ یہ خیال نہیں کر سکتے کہ موجودہ نظام حکومت کو اس کے مسلک میں کسی قسم کی تبدیلی کا منصوبہ کیے بغیر برخاست کیا جائیگا۔ وہ یہ دیکھینگے کہ ان کے وطن میں نیز ہندوستان میں ارباب حل و عقد کو ایسے اشخاص گھیرے ہونگے جو اس مسلک کے متعدد اجزا کو کلیۃً بدل دینے پر پُرزور اصرار کرینگے۔ اس طرح آلۂ حکومت میں جو تبدیلی ہوگی اس کی تاویل وہ یہ کرینگے جیسی کہ انہیں کرنی چاہیے کہ مذکورہ تبدیلی انھیں اشخاص کی رایوں اور مشوروں کے لحاظ سے

کی گئی ہے اور یقیناً وہ یہ خیال کرینگے کہ دیگر منصوبوں میں حکومت کے مذہب اور اس کی ہندوستانی رعایا کے مذہب کے درمیان آیندہ وہ سخت غیر جانبداری ملحوظ نہ رکھی جائیگی جو اب تک اس کی خصوصیت رہی ہے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ ان کے قوی ترین و عمیق ترین جذبات کا آیندہ اتنا لحاظ نہ کیا جائیگا جتنا اب تک کیا جاتا تھا اور انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو جائیگا کہ ان کی عادات یا رسوم و معمولات سے متعلق ہر شے پر جسے انگریز قابل اعتراض تصور کرینگے براہ راست حملہ کرنا آیندہ افراد و خانگی مجالس ہی تک محدود نہ ہوگا بلکہ حکومت کی ساری قوتیں بھی ان کی پشت پناہ ہوں گی۔

سائلین اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ باشندگانِ ہند کے مذہبی رسم و رواج میں بجز ان کے جو انسانیت سوز ہوں ہر قسم کی مداخلت سے باز رہنے میں انہوں نے نہ صرف عدل و مصلحت سے متعلق اپنے ذاتی خیالات کے تحت بلکہ جماعت مقننہ کے اُن واضح مقاصد و صریح خیالات کے مطابق عمل کیا ہے جن کی بنا پر یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ "ہندوستانیوں کے سیول اور مذہبی امور کا لحاظ رکھا جائے" نیز یہ کہ "ہندوستانیوں کے خلاف دیوانی یا فوجداری مقدمات ایسے قواعد کے مطابق چلائے جائیں جو ان مقدمات کو ہندوستانیوں کے مذاہب و اطوار کے لحاظ سے جایز قرار دیں"۔ اس خصوص میں سائلین کے مسلک کی کامیابی کا ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ ایک فوجی بغاوت کے دوران میں جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مذہب سے متعلق بے بنیاد خوف و خطر کے باعث وہ برپا ہوئی تھی عوام اور ہندوستانی ریاستوں کے حکمران، برطانوی حکومت کے ساتھ وفادار رہے ہیں۔ سائلین کو یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر ہندوستانی حکمران بغاوت کے فرو کرنے میں مدد دینے کی بجائے خود اس کی رہنمائی کرتے یا عام آبادی اس بغاوت میں شریک ہو جاتی تو گزشتہ واقعات کا نتیجہ کس قدر زیادہ مختلف ہوتا اور یہ گمان کس قدر غالب ہوتا کہ مذکورہ دونوں صورتیں وقوع پذیر ہو جاتیں اگر کوئی اصل وجہ اس امر کے ذہن نشین کرانے کے لیے پیش کی جا سکتی کہ برطانوی حکومت تبلیغ مذہب

میں تحریک ہونا چاہتی ہے۔ سائلین کا یہ مسلّم عقیدہ ہے کہ اس مسلک میں کسی اہم تبدیلی کے خوف سے تھوڑی ہی مدت کے اندر سارے ہندوستان میں عام شورش پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔

سائلین نے انتہائی تکلیف کے ساتھ یہ مشاہدہ کیا ہے کہ ان کے ہم وطن، ہندوستان نیز انگلستان میں باشندگان ہند کے خلاف اندھا دھند عداوت کے مظاہرے کر رہے ہیں جن میں گزشتہ ناگوار واقعات کے بعد سے زیادہ شدت ہو گئی ہے۔ سائلین کو یقین کامل ہے کہ یہ مظاہرے اساسی طور پر حق بجانب نہیں ہیں اور انہیں یہ علم ہے کہ ہندوستان میں عمدہ حکومت کے وجود کے لیے وہ سم قاتل ہیں۔ سائلین یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس قسم کے مظاہرے جاری رہیں اور ان کے ساختہ پرداختہ اثرات کے تحت وضع قانون میں خصوصیت کے ساتھ انہیں اہمیت دی گئی تو محکوموں کو اپنے حاکموں کے منصوبوں پر جو اعتماد ہے اسے کسی قسم کی دانشمندی اور بردباری برقرار نہ رکھ سکیگی اور اس اعتماد کے بغیر باشندگانِ ملک کی ترقی کی کوششیں بھی بے سود رہیں گی۔

سائلین دہشت کے بغیر اس تلقین کا تصور نہیں کر سکتے جو آج کل شد و مد کے ساتھ اس امر کے متعلق کی جا رہی ہے کہ ہندوستان پر وہاں کے مقیم انگریزوں کے مفاد کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت کی جائے یا ہندوستان کی حکومت میں ملکہ معظمہ کی یورپ نژاد رعایا کے لیے ہر طرح کا فائدہ بہم پہنچایا جائے بجز اس کے کہ جو اپنی دماغی برتری، باشندوں کی روز افزوں مرفہ الحالی پیداوار ملک کے ذرائع کی ترقی اور تجارتی تعلقات کی توسیع سے لازماً وہ خود حاصل کرے۔ سائلین کے خیال میں انگلستان کی حکومت ہند کی نہایت قابلِ احترام خصوصیت یہ ہے کہ اس نے حاکم اور محکوم قوم کی تفریق روا نہیں رکھی بلکہ یہ قرار دیا ہے کہ اس کا اولین فرض باشندگان ہند کی بہبودی سے متعلق ہے۔ سائلین یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت ان کی جو زیادہ مخالفت کی جا رہی ہے اس کا سبب یہی خیال ہے کہ وہ اصول مذکور کے

خاص طور پر نگہبان ہیں اور جب تک حکومت ہند میں ان کا کوئی دخل ہے اس کی پاسبانی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ سائلین اپنے اس عقیدے کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتے کہ حکومت کے کسی شعبے سے ان کی بے دخلی کو ہندوستان میں فی الوقت یہی تصور کیا جائے گا کہ اس اصول پر پہلی کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

بنابریں سائلین معزز ارکان دارالامرا کی خدمت میں نہایت صدق وصفا کے ساتھ گزارش کرتے ہیں کہ اگر زیر غور تبدیلی بجائے خود مناسب ہی سمجھی جائے تو موجودہ زمانہ اس کے نفاذ کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ سائلین معزز ارکان دارالامرا سے بصد ادب ملتجی و مستدعی ہیں کہ اس قسم کی تبدیلی کو کم از کم اس وقت تک کے لیے ملتوی کرنے کی ضرورت ہے جبکہ اس کا نفاذ ایسے زمانے میں ہو سکے کہ باشندگان ہند کے دلوں سے یہ خیال محو ہو جائے کہ اس کا براہ راست تعلق حال کے تکلیف دہ واقعات سے اور ان جذبات سے ہے جو واقعات مذکور کے باعث پیدا ہوئے یا جن کے اظہار کے مواقع پیش آئے۔ سائلین کا یہ معروضہ ہے کہ اس قسم کے التوا سے حکومت ہند کی تنظیم سے متعلق مختلف مسائل پر اس رائے کی بہ نسبت جواب تک قائم کی گئی یا عوام کی موجودہ حالت انتشار میں قائم کی جا سکتی ہے زیادہ پختہ رائے قائم کرنے کی مہلت ملے گی اور قوم کے قابل ترین افراد کو اس امر پر اطمینان سے غور کرنے کا موقع مل سکے گا کہ آیا انگلستان کی حکومت ہند کے لیے کوئی ایسی جدید تنظیم جو موجودہ حکومت کی بہ نسبت خوش انتظامی کے کثیر تر لوازم کی حامل ہو عمل میں لائی جا سکتی ہے اور اگر اس قسم کی تنظیم ممکن العمل ہو تو ان متعدد تجاویز میں سے جو پیش کی جا چکی ہیں یا کی جا سکتی ہیں کس میں لوازم مذکور بدرجۂ غایت پائے جاتے ہیں۔

سائلین نے ہمیشہ بہ رضا و رغبت ان تغیرات سے اتفاق کیا ہے جو پارلیمنٹ میں بحث و تحقیق کے بعد عام فلاح و بہبود کے لیے مناسب تصور کیے گئے خواہ ان کی وجہ سے سائلین کو اہم قربانیاں ہی کیوں نہ کرنی پڑی ہوں۔ سائلین کا اشارہ ان امور کی طرف ہے کہ ۱۸۱۳ء میں انہوں نے تجارت سے جزواً کنارہ کشی اختیار کرلی؛

۱۸۳۳ء میں اسے کلیۃً ترک کر کے اپنے منشور تجارت کو پس پشت ڈال دیا۔ اپنے تجارتی اثاثے کو جس کی مقدار ...۵۰،۵۵،۱۵ پونڈ تھی ہندوستان کے خزانے میں داخل کر دیا۔ یہ رقم اُس رقم سے بہت زیادہ ہے جو ملکی حقوق و مطالبات کے ماسوا سرمائے کے لحاظ سے سائلین کو بالآخر واجب الوصول ہے اور ۱۸۵۳ء میں سائلین نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا جس کی بنا پر مجلس نظما کی جدید تشکیل عمل میں آئی اور ان نظما کی موجودہ تعداد قرار پائی۔ انھیں جذباتِ وفاداری کو برقرار رکھتے ہوئے سائلین نہایت خندہ پیشانی سے ملکہ معظمہ کی حکومت کے ساتھ اُن نقائص کی اصلاح میں تعاون کریں گے جو موجودہ نظام حکومت کے اجزا میں پائے جاتے ہوں اور اگر ہندوستان کی حکومت پر نگرانی کا کوئی بہتر نظام تجویز کیا جا سکے تو وہ چون و چرا کے بغیر اس بار امانت سے کلیۃً سبکدوش ہونے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن چونکہ سائلین کو اس امر کا یقین واثق ہے کہ اس قسم کے نظام کی تعمیر میں بعض ایسی شرائط بھی ہیں جنھیں نہایت خطرناک نتائج کا سامنا کیے بغیر ترک نہیں کیا جا سکتا اس لیے سائلین بصد ادب و احترام ان شرائط کے متعلق اپنے خیالات معزز ارکان دار الامرا کے فیصلے کے لیے پیش کرتے ہیں اور متوقع ہیں کہ اگر معزز ارکان دار الامرا ان خیالات سے اتفاق کرنے کی وجہ پائیں تو ہندوستان کی حکومت سے متعلق کسی ایسے انتظام کی قانوناً منظوری صادر نہ ہو گی جو زیر بحث شرائط کو کم از کم موجودہ انتظام کے مساوی درجے پر پورا نہ کرتا ہو۔

سائلین اس توقع کی جرأت کرتے ہیں کہ ہندوستان کی حکومت کے اُس حصے کو جس کا تعلق انگلستان سے ہے تاج کے کسی وزیر کے سپرد کرنے کی تجویز ایک ایسی مجلس کے اضافے کے بغیر نہ کی جائے گی جو معاملاتِ ہند کا تجربہ رکھنے والے مدبرین پر مشتمل ہو۔ ملکہ معظمہ کے وزرا سے یہ امر مخفی نہ ہو گا کہ کسی غیر ملک خصوصاً ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے علم اور خاص معلومات کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کسی اور پیشے کے لیے ہوا کرتی ہے اور یہ معلومات ممکن نہیں کوئی ایسا شخص حاصل کر سکے جس نے اپنی زندگی کا معتدبہ حصہ اس کی

تحصیل میں صرف نہ کیا ہو۔

تجربہ کار مشیروں کی ایک ایسی مجلس قایم کرتے ہیں جو وزیر ہند کی شریک کار ہوگی اس امر کو ذہن نشین رکھنا سائلین ضروری خیال کرتے ہیں کہ یہ مجلس نہ صرف وزیر موصوف کو مشورے دینے کے قابل ہو بلکہ اپنے مشوروں سے ایک حد تک اخلاقی دباؤ بھی ڈال سکے۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ہندوستان کے متعلق وزیر ہند بذات خود معلومات حاصل کریگا جبکہ اس کے پاس ان جماعتوں اور لوگوں کے متواتر معروضات پہنچینگے جنہیں اس ملک کے حالات سے قطعاً واقفیت نہ ہوگی یا صرف اس قدر ہوگی کہ وہ اپنے سے بھی کم واقفیت رکھنے والوں کو فریب دے سکینگے اور ان کے پیش نظر اکثر و بیشتر ایسے مقاصد ہونگے جن کو ہندوستان کی عمدہ حکومت سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ رائے عامہ کے اظہار کے ذرائع سے جو اثرات وزیر موصوف پر ڈالے جاسکتے ہیں وہ بھی اکثر صورتوں میں گمراہ کن ہونگے۔ انگلستان کے عوام جو معاملات ہند سے قطعاً واقف نہیں ہیں صرف انھیں اشخاص کی تحریکات کا اتباع کرسکینگے جو ان کی رائے کو متاثر کرنے کی انتھک کوشش کرینگے اور یہ اشخاص عام طور پر وہی ہونگے جن کے پیش نظر ذاتی اغراض کی تکمیل ہوگی۔ لہذا سائلین کے خیال میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ انگلستان کی حکومت ہند کی شریک کار جو مجلس ہو اسے اپنے ارکان سے کافی مدد ملے اور وزیر ہند کے ساتھ اس کا ایسا تعلق قائم ہو جس سے ان حملوں کی بخوبی روک تھام ہوسکے جو اس ملک کے عوام کی خود غرضی و لاعلمی کے باعث ہوا کرتے ہیں۔ ان حملوں سے حکومت ہند اب تک محفوظ و مامون رہی ہے لیکن ان کے متعلق یہ توقع بیجا ہوگی کہ خود پارلیمنٹ کافی حفاظت کا بندوبست کرے۔

سائلین، حکومت ہند کی اس سے بدتر کسی صورت کا تصور نہیں کرسکتے کہ وہ ایک وزیر ہند اور ایسی مجلس پر مشتمل ہو جس سے مشورہ کرنے یا نہ کرنے کی خاطر خواہ آزادی وزیر موصوف کو حاصل رہے یا جس کے مشورے کو وہ اپنی تحریری وجوہ تیقن آفریں طریقے پر پیش کیے بغیر رد کرسکے۔ سائلین یہ گزارش

کرتے ہیں کہ اس قسم کا انتظام ان کی رائے میں فی الواقع انھیں اعتراضات کا ہدف بن جائیگا جو غلط فہمی سے موجودہ انتظام پر وارد کیے گئے ہیں۔ سائلین ادب کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ وزیر ہند کی شریک کار کوئی مجلس جو تنقیح کا کام نہ کرے محض پردہ دار ہوگی۔ جب تک مجلس اس طرح قائم نہ کی جائے کہ وہ ذاتی طور پر وزیر موصوف کے اثر سے آزاد ہو جب تک اسے اپنی اس ذمہ داری کا احساس نہ ہو کہ وہ ہندوستان کے ہر معاملے پر رائے زنی کرے اور اس رائے کے قبول کرنے پر وزیر موصوف کو مجبور کرے خواہ وہ رائے وزیر کے پسند خاطر ہو یا نہ ہو اور جب تک وزیر اس امر کا پابند نہ ہو کہ مجلس کی رائے سے اختلاف کرنے کی صورت میں وہ اپنی وجوہ قلمبند کرے اس وقت تک مجلس، وزیر کی ذمہ داریوں کو کمزور کرتی رہیگی اور جن تجاویز کے مرتب کرنے میں فراست اور تجربے سے کام نہ لیا گیا ہو انہیں بظاہر ان اوصاف سے متصف کر کے وہ منظور کرتی جائیگی۔

یہ توقع عبث ہوگی کہ کسی نئی مجلس میں اس قدر اخلاقی اثر اور قوت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی رائے مجلس نظما کی طرح زور کے ساتھ ظاہر کر سکے۔ ایک نئی مجلس ان احساسات و اختیارات کی وارث نہیں ہو سکتی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی قدامت اور تاریخی فوقیت کی بنا پر میسر ہیں۔ یہ صورت بعینہٖ ایسی ہے کہ اگر کوئی جماعت مقننہ ایک نئے نام سے وسٹ منسٹر میں قائم ہو تو اس میں وہ اخلاقی فوقیت نہیں ہو سکتی جو دارالامرا اور دارالعوام کو حاصل ہے۔ پس ہندوستان کے لیے جو نئی مجلس بھی بنائی جائیگی وہ لازماً موجودہ نظام کے مقابلے میں اہم ترین فوائد کے عنصر سے خالی رہیگی۔

سائلین کو یہ تصور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کسی مجلس میں بھی جس کے کل ارکان تاج کے نامزد کردہ ہوں قول و فعل کی وہی آزادی پائی جائیگی جو مجلس نظما کی امتیازی خصوصیت ہے۔ چونکہ ان ارکان کی نامزدگی ایک ہی حکومت کے زیر اقتدار ہوگی اور ان میں سے اکثر غالباً خود اسی واحد وزیر کے نامزد کردہ ہونگے جس پر نگرانی کی غرض سے وہ مقرر کیے جائینگے اور جس کی جانب وہ اپنے دوبارہ

تقرر کے لیے رجوع کرینگے اس لیے ان کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ اپنے کو اس کے نزدیک اہل ثابت کر دکھائیں اور اس کی ناراضی سے گریز کریں جو اس کی رایوں سے ان کے کسی پُرزور اختلاف کے باعث پیدا ہوگی۔ یہ منصوبے اس قدر زبردست ہونگے کہ ان کے قوی و مضر اثرات ارکان مجلس کے طرزِ عمل پر حاوی رہینگے۔ سائلین کسی ایسے طریقے سے واقف نہیں ہیں جس کے ذریعے ان مضر اثرات کو دور کیا جا سکے بجز اس کے کہ ججوں کے تقررات کی طرح ارکان مذکور کے تقررات کو عمدہ کارگزاری پر موقوف رکھا جائے لیکن ایسی صورت میں کسی غلطی کو جو ایک مرتبہ سرزد ہو جائے ناقابل اصلاح قرار دینا واقعی قابل اعتراض ہوگا۔

سائلین یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ اگر نگران سکار مجلس کلیتہً وزیر کی نامزد کردہ ہو تو جماعت بندی اور پارلیمنٹ کے اثرات سے اس خوش آیند استغنا کے جاری رہنے کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے جو اب تک ہندوستان کے نظم و نسق میں نیز اس ملک کی ذمہ دار و اہم خدمات کے تقررات میں نمایاں رہا ہے۔ سائلین کا یہ اعتقاد ہے کہ کسی حکومت نے جس کے حالات تاریخ میں مذکور ہوں اپنے عہدوں پر خصوصاً اعلیٰ عہدوں پر جوہر ذاتی کے سوا کسی اور لحاظ سے تقررات نہیں کیے ہیں۔ یہ امتیازی خصوصیت اگر ہندوستان کو حاصل نہ ہوتی تو ایک مدت قبل ہی وہ یقیناً انگلستان کے قبضے سے نکل چکا ہوتا۔ سائلین کا یہ بھی خیال ہے کہ خصوصیت مذکور بالکلیہ اس صورت حال پر مبنی ہے کہ مقتدر حکام ایسے اشخاص رہے ہیں جو کسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے نہ جنہیں پارلیمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں عہدوں پر تقررات حسب دستور مقامی حکام کے غیر جانبدارانہ فیصلے پر چھوڑ دیئے گئے اور سیول و فوجی خدمات کے لیے علی العموم متوسط طبقے کے افراد نامزد کیے گئے۔ اس نامزدگی میں کسی سیاسی خیال کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور زیادہ تر انھیں اشخاص کے اعزّہ و اقارب نامزد کیے گئے جنہوں نے ہندوستان میں اپنی خدمات سے شہرت حاصل کی تھی۔

بایں وجہ سائلین اس امر کو ناگزیر خیال کرتے ہیں کہ جو مجلس اپنے مشوروں سے وزیر ہند کی اعانت کرے اس کے بیشتر ارکان کی نشستوں کا تعین وزیر موصوف کے اختیار سے بے نیاز ہو۔

سائلین کی رائے میں یہ امر بھی کم اہم نہیں ہے کہ اجرائے کار کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی حکومت میں مجلس مذکور حقیقی طور پر ہاتھ بٹا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سائلین کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جو مراسلات ہندوستان بھیجے جائیں انہیں وزیر تیار کر کے مجلس کے سامنے پیش نہ کرے بلکہ مجلس انہیں تیار کر کے وزیر کے سامنے پیش کرے۔ یہ انتظام اس فطری و بدیہی اصول کے مطابق ہوگا کہ جو اشخاص کسی معاملے کا علم رکھنے کی بنا پر منتخب ہوں وہی اس کی انجام دہی کی صورت بھی تجویز کریں بجائے اس کے کہ دوسروں کی پیش کردہ تجاویز پر صرف اظہار رائے کر دیں۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کی بنا پر مجلس کے ارکان اپنی وقعت کو اور اپنے پیش نظر معاملات پر کافی غور و خوض کرنے کی اہم ذمہ داری کو محسوس کر سکتے ہیں۔ سائلین کے لیے یہ بیان کرنا تقریباً غیر ضروری ہے کہ محض پیش شدہ تجویز سے اتفاق کرنے کی بجائے خود کسی تجویز کو پیش کرنے میں دماغ سے بہت زیادہ زور کے ساتھ کام لینا پڑتا ہے۔ آخری فیصلہ تو یقیناً وزیر پر موقوف ہوگا۔ اگر وہ تحریکات بھی کرانے لگے تو اسے وہ تمام اختیارات حاصل رہینگے جو عملاً اہم سمجھے جاتے ہیں۔ کسی مجلس کا مسلمہ کام صرف نکتہ چینی کرنا ہو تو وہ اس کام سے بہت جلد کنارہ کش ہو جائیگی۔ اس کے ارکان یہ محسوس کرینگے کہ ہندوستان کی حکومت چلانے میں ان کا تعاون فی الحقیقت درکار نہیں ہے بلکہ کاروبار کی انجام دہی میں ان کے وجود سے رکاوٹ ہی ہوتی ہے۔ جب کوئی امر ان کے متفقہ مشورے کے بغیر فیصل کر لیا جائیگا تو اس پر ان کی نکتہ چینی بے محل خلل انداز اور مزاحم سمجھی جائیگی اور یہ اغلب ہے کہ ان کے اس عہدے کے لیے آئندہ وہ لوگ بھی خواہش نہ کریں جو اس کے اہم ترین فرائض کے برائے نام ہی قائم رہنے پر رضامند تھے۔

مراسلات ہند کی تیاری کے کام میں وزیر ہند کے عملے کی نامزدگی و نگرانی کے فرائض بھی لازماً شامل رہینگے۔ یہ صورت سائلین کے نزدیک مجلس کی اہمیت کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔ اگر وہ عہدہ دار جن کی وساطت سے مجلس کام کرے گی کسی ایسے حاکم کے براہ راست ماتحت ہوں جو مجلس سے بالادست ہو تو تمام اہم کارروائیوں پر فی الواقع وزیر اور عملۂ ماتحت کے درمیان غور وخوض ہوا کریگا اور مجلس کو بالکل نظر انداز کر دیا جائیگا۔

ایک تیسرا امر جو سائلین کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ ہے کہ مجلس کے ارکان کی تعداد بہت زیادہ محدود نہ ہونی چاہیے۔ ہندوستان ایک ایسا وسیع خطہ ہے جس کے معاملات کے ہر جزو سے ارکان مذکور کی ایک قلیل تعداد علمی واقفیت حاصل نہیں کر سکتی۔ مجلس میں ایسے ارکان ہونے چاہئیں جنہیں دنیا کا عام تجربہ اور علم ہو نیز اس میں ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جنہیں مالیات، مالگزاری، عدالت، سیاست اور فوج کا خاص تجربہ حاصل ہو۔ مجلس میں ایسے اشخاص بھی ہوں جنہیں بنگال، مدراس، بمبئی، صوبہ جات شمال مغربی، پنجاب اور دیسی ریاستوں کے گوناگوں معاشرتی تعلقات اور مختلف النوع ادارات کا بخوبی علم ہو۔ موجودہ مجلس نظماء میں بھی جس کی تنظیم جدید ۱۸۵۳ء کے قانون سے ہوئی تھی علم اور تجربے کے لحاظ سے وہ تمام خوبیاں موجود نہیں ہیں جو اس قسم کی مجلس میں ہونی چاہئیں۔ سائلین کا یہ معروضہ ہے کہ تمام تقررات کو بہترین تصور کرنے پر بھی ارکان مجلس کی اس تعداد کو جو بالکل کافی سمجھی جائے محدود کر دینا قرین مصلحت نہ ہوگا۔ تھوڑی سی گنجائش اس ناکامی کے خیال سے بھی رکھنی چاہیے جو بہترین انتخاب کے باوجود بعض اوقات پیش آجاتی ہے۔ علاوہ بریں سائلین اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اگر نامزدگیاں ایسے وزرا کی جانب سے عمل میں آئیں جو کسی سیاسی جماعت کے سردار ہوں تو وہ ہمیشہ شخصی قابلیتوں کی مخصوص بنا پر نہ ہونگی لہذا اس امر کا انتظام ناگزیر ہے کہ نامزد کرنے والے حاکم کی ایسی غلطیاں یا خامیاں جب کبھی محض اتفاقی طور پر رونما ہوں تو ان کا مضر اثر مجلس مذکور کی کارکردگی پر نہ پڑے۔

مذکور بالا خیالات جہاں ایک ایسی مجلس کی پر زور تائید کرتے ہیں جس کے ارکان کی تعداد موجودہ مجلس کے مقابلے میں کم نہ ہو خواہ یہ ارکان وزیر کے محض مشیر ہی سمجھے جائیں وہاں وزیر پران کی نگرانی کے فرائض کے لحاظ سے سائلین کا خیال ہے موجودہ تعداد میں کسی بڑی تخفیف پر سخت اعتراض وارد ہوگا۔ چھ یا آٹھ ارکان والی مجلس، اٹھارہ ارکان والی مجلس سے خود اعتمادی کے اس آزادانہ جذبے میں ہمسری نہیں کر سکتی جو ایک عام مجلس کو اس امر کی ترغیب دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ وزیر کو اپنی اس رائے سے متاثر کرے جسے وہ ناقابل قبول سمجھتا ہے۔ ایسی چھوٹی مجلس کے لیے خواہ دیگر حیثیتوں سے وہ صحیح اصول ہی پر قائم کیوں نہ ہو اس امر کا امکان رہتا ہے کہ بجز خاص خاص صورتوں کے اس کے ارکان کے دلوں میں اپنے خیالات پر جمے رہنے کی خواہش کی بجائے وزیر کی ناراضی سے گریز کرنے کی عام رغبت غالب رہیگی۔

باایں ہمہ اگر معزز ارکان دارالامرا کی رائے میں ایسی مجلس قائم کی جا سکتی ہے جس میں شائستہ حکومت کی مذکور بالا صفات مجلس نظما کی بہ نسبت بدرجۂ اتم موجود ہوں تو سائلین بہ عجز و نیاز صرف یہ توقع ظاہر کرینگے کہ اس مقصد میں معزز ارکان کی مساعی کامیاب ہوں۔ لیکن انگلستان کی حکومت ہند کی خوش انتظامی کے حالات بیان کرنے میں اگر سائلین نے فی الواقع ان صفات کو گنایا ہے جو موجودہ نظام حکومت میں پائی جاتی ہیں تو سائلین کا یہ معروضہ ہے کہ معزز ارکان دارالامرا، مجلس نظما کے موجودہ اختیارات کو برقرار رکھیں۔

سائلین کو اس امر کا علم ہے کہ انگلستان کی موجودہ حکومت ہند کو دو عملی حکومت سے تعبیر کر کے مطعون کیا جاتا ہے اور ہر ایسا انتظام جس کے ذریعے وزیر کے اختیار تمیزی پر نگرانی کی جا سکے اسی طرح نشان ملامت ہوگا۔ لیکن سائلین کا خیال ہے کہ یہ لعن طعن بالکلیہ اس غلط فہمی پر مبنی ہے جو انگلستان کی حکومت ہند کے مفوضہ فرائض کے متعلق نیز اس حکومت پر ان اصول کے اطلاق کے بارے میں پھیلی ہوئی ہے جو خالص انتظامی صیغوں کے لیے موزوں ہیں۔ ہندوستان کی حکومت عاملانہ کا مرکز ہندوستان ہی میں ہے اور یہیں اسے ہونا بھی چاہیے۔

مجلس نظما کو کسی امر کے انتظام سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا اسے اس کی جانچ سے ہے۔
اس کا نیز حکومت انگلستان کا بڑا فرض علی العموم انتظام کی تفصیلات کے متعلق
ہدایت دینا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ حکومت ہند کے گزشتہ اعمال کو جانچنے
کے بعد ان کی اصلاح کی جائے اس کی آیندہ رہنمائی کے لیے اصول مقرر کر کے
عام ہدایات جاری کی جائیں اور ان اہم سیاسی تجاویز کو جو بغرض فیصلہ انگلستان
روانہ کی جائیں منظور یا مسترد کیا جائے۔ یہ فرائض مجلس عاملانہ کے فرائض کی بہ نسبت
پارلیمنٹ کے فرائض سے زیادہ مشابہ ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پارلیمنٹ نیز
حکومت ہند کو اُن اصول پر قائم ہونا چاہیے جو کسی مجلس عاملانہ کے لیے موزوں
ہوتے ہیں۔ حکومت کا نہ صرف دو عملی بلکہ سہ عملی ہونا پارلیمنٹ کے دستور میں ایک خوبی
تصور کی جاتی ہے نہ کہ خامی۔ سائلین کا یہ معروضہ ہے کہ بلحاظ افادت مجلس عاملانہ
کے اختیارات اکثر ایک شخص کے تفویض کیے جا سکتے ہیں کیونکہ فوری کارروائی کرنا
اس کا اولین فرض ہے لیکن گزشتہ کارروائیوں پر صائب رائے دینا اور آیندہ
طرز عمل کے متعلق اصول مقرر کرنا ایک ایسا کام ہے جس کے لیے سائلین کے خیال میں
ایک سے زاید اشخاص کے اتفاق آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کی مجلس کا دو عملی
ہونا اس کی کوئی خامی نہیں اور اس کے اختیارات ایک شخص کو عطا کرنا اس کی کوئی خوبی
نہیں خاصکر جبکہ یہ مجلس اس طرح تشکیل پائے کہ اس سے اُن اشخاص کو علیحدہ
کر دیا جائے جو سابق تجربے کی بنا پر ہر وقت موزوں ترین ثابت ہو سکتے ہیں
اور جو اس مجلس کے مخصوص فرض کی انجام دہی کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔

سائلین نے یہ بیان بھی سنا ہے کہ اس حکومت کے باعث جو دو عملی کے
نام سے موسوم ہے حکام ہند پارلیمنٹ اور قوم کے نزدیک اس قدر جواب دہ
نہیں ہیں جس قدر سلطنت کی حکومت کے دوسرے شعبے ہیں کیونکہ یہ معلوم کرنا
ممکن نہیں کہ حکومت انگلستان کی دو شاخوں میں سے کس پر ذمہ داری عائد ہونی چاہیے۔
سائلین بلا خوف تردید اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ یہ خیال نہ صرف بے بنیاد ہے
بلکہ صداقت کے بالکل خلاف ہے۔ انگلستان کی حکومت ہند سلطنت کی حکومت کے
کسی دوسرے شعبے سے کچھ کم ذمہ دار نہیں بلکہ زیادہ ہی ہے کیونکہ مجلس مامورین کا

صدر جو وزیر ہند ہے ملکہ معظمہ کے دوسرے وزرا کی طرح برابر کا ذمہ دار ہے اور مزید براں اس کے مُشیر بھی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان کے بارے میں اس امر کا ہمیشہ یقین رہتا ہے کہ جو کچھ کیا گیا ہے وہ صدر مجلس مامورین کے حکم یا اس کی منظوری سے ہوا ہے۔ اس سے زائد ذمہ داری سائلین کے خیال میں ملکہ معظمہ کی حکومت کے کسی شعبے میں بھی نہیں پائی جاسکتی کیونکہ یہ ممکن نہیں اور عقل بھی اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ ملکہ معظمہ کا کوئی وزیر اپنے قابل اعتماد مُشیروں کے بغیر اپنا کام انجام دیتا ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ملکہ معظمہ کے کسی دوسرے وزیر کی بہ نسبت وزیر ہند کو اُن اشخاص کے مشوروں پر زیادہ بھروسہ کرنا پڑتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی اُس شعبے کے لیے وقف کر دی ہے جس میں ان کے مشورے لیے گئے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے لیے وزیر موصوف کو جو مُشیر دیے جاتے ہیں ان کا تقرر حکومت کے دستور کے مطابق عمل میں آتا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے مشوروں کے اتنے ہی ذمہ دار ہیں جتنا ان کا وزیر اپنے احکام کا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے شعبوں میں وزیر کو جو مُشیر حکومت کی طرف سے دیے جاتے ہیں وہ اس سے رتبے میں کم ہوتے ہیں۔ یہ مُشیر اکثر اپنے فن میں بڑے ماہر اور تجربہ کار ہوتے ہیں لیکن عوام میں ان کی وقعت نہیں ہوتی اور عوام اکثر ان کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے۔ دفتری رازداری کی وجہ سے ان کے مشوروں کا کسی کو علم ہونا خارج از امکان ہے اور وہ صرف وزیر ہی کے نزدیک جواب دہ ہوتے ہیں۔ اتنا عرض کرنے کے بعد سائلین یہ سوال غیر ضروری خیال کرتے ہیں کہ کس اصطلاح میں اس حکومت کو ذمہ دارانہ اور سائلین و مجلس ہند کی متحدہ حکومت کو غیر ذمہ دارانہ کہا جا سکتا ہے۔

چونکہ سائلین کو اس اصول کا علم نہیں ہے جس کی بنا پر ملکہ معظمہ کے وزرا، کمپنی کے ملازمین کو راست تاج کے تحت لانے کا خیال رکھتے ہیں اس لیے سائلین ہندوستانی فوج کے نازک مسئلے پر اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتے کہ فوج مذکور کے عہدہ داروں کی اعلیٰ فوجی قابلیتیں ایک بڑی حد تک بے شبہ اس بنا پر معرض ظہور میں آئی ہیں کہ یہ فوج ایک خاص اور منتظم فوج ہے جس میں

ملکۂ معظمہ کے کمیشن یافتہ عہدہ دار ہیں جو ملکۂ ممدوحہ کے دیگر عہدہ داروں کے ہم رتبہ ہیں اور اس مساوات میں کسی تغیر کو سائلین بہت برا سمجھتے ہیں۔

پس مذکورِ بالا جملہ امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے سائلین معزز ایوان سے یہ عاجزانہ استدعا کرتے ہیں کہ موجودہ ناخوشگوار حالات کی موجودگی میں حکومت ہند کے دستور میں کسی قسم کی تبدیلی کی منظوری اس وقت تک صادر نہ فرمائی جائیگی جب تک موجودہ نظام حکومت کی کارروائیوں کے متعلق قبل از وقت کافی تحقیقات نہ کرلی جائے۔ علاوہ بریں سائلین کی یہ بھی استدعا ہے کہ اس قسم کی تحقیقات حکومت ہند کے ہر شعبے کے متعلق کی جائے۔ سائلین ادب کے ساتھ اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ اس تحقیقات سے نہ صرف سائلین کے حق میں انصاف ہوگا بلکہ اس لحاظ سے کہ اس صدی میں پہلی مرتبہ اس ملک کے ہر عام شخص کی نظر ہندوستان پر پڑی ہے یہ تحقیقات زیادہ مکمل ہوگی اور زمانہ ماقبل کی کسی تحقیقات کے مقابلے میں اس کے نتائج پارلیمنٹ اور اہل ملک کے لیے زیادہ مفید ہونگے۔

***نظامِ حکومتِ دوعملی پر تبصرہ**

مجھے یقین ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں بہت سے اچھے کام انجام دیے ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ اس کے نظم ونسق سے اس کی محکوم آبادی کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ تاریخ انسانی کا غالباً یہ ایک نہایت غیر معمولی واقعہ ہے کہ جزائر برطانیہ کو کرۂ ارض کے ایک دور و دراز حصے پر ایک وسیع حکومت حاصل ہوجائے یعنی وہ حکومت جو ہم براعظم ہندوستان پر کر رہے ہیں۔ یہ واقعی حیرت انگیز ہے کہ یہ خطے جن کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہاں انسان پہلی مرتبہ علوم وفنون سے روشناس ہوا ہے اب ایسے جزائر کے باشندوں کے زیر حکومت ہوں

---

*Source.—Viscount Palmerston. Speech in the House of Commons, February 12, 1858, in introducing the First Bill for the Government of India. (Hansard.)

جو اس وقت کامل بربریت کی حالت میں تھے جبکہ یہ مشرقی خطے بہ لحاظ تمدن و آسودہ حالی اپنے انتہائے عروج پر تھے۔ یہ صورت حال حیرت افزا ہے لیکن اس سے بھی عجیب تر امر جو اپنی نوعیت میں بالکل نرالا ہے یہ ہے کہ یہ قوم جس کے یہاں حکومت کا فن غالباً دوسری سب قوموں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاتا ہے اور جس کے یہاں اصول نیابت مدتوں سے قائم ہے اس قدر وسیع حصص ملک، عظیم مفاد اور کثیر آبادی کے انتظام کو دیدہ و دانستہ تجارتی اشخاص کی ایک چھوٹی سی جماعت کے تفویض کر دے۔

لیکن مذکورہ بالا عمل اس ملک سے عمداً کبھی نہیں ہوا۔ موجودہ صورتِ حال ایک حقیر بنیاد سے بتدریج ترقی پذیر ہوئی ہے۔ پہلے پہل وہاں بسنے والوں نے ایک کارخانے کی بنا ڈالی، یہ کارخانہ بڑھ کر بندرگاہ بن گیا، بندرگاہ ترقی کر کے ضلع ہو گیا، ضلع جلد صوبہ بن گیا اور اس کے بعد نیم مہذب ہمسایوں سے تصادم ہوا جس میں نقصانات کی تلافی کی فکر ہوئی، حملوں کی مدافعت کی تدبیر کی گئی اور ان تنازعات کا انجام ہمیشہ فتح اور توسیع علاقہ پر ہوا۔ اس طرح رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے جو معاملات پیش آئے ان سے وہ صورت پیدا ہوئی جس کی بدولت ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہت سے تجارتی حقوق مل گئے اور وہ نہایت اہم سیاسی فرائض کی ذمہ دار قرار پائی۔ یہ صورت حال ۱۷۸۴ء تک جاری رہی جب کہ مجلس نگران کا قیام عمل میں آیا اور کمپنی کے کاروبار میں سیاسی انتظامی فرائض کی ذمہ داری بھی شامل کر دی گئی۔ چند سال تک اس جدید انتظام کے تحت کام چلتا رہا اور اس دوران میں کمپنی، مجلس نگران کی معمولی مداخلت کے ساتھ اپنے سیاسی فرائض انجام دیتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے تمام تجارتی حقوق کا استعمال بھی کرتی رہی۔ یہاں کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس ملک میں پہلا قدم اٹھانے کے بعد گام زنی جاری رکھی جائیگی اور کوئی دوسرا کام شروع کرنے سے قبل دور اندیش برطانوی قوم اسی راستے پر جو ۱۷۸۴ء میں اختیار کیا گیا تھا چلتی رہیگی اور چونکہ اس وقت کے اختیار کردہ قانون کا منشا کمپنی کے سیاسی فرائض میں ایک حد تک کمی کرنا تھا اس لیے دوسرے قدم پر اسے ان فرائض سے بالکل سبکدوش کر دیا جائیگا

اور اس کی اصلی تجارتی حیثیت برقرار رکھی جائیگی۔ بااین ہمہ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک میں سیاسی معاملات کی بہ نسبت تجارتی معاملات میں زیادہ توجہ اور گہری دلچسپی کا اکثر اظہار کیا جاتا ہے چنانچہ دوسرے قدم پر یہ طے ہوا کہ آیندہ کمپنی کے سیاسی فرائض میں دخل نہ دیا جاوے بلکہ اس سے تمام تجارتی حقوق لے لیے جائیں جو اس کے وجود میں آنے کا حقیقی سبب بنے تھے۔ بنابریں ۱۸۳۳ء میں کمپنی کی تجارتی حیثیت قطعاً باقی نہ رہی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصلی کمپنی کا صرف ڈھانچہ رہ گیا۔ اس کی وہ تجارتی حیثیت جاتی رہی جس کی بنا پر ابتدا میں اس کا قیام عمل میں آیا تھا اور وہ محض ایک سیاسی آلۂ کار بن کر رہ گئی جس کے ذریعے ہندوستان کا نظم و نسق چلنے لگا۔

جناب عالی! میں اب یہ خیال ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس طرح جو انتظام کیا گیا وہ ایک نہایت گراں و غیر موزوں انتظام تھا۔ ہمارے نظام سیاسی کا اصل اصول یہ ہے کہ جملہ انتظامی فرائض کے ساتھ وزارت کی ذمہ داری بھی ہونی چاہیے یعنی یہ وزارت، پارلیمنٹ، رائے عامہ اور تاج کے سامنے جواب دہ ہو، لیکن اس معاملے میں حکومت ہند کے اعلیٰ فرائض ایسی مجلس کے سپرد کیے گئے ہیں جو پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اور نہ اس کا تقرر تاج کی طرف سے ہوا ہے بلکہ اسے ان اشخاص نے منتخب کیا ہے جن کا تعلق ہندوستان سے صرف اس بنا پر ہے کہ وہ ایک بڑے سرمایے کے مالک ہیں۔ میرے خیال میں یہ انتظام بنفسہٖ بہت زیادہ قابل اعتراض ہے۔ اس ملک میں ہم عجلت کے ساتھ تبدیلیاں نہیں کرتے ہیں۔ تغیر و تبدل کی جانب راغب نہ ہونا ایک دانشمندانہ و مفید طرز عمل ہے جو عام اصول کے لحاظ سے دانائی پر مبنی ہے اور مذکورِ بالا قسم کے اداروں میں تو میں جلد جلد اور کافی غور و خوض کے بغیر تبدیلیاں کر کے بہت کچھ نقصان اٹھاتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ غیر دانشمندانہ و مضر طریقہ ہوگا کہ موجودہ نظام حکومت کو محض اس بنا پر بحال رکھا جاوے کہ وہ قائم ہو چکا ہے اور ایسی تبدیلیاں نہ کی جائیں جو قوم کے لیے سود مند ہو سکتی ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حکومت ہند کے موجودہ نظم ونسق کی نسبت جو "حکومت دوعملی" کے نام سے موسوم ہے اور کوئی انتظام زیادہ گراں ہو سکتا ہے؟ ۱۸۵۳ء کے مباحثوں میں جبکہ آخری مسودہ قانون ہند منظور ہوا تھا بکنگھم شائر کے معزز رکن (مسٹر ڈسرائیلی) نے سوال کیا تھا کہ حکومت ہند کا تعلق کس سے ہے اور وہ کس کو مقتدر گردانے جس پر اس وسیع سلطنت کے نظم ونسق کی ذمہ داری عائد ہو سکتی ہے۔ جناب عالی! میرے نزدیک اس کا کوئی ذمہ دار ہی نہیں اور اگر ہے تو اس کی ذمہ داری منقسم ہے۔ نظما کو جیسا کہ معزز رکن نے کہا تھا ہر امر پر اختیار کلی حاصل ہے چنانچہ وہ گورنر جنرل کو واپس بلا سکتے ہیں جس کی وجہ سے ہر بڑے سے بڑے نظام عمل میں فوری خلل واقع ہو سکتا ہے۔ اگرچہ گورنر جنرل کا تقرر تاج کی طرف سے ہوتا ہے اور نظما اس تقرر کو قبول کرتے ہیں تاہم انہیں اختیار مذکور حاصل ہے۔ حکومت کے فرائض اور اس کی ذمہ داری کو نظما مجلس نگراں اور گورنر جنرل ہند کے مابین تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مجلس نگراں حکومتِ وقت کی نمایندگی کرتی ہے اور اس دارالعوام اور رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس کا تقرر تاج کی طرف سے ہوتا رہا ہے اور وہ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتی ہے۔ نظما کا انتخاب وہ خواتین اور اصحاب کرتے ہیں جن کا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے اور جن میں سے اکثر و بیشتر معاملات ہند سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں۔ یہ اشخاص غالباً کلکتہ، بمبئی یا مدراس کے متعلق کچھ نہیں جانتے بجز اس کے کہ کسی احاطے کے بارے میں امیدواران نظامت سے انہیں یہ علم حاصل ہو جائے کہ وہاں جو فوجی خدمات تقرر طلب ہیں وہ ان کی آرا کے عوض انہیں مل سکینگی۔ اس میں شک نہیں کہ نظما علی العموم ایسے افراد ہوتے ہیں جو ہندوستان کا کافی علم اور وسیع تجربہ رکھتے ہیں لیکن ان کا انتخاب ایک ایسی جماعت کرتی ہے جسے مشرق کی عظیم الشان سلطنت پر حکومت کرنے کے لیے موزوں افراد منتخب کرنے کا کوئی خاص سلیقہ نہیں ہے۔ اس کے بعد گورنر جنرل کا رتبہ ہے جسے وسیع، جداگانہ اور آزادانہ اختیارات حاصل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام حکام کے درمیان کاروبار کی فوری یکسوئی اور

اغراض کی یکسانی نہیں ہو سکتی۔ پس مجھے یہ سوال اٹھانے کی اجازت ہی جائے کہ اس دارالعوام میں ملکۂ معظمہ کی حکومت کو کیا حیثیت حاصل ہے۔ جب مسائل ہند پر بحث ہوتی ہے تو جو لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں ان کی یہ مستقل عادت ہے کہ جو کچھ طے پا جاتا ہے اس پر نکتہ چینی اور اعتراض کرتے ہوئے ہر و تنوع پذیر امر کے لیے ملکۂ معظمہ کی حکومت کو ذمہ دار گردانتے ہیں۔ لیکن انصاف کا اقتضا یہ ہے کہ ملکۂ معظمہ کی حکومت کو جن امور پر پورا اختیار حاصل نہیں اور جن کا کما حقہ انتظام اس کے امکان میں نہیں ان کے لیے وہ ذمہ دار نہیں ٹھیرائی جا سکتی۔ یہ واقعہ ہے کہ اکثر موقعوں پر حکومتِ وقت کو اُن امور کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے جو اس کی رضامندی کے بغیر عمل میں آتے ہیں اور جن سے بعض صورتوں میں وہ غالباً مطمئن بھی نہیں ہوتی۔

*محکوم ملک پر حکمرانی کا بہترین انتظام حکومتِ کمپنی کی حمایت میں

ہندوستان جیسے ملک پر براہ راست حکومت کرنی کی بجائے اس کے لیے اچھے حکمران منتخب کر کے انگریزی قوم اس ملک سے متعلق اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ اس قوم کی جانب سے اس ملک کے لیے بدترین حکمران انگریزی کابینہ کا وزیر ہوگا جو ہندوستانی سیاسیات کی بجائے انگریزی سیاسیات کو پیش نظر رکھیگا اور جو اپنے عہدے پر اتنی مدت تک قائم نہیں رہ سکتا کہ اس قسم کے پیچیدہ معاملے میں دلجمعی کے ساتھ وہ دلچسپی لے سکے۔ مزید براں پارلیمنٹ میں جہاں دو یا تین فصیح البیان مقرر ہوں مصنوعی رائے عامہ اس پر ایسا قوی اثر ڈالتی ہے کہ گویا وہ کوئی اجتہادی رائے ہے اور وہ تربیت و حیثیت کا ایسا اثر محسوس نہیں کرتا جو اسے خود اپنی کوئی مستقل رائے قائم کرنے میں مدد دے سکے۔ اگر ایک آزاد ملک کسی دور و دراز ملک کے مختلف الوضع باشندوں پر اپنے ایک صیغۂ انتظامی کے ذریعے حکومت کرنے کی کوشش کرے تو اس میں اسے

---

*Source.—Mill. Considerations on Representive Government.

قطعی ناکامی ہوگی۔ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ حکومت ایک نیابتی مجلس کے توسط سے کی جائے جسے تقریباً مستقل حیثیت حاصل ہو اور سلطنت کی تغیر پذیر حکومت کو صرف نگرانی و تنسیخ کا اختیار رہے۔ اس قسم کی مجلس ہندوستان کے لیے موجود تھی اور مجھے اندیشہ ہے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں کو اس کوتاہ نظری کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑیگا جس کی وجہ سے اس موزوں طریق حکومت کو خیرباد کہہ دیا گیا۔

یہ کہنا کچھ سودمند نہیں ہے کہ ایسی نیابتی مجلس میں عمدہ حکومت کے تمام لوازم موجود نہیں ہوتے اور مزید براں یہ کہ اس مجلس میں کامل طور پر محکومین کے ساتھ یکسانی عمل کا میلان نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے حصول کی توقع اس وقت بھی مشکل سے ہو سکتی ہے جبکہ خود محکوم لوگ ایک حد تک اپنے معاملات کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ واقعی عمدہ حکومت موجودہ صورت حال کے باعث ناممکن ہے۔ ایک غیر مکمل نظام حکومت ہی کا انتخاب کرنا ہے مسئلہ صرف یہ ہے کہ ایک ایسی حکمران مجلس قائم کی جائے جو صورت حال کی دقتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت کی خوبیوں کی جانب زیادہ سے زیادہ اور برائیوں کی جانب کم سے کم راغب ہو۔ ان شرائط کو ایک درمیانی مجلس بہترین طور پر پورا کر سکتی ہے۔ براہ راست حکومت کے مقابلے میں ایک نیابتی حکومت کو ہمیشہ یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ اسے بہر صورت ان فرائض کے سوا جو محکومین سے متعلق ہوں اور کوئی فرائض انجام نہیں دینے پڑتے اور انھیں کے مفاد کے سوا دیگر مفاد کا اسے لحاظ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لیے حکومت کی بد انتظامی سے فائدہ اٹھانے کا جو قوی امکان ہے اسے حیرت انگیز طور پر اقل درجے تک کم کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے آخری دستور میں کیا گیا ہے اور اسے کسی انفرادی یا جماعتی مفاد کی بیجا طرفداری سے بالکل الگ رکھا جا سکتا ہے۔ جب انگلستان کی حکومت نیز پارلیمنٹ اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے وقت جو آخری چارہ سازی کے لیے محفوظ ہوتا ہے یک طرفہ اثرات سے مغلوب ہو جاتی ہے تو اس موقع پر یہی درمیانی مجلس شاہی عدالت کے سامنے محکوم ملک کی بہترین ترجمان اور وکیل

ہو سکتی ہے۔ علاوہ بریں رفتار حالات کے لحاظ سے درمیانی مجلس خصوصیت کے ساتھ ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جنہوں نے اپنے ملک کے اس علاقے کی خاص معلومات حاصل کی ہے جن کی تربیت خود اسی مقام پر ہوئی ہے اور جو اس کی حکومت کو اپنی زندگی کا اہم مشغلہ قرار دے چکے ہیں۔ ان اوصاف سے متصف ہو کر اور اس یقین کے ساتھ کہ وطن کے سیاسی واقعات کے باعث وہ اپنے عہدوں سے برطرف نہیں ہو سکتے وہ اپنی خاص امانت کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتے ہیں اور انہیں اپنی حکومت کی کامیابی نیز اپنے زیر انتظام ملک کی مرفہ الحالی میں مستقل طور پر جتنی زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اتنی نیابتی دستور کے تحت کسی کابینہ کے رکن کو کسی ملک کی عمدہ حکومت میں نہیں ہو سکتی بجز اُس ملک کے جس کی خدمت وہ کر رہا ہو۔ جس حد تک بر سر موقع انتظام کرنے والوں کے انتخاب کی ذمہ داری اس مجلس پر عائد ہوتی ہے وہاں تک ایسے تقررات کو جماعت اور پارلیمنٹ کے عیارانہ طریقوں سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور انہیں ان تحریکات کے اثر سے آزاد کیا جاتا ہے کہ اختیارات کا بیجا استعمال کیا جائے، وابستہ اشخاص کو انعام دیا جائے یا اُن لوگوں کو رشوت دی جائے جو بصورت دیگر مخالف ہوتے کیونکہ یہ تحریکات متوسط درجے کے دیانت دار مدبروں پر اُس ایماندارانہ احساس کی بہ نسبت زیادہ غالب رہتی ہیں جو موزوں ترین شخص کے تقرر سے متعلق ہوتا ہے۔ اس قسم کے تقررات کا مضر اثرات سے ممکنہ حد تک محفوظ رہنا اس صورت کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے کہ سلطنت کے دیگر تمام عہدوں میں نتائج پیدا ہو جائیں کیونکہ ہر دوسرے شعبے میں اگر عہدہ دار نااہل ہو تو جماعت کی رائے عامہ ایک حد تک اس کے فرائض کی انجام دہی میں مدد دیتی ہے لیکن ایک ایسے محکوم ملک کے حکام کی صورت میں جہاں لوگ بطور خود اپنے معاملات کی نگرانی نہیں کر سکتے حکومت کے حسن و قبح کا کامل انحصار صرف ان حکام کی اخلاقی و دماغی قابلیتوں پر ہوتا ہے۔

اس امر کو بار بار بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان جیسے ملک میں ہر شے حکومت کے کارکنوں کی ذاتی خوبیوں اور قابلیتوں پر منحصر ہے۔ یہ

صداقت، ہندوستانی حکومت کا ایک اصول عظیم ہے۔ جس روز یہ سمجھا جائیگا کہ ہندوستان میں آزادی کے ساتھ اہم خدمات پر اشخاص کا تقرر سہولت کے خیال سے کیا جا سکتا ہے دراں حالیکہ یہ خیال خود انگلستان میں ایک مجرمانہ صورت اختیار کر چکا ہے اسی روز سے وہاں ہماری سلطنت کے انحطاط اور زوال کا آغاز ہو جائیگا۔ اگرچہ بہترین امیدوار کو منتخب کرنے کی نیت خالص ہی کیوں نہ ہو تاہم ایسے لایق اشخاص کے متعلق یہ خیال کرنا مناسب نہیں کہ وہ اتفاقاً فراہم ہو جائینگے۔ خود نظام حکومت ایسا ہونا چاہیے جو قابل افراد پیدا کر سکے۔ موجودہ نظام حکومت نے اب تک یہی کیا ہے اور چونکہ اس کا ایسا عمل رہا ہے اس لیے ہندوستان میں ہماری حکومت جاری ہے اور ملک کی آسودہ حالی اور خوش انتظامی میں گو زیادہ عجلت کے ساتھ نہ ہی مسلسل ترقی ہوتی رہی ہے۔ اب اس نظام حکومت کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا جا رہا ہے اور اسے الٹ دینے کے لیے اس قدر زیادہ سرگرمی کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا حکومت کے عہدہ داروں کو ان کے فرائض کے متعلق تعلیم و تربیت دینا ایک بالکل نامناسب اور ناقابل تائید امر ہے جس سے نادانوں اور ناتجربہ کاروں کے حقوق میں بیجا مداخلت ہوتی ہے۔ ایک خفیہ سازش ان اشخاص کے درمیان معلوم ہوتی ہے جو اپنے اعزہ و اقارب کے لیے ہندوستان کے بہترین عہدے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جو ہندوستان میں پہلے ہی سے موجود ہونے کی بنا پر نیل کے کارخانے یا وکیل کے دفتر کا کام چھوڑ کر معدلت کا انتظام یا ان محاصل کا تعین کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں جو حکومت کو لاکھوں اشخاص سے واجب الوصول ہیں۔ سیول سروس پر قبضہ جس کی بہت کچھ مذمت ہو چکی ہے ایسا ہی ہے جیسا تمام عدالتی عہدوں پر طبقۂ وکلا کا قبضہ ہوا اور اس کی منسوخی اس امر پر دلالت کرے گی کہ ویسٹ منسٹر ہال کے اجلاس کو ہر ایسے نو وارد کے لیے کھول دیا جائے جس کے احباب یہ تصدیق کر دیں کہ اس نے گاہے گاہے سر ولیم بلاک اسٹن کی شرح قوانین انگلستان کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر کبھی یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ اس ملک سے

لوگ بھیجے جائیں یا انہیں یہ ترغیب دی جائے کہ وہ بیرون ملک جاکر اعلیٰ عہدوں پر متمکن ہو جائیں دراں حالیکہ ذیلی خدمتوں پر کارگزار رہ کر انہیں اپنے فرائض کا علم نہ ہوا ہو تو اہم ترین عہدوں پر ہمارے اسکاچ بھائی اور جانباز لوگ فائز ہو جائینگے اور پیشہ ورانہ جذبات کا لحاظ کرتے انہیں ملک یا مفوضہ کام سے کوئی تعلق ہوگا نہ پہلے ہی سے کوئی معلومات ہوگی اور ان کی خواہش صرف یہ ہوگی کہ جلد دولت پیدا کر کے وطن واپس ہو جائیں۔ ملک کی بہبودی اس امر میں مضمر ہے کہ جن اشخاص کو وہاں حاکم بنانا مقصود ہو انہیں عالم شباب میں صرف امیدوارانہ حیثیت سے بھیجا جائے تاکہ وہ ذیلی امور سے ابتدا کریں اور ایک مناسب مدت کے بعد جب وہ قابل ثابت ہوں تو اعلیٰ فرائض ان کے تفویض کیے جاسکیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام حکومت میں یہ نقص تھا کہ اہم ترین خدمات پر بہترین اشخاص کا انتخاب احتیاط کے ساتھ ہونے کے باوجود اگر کوئی عہدہ دار اپنی خدمت پر قایم رہتا تو ترقی کسی نہ کسی شکل میں گو دیر سے ہی انجام کار ہر کس و ناکس کو مل جاتی تھی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان عہدہ داروں میں ادنیٰ درجے کی قابلیت رکھنے والے بھی ایسے اشخاص تھے جنہیں اپنے فرائض سے کامل واقفیت تھی اور جو کم از کم کسی بدنامی کے بغیر اپنے بالادست کے زیر نگرانی واقتدار سالہا سال تک ان فرائض کو انجام دے چکے تھے۔ اس طرح اگرچہ نقص مذکور میں کمی ہوگئی تاہم وہ بڑی حد تک باقی رہا۔ ایک شخص جو مددگار کے فرائض سے زیادہ کام انجام دینے کی قابلیت نہیں رکھتا اسے تمام عمر مددگار ہی رہنا چاہیے اور اس کے مقابلے میں جدید الخدمت شخص کو ترقی دینی چاہیے۔ اس استثنا کے سوا مجھے ہندوستانی تقررات کے قدیم نظام میں اور کوئی خاص نقص نہیں معلوم ہوتا۔ اس نظام میں جو بہترین اصلاح کی جاسکتی تھی وہ پہلے ہی کردی گئی یعنی امتحانِ مقابلہ کے ذریعے اہل امیدواروں کا انتخاب ہونے لگا۔ اس طریقِ انتخاب کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کے محنت کش و قابل اشخاص مل جاتے ہیں اور اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ بجز اتفاقی صورت کے امیدوارانِ خدمات

اور عہدہ داران مقتدر کے درمیان کوئی ذاتی روابط نہیں ہوتے۔
یہ امر کسی طرح بعید از انصاف نہیں ہے کہ جو سرکاری عہدہ دار طریقِ مذکور پر منتخب ہوں اور تعلیم و تربیت پائیں صرف وہی ان عہدوں کے قابل سمجھے جائیں جن کے لیے ہندوستان سے متعلق علم اور تجربے کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اعلیٰ خدمات کا دروازہ خواہ موقتی غرض کی بنا ہی پر کیوں نہ ہو ان اشخاص کے لیے کھول دیا جائے جو ذیلی خدمات پر کارگزار نہ رہے ہوں تو پھر اس دروازے پر یکے بعد دیگرے با اثر اشخاص کا ایسا ہجوم ہوگا کہ اسے کسی وقت بھی بند رکھنا غیر ممکن ہو جائیگا۔ مذکورہ بالا اصول سے صرف اس عہدے کو مستثنیٰ رکھنا چاہیے جو سب سے اعلیٰ ہے۔ برطانوی ہند کا وائسرائے ایسا شخص ہونا چاہیے جو پوری انگریزی قوم میں سے منتخب ہوا ہو اور جس میں حکومت کرنے کی بہت بڑی عام قابلیت موجود ہو۔ اگر اس میں ایسی قابلیت ہوگی تو وہ دوسروں میں بھی اس کی جانچ کر سکیگا اور انتظامی معاملات میں اس خاص علم اور قوت فیصلہ کو جس کے حاصل کرنے کا خود اسے موقع نہ ملا ہو خاطر خواہ کام میں لا سکیگا۔ اس امر کی معقول وجوہ ہیں کہ وائسرائے کا انتخاب (بجز مستثنیٰ صورتوں کے) مستقل ملازموں میں سے نہیں ہونا چاہیے۔ تمام ملازمتوں میں کم و بیش طبقہ واری تعصبات ہوتے ہیں جن سے اعلیٰ حکمران کو بالاتر رہنا چاہیے۔ علاوہ بریں جو اشخاص ایشیا میں اپنی عمریں گزار چکے ہیں خواہ وہ کیسے ہی قابل و تجربہ کار ہوں ان میں عام تدبر کے متعلق یورپ کے ایسے تازہ ترقی یافتہ خیالات نہیں پائے جا سکتے جنہیں اعلیٰ حکمران اپنے ساتھ لے جا کر تجارب ہند میں شامل کر کے عمدہ نتائج پیدا کریگا۔ مزید براں یہ کہ جب یہ حکمران مختلف طبقے کا ہوگا اور خاصکر اس کا انتخاب مختلف حکومت کی طرف سے ہوگا تو اسے جانب داری سے کام لے کر کسی عہدے پر ناجائز تقرر کرنا نہ پڑیگا۔ یہ بڑی ضمانت جو عہدوں پر جائز تقررات سے متعلق تھی تاج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مشترکہ حکومت میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اعلیٰ مقتدر حکام یعنی گورنر جنرل اور گورنروں کے تقررات جو باضابطہ نہ تھے دراصل تاج کی طرف سے ہوتے تھے یعنی یہ تقررات سلطنت کی عام حکومت کی طرف سے عمل میں آتے تھے نہ کہ درمیانی مجلس کی طرف سے اور تاج کے ایک بڑے

عہدہ دار کو غالباً مقامی ملازمین کے ساتھ کسی قسم کا ذاتی یا سیاسی تعلق نہیں ہوتا تھا حالانکہ
نیا بہی مجلس جس کے اکثر ارکان خود ملک میں ملازم رہ چکے ہوں ایسا تعلق پہلے بھی رکھتی تھی
اور اس کے لیے اب بھی اس تعلق کا امکان ہے۔ غیر جانبداری کی اس ضمانت میں
بہت فرق واقع ہو جائیگا اگر حکومت کے سیول ملازمین کو انہیں لڑکپن میں امیدواران
ملازمت ہی کی حیثیت سے بھیجا جائے زیادہ تر اس طبقے سے منتخب ہونے لگیں
جس سے والیسرایوں اور گورنروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ابتدائی
امتحان مقابلہ بھی کافی ضمانت ثابت نہ ہوگا۔ اس امتحان سے صرف جاہل اور نا اہل
لوگ خارج ہو جائینگے' اس کی وجہ سے خاندانی لڑکے اسی قدر تعلیم و قابلیت کے ساتھ
جس قدر دوسرے لوگوں نے حاصل کی ہو مقابلے میں شرکت پر مجبور ہونگے البتہ نہایت
بیوقوف لڑکا جس طرح ملازمت کلیسا میں بآسانی داخل ہو سکتا ہے اس طرح ملازمت ہند
میں داخل نہ ہو سکیگا' لیکن ایک دفعہ اس کے داخل ہو جانے کے بعد غیر معمولی اثر
کو روکنے کی کوئی صورت باقی نہ رہیگی۔ حاکم مقتدر کو آیندہ جملہ ملازموں سے
یکساں طور پر ناواقفیت نہ رہیگی بلکہ ان ملازموں کی ایک معقول تعداد سے وہ
ذاتی طور پر خوب واقف ہوگا اور اس سے بھی زیادہ تعداد سے اس کے سیاسی
تعلقات ہونگے۔ بعض خاندانوں اور اعلیٰ طبقوں کے افراد نیز با اثر اشخاص
علی العموم اپنے ہمسروں کے مقابلے میں بہت جلد ترقی کر جائینگے اور اکثر یہ ہوگا کہ
وہ ایسے عہدوں پر بھی مامور ہو جائینگے جن کے وہ اہل نہ ہوں یا جن کے لیے ان سے
زیادہ اہل لوگ موجود ہوں۔ اسی قسم کے اثرات فوج میں ترقی حاصل کرنے
کے لیے بھی استعمال کیے جائینگے اور صرف سادہ لوح اشخاص ہی جوان کارروائیوں
کو غیر جانبدارانہ خیال کرینگے ہندوستان میں انصاف کی توقع رکھینگے۔ میرا خیال
ہے کہ یہ نقص موجودہ نظام حکومت کے تحت معمولی تدابیر کے ذریعے ہرگز دور
نہیں ہو سکتا۔ کسی جدید انتظام سے اس قدر اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا جس قدر
اس حکومت کی بدولت جو دو عملی کہلاتی ہے اس وقت تک کسی دقت کے بغیر
حاصل ہو تا رہا ہے۔

انگلستان میں انگریزی نظام حکومت کی جو عظیم الشان خوبی بیان کی جاتی ہے

وہی ہندوستان کے لیے تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ نظام مذکور کی ترقی کسی پیش بندی کے باعث نہیں بلکہ مسلسل تدابیر سے نیز اُن ذرائع کے حسب حال ہونے سے رُو نما ہوئی ہے جو ابتدا میں مختلف اغراض کے لیے مہیا کیے گئے تھے۔ چونکہ انگریزی نظام حکومت کے نشو و نما کا انحصار اس ملک پر نہیں تھا جس کی ضروریات کی بنا پر وہ ترقی پذیر ہوا ہو اس لیے اس ملک کے باشندوں کے دلوں میں اس کے عملی فوائد جاگزیں نہ ہوئے۔۔۔۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی قسمت میں یہی تھا کہ ایک نیم مہذب محکوم ملک پر ایک مہذب ملک کی حکومت کا صحیح نظریہ پیش کرنے کے بعد وہ خود فنا ہو جائے۔ یہ قسمت کی نیرنگی ہوگی اگر یہ خیالی نتیجہ اور دو تین پشت کے بعد ہندوستان پر ہمارے تسلط کا واحد ثمرہ بن کر رہ جائے اور ہمارے متعلق آنے والی نسلیں یہ کہیں کہ حسن اتفاق سے ہم نے حکومت کا ایسا بہتر انتظام کیا تھا جس تک ہماری عقلیں رہبری نہ کر سکتی تھیں مگر بیداری کے بعد ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس انتظام کو درہم برہم کر دیا اور جس بہبودی کے حاصل ہونے کی توقع کی جا رہی تھی اسے ہم نے اُن اصول کی ناواقفیت کے باعث جن پر اُس کا انحصار تھا معدوم ہو جانے دیا۔

یہ غیر ضروری ہے کہ اُن تین قوانین پر مفصل بحث کی جائے جو ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کی بہتر حکومت کے لیے مرتب ہوئے تھے۔ ہماری غرض کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ لارڈ ڈربی کی حکومت نے ہر دو جماعت کے اکثر سیاست دانوں کی رضامندی سے جو تیسرا اور آخری قانون منظور کیا تھا اس کی زیادہ اہم دفعات پیش کر دیں۔ ہم نے ذیل میں جان برائٹ کی اُس تقریر کا ایک حصہ بھی درج کر دیا ہے جس میں اس نے کسی قدر غیر رسمی مگر ایسے دلچسپ سیاسی مسلک کا اظہار کیا ہے جو ہندوستانی طریق حکومت کی ترقی کا باعث ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی حکومت کے متعلق ہماری	* ہندوستان کی آیندہ حکومت

*Source.— Speech of John Bright in the House of Commons, June 24, 1858. (Hansard.)

جو خواہش ہے اسے عام بول چال میں یوں کہینگے کہ اس "پر تھوڑی سی اور روشنی" ڈالی جائے۔ ہم حکومت میں زیادہ سادگی اور زیادہ ذمہ داری چاہتے ہیں۔ میں نے اس تجویز پر جو وزیر مال (ڈسرائیلی) نے ابتدا میں پیش کی تھی اس لیے اعتراض کیا تھا کہ اس میں صفات مذکورہ موجود نہ تھیں۔ یہ تجویز اس نظام حکومت سے جسے ہم ختم کر دینا چاہتے تھے اس قدر قریبی مشابہت رکھتی تھی کہ میں اس کی تائید کے لیے آمادہ نہ ہو سکا۔

میں یہ تجویز پیش کرونگا کہ ہندوستان میں مرکزی حکومت اور اس کے لیے ایک گورنر جنرل برقرار رکھنے کی بجائے ہم دونوں کو ختم کر دیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے عوض ہم احاطے قائم کر دیں۔ اگر میں وزیر ہوتا (اس مفروضے کو دارالعوام ایک بے لطف صنعت کلام کے طور پر تسلیم کریگا) اور اگر دارالعوام کو مجھ سے اتفاق ہوتا (یہ بھی ایک ضروری امر ہے) تو میں ہندوستان میں کم از کم پانچ احاطوں کے قیام کی تجویز کرتا اور ان احاطوں کی حکومتوں کو رتبے اور مناصب میں بالکل یکساں رکھتا۔ ان احاطوں کے صدر مقامات غالباً کلکتہ، مدراس، بمبئی، آگرہ اور لاہور قرار پاتے۔ میں احاطۂ مدراس کو بطور مثال پیش کرونگا۔ مدراس کی آبادی تقریباً دو کروڑ ہے۔ ہم سب کو نقشے پر اس کا محل وقوع معلوم ہے۔ اسے دیگر احاطوں کے مقابلے میں جغرافی حدود کے اعتبار سے زیادہ ترکیجا وپیوستہ ہونے کا وصف حاصل ہے۔ اس کے لیے ایک گورنر اور ایک مجلس ہے۔ میں بھی اس پر ایک گورنر اور ایک مجلس مقرر کرونگا لیکن ان کے جملہ فرائض کو احاطۂ مدراس ہی تک محدود رکھونگا اور میں مدراس کے ساتھ اس طرح مراسلت کرونگا کہ گویا مدراس ہی ہندوستان کا واحد خطہ ہے جو اس ملک (یعنی انگلستان) سے متعلق ہے۔ میں اس کے مالیات، اس کے محاصل، اس کی عدالت، اس کی پولس نیز اس کے امور عامہ اور فوج کے محکموں کو اس حیثیت سے رکھونگا کہ گویا وہ ایک ریاست ہے جو ہندوستان کے کسی دوسرے حصے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور انگلستان کی محض تابع تسلیم کی جاتی ہے۔ میں یہ تجویز پیش کرونگا کہ ہر احاطے کی حکومت انگلستان کے وزیر ہند سے مراسلت کرے اور ہندوستان میں جملہ احاطوں

کے درمیان سلسلۂ تار برقی قائم ہو کیونکہ میں معزز لارڈ (لارڈ اسٹانلی) کے دفتر اور ہر اُس احاطے کے درمیان جس کے وہ صدر ہیں بہت جلد سلسلۂ تار برقی کے دیکھنے کی توقع رکھتا ہوں۔ بے شبہہ مجھ سے یہ کہا جائیگا کہ اس قسم کے انتظام میں لاینحل دشواریاں حائل ہیں اور مجھے یقین ہے کہ فوجی دشواری کا تذکرہ ضرور کیا جائیگا۔ اس وقت میں فوجی معاملات میں ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ فوجی اشخاص اکثر بڑی غلطیاں کیا کرتے ہیں۔ میں فوج کو اس طرح منقسم کر دونگا کہ ہر احاطے کی ایک خاص فوج ہو گی جیسی اب ہے البتہ یہ احتیاط کی جائیگی کہ یہ فوجیں الگ الگ رہیں اور مجھے بوقت ضرورت ان تمام فوجوں کو حکومت کے منشا کی تعمیل کے لیے اکٹھا کرنے میں کسی قسم کی پیچیدگی یا غلط فہمی کا کوئی اندیشہ نہیں معلوم ہوتا۔ صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے جسے ذہن نشین رکھنا ضروری ہے اور وہ مسئلہ ہندوستان کی مجلسوں سے متعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر احاطے کے گورنر کے لیے ایک معاون مجلس ہونی چاہیے لیکن ان سب مجلسوں کی ہیئت ترکیبی موجودہ صورت سے مختلف ہو گی۔ میں ایک ایسی مجلس چاہتا ہوں جس کی کارروائی راز میں نہ رہے۔ معزز لارڈ نمایندۂ لندن (یعنی لارڈ جان رسل) نے ایک رات کو بعض جملے ایسے استعمال کیے تھے جن سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کی سیول سروس کے انتظام کو اس کی ساری خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس مسئلے میں مجھے معزز لارڈ سے قطعی اختلاف ہے۔ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ احاطوں کی حکومت احاطوں کے باشندوں کے لیے ہو اور یہ حکومت تاج کے سیول ملازموں کے لیے نہیں بلکہ انگلستان کے اُن غیر سرکاری تجارتی طبقوں کے لیے جو وہاں بس گئے ہیں نیز ہر احاطے کے دو یا تین کروڑ باشندوں کے لیے ہو۔

اب فرض کیجئے کہ گورنر جنرل کا عہدہ باقی نہیں رہا، احاطے قائم ہو گئے، تمام گورنر عہدے اور رتبے کے لحاظ سے مساوی ہیں اور میرے بیان کردہ طریقے کے مطابق ان کی مجلسیں بھی قائم ہو گئی ہیں تو کیا یہ فرض کرنا

بعید از عقل ہوگا کہ تعویق جواب تک آپ کی ہندوستانی حکومتوں کے حق میں ایک بہت بڑی لعنت سمجھی گئی ہے تقریباً پوری طرح معدوم ہو جائیگی۔ کلکتہ یا شملہ میں ایک گورنر جنرل رہنے کی بجائے جو کبھی سارے ملک کا دورہ نہ کرتا ہو، ملک کے متعلق جس کا علم بہت محدود ہو اور وہ تھوڑا سا علم بھی دیگر سرکاری ذرائع کی بدولت حاصل ہو کیا یہ خیال معقول نہ ہوگا کہ حکومت، مذکور بالا صورت میں اس نظام کی بہ نسبت جواب تک جاری وساری ہے اپنے تمام فرائض اور تمام شعبہ ہائے ملازمت میں زیادہ تر براہ راست کار فرما رہیگی؟ آپ کے شعبۂ عدالت کا نظم ونسق جو بہت زیادہ بدنام ہے اس حالت میں ہرگز زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکتا تھا اگر آپ کے احاطوں کے گورنر مختار ہوتے۔ یہی حالت پولس، تعلیم، امور عامہ اور ہر اس شے کی ہے جو صنعت وحرفت کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے اور یہی حالت آپ کے انتظام محاصل کی ہے۔ اب آپ ہر احاطے میں خوش انتظامی کے لیے مسلسل رقابت دیکھینگے۔ مدراس کا گورنر جب اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگا تو وہ مسرت کے ساتھ ان امور کا اظہار کریگا کہ اس کے احاطے کے باشندے آسودہ حال ہیں سارے احاطے میں تہذیب وتمدن ترقی پذیر ہے سڑکیں اور رفاہ عام کی صورتیں بڑھتی جا رہی ہیں، لوگوں میں صنعت وحرفت کی طرف زیادہ توجہ ہو رہی ہے اور درآمد وبرآمد میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی قسم کے جذبات بمبئی اور باقی احاطوں کے گورنروں پر بھی غالب رہینگے اور اس طرح آپ سارے ہندوستان میں جیسا کہ میں نے پیشتر بھی کہا ہے خوش انتظامی کے لیے رقابت دیکھینگے۔ ہوا وہوس کے اس شدید جذبے کا آپ سدباب کر دینگے جس نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ کوئی گورنر اس قدر قوی نہ ہوگا کہ آپ کے قابو سے باہر ہو جائے اور نہ کسی میں اتنی طاقت ہوگی کہ جب چاہے لڑائی چھیڑ دے۔ جنگ اور کسی علاقے کے الحاق کی موقوفی اگر کلیتہً عمل میں نہ آئے تو بڑی حد تک یہ دونوں چیزیں ضرور رک جائینگی اور میں اپنے ایقان کی بنا پر کہتا ہوں کہ آپ ہندوستان

کے لیے ایک ایسی بہتر اور پائیدار حکومت کی بنیاد ڈال دینگے جو اسے انگلستان کے زیر اقتدار آنے کے بعد سے اب تک حاصل نہیں ہوئی ہے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان کے معاملے میں میری ذاتی تجویز یا معزز لارڈ (لارڈ اسٹانلی) کی تجویز کے متعلق محض حکومت کے کل پرزے کافی نہیں ہیں۔ ہمیں اہلکاروں دفتر کی ضروری چیزوں اور مراسلوں کے علاوہ کچھ اور بھی درکار ہے۔ ہم جو چیز چاہتے ہیں اسے ہیں انگلستان کے لیے ایک نیا جذبہ اور ہندوستان کے لیے ایک بالکل نیا سیاسی مسلک کہو نگا۔ ہندوستان پر ہماری حکومت آیندہ مٹھی بھر انگریزوں کے لیے ہونی چاہیے نہ سیول ملازموں کے لیے جن کی تعریف کے گیت اس ایوان میں ہمیشہ سے جاتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ ہندوستان پر انگلستان کی فلاح کے لیے حکومت کریں لیکن فلاح انگلستان فلاح ہند کی راہوں سے حاصل ہونی چاہیے۔ ہندوستان سے ہمارا جو تعلق ہے اس سے متمتع ہونے کے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کو لوٹا جائے اور دوسرا یہ کہ ان کے ساتھ تجارت کی جائے۔ میں ان کے ساتھ تجارت کرکے فائدہ اٹھانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن تجارت کے ذریعے ہندوستان سے انگلستان کو مالدار بنانا ہے تو خود ہندوستان کو بھی مالدار ہونا چاہیے اور ہندوستان صرف اسی وقت مالدار ہو سکتا ہے جبکہ دیانت کے ساتھ عدل گستری عمل میں آئے اور جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے۔

* * * * * *

اب غالباً مجھ سے یہ کہا جائیگا کہ میں عجیب و غریب امور پیش کر رہا ہوں جو کسی طرح بھی حکومت کی عام روش کے مطابق نہیں۔ اسے میں تسلیم کرتا ہوں مگر ہم اب ایسی حالت پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمیں اس عام روش سے علحدگی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر ملک کی تاریخ میں افراد کی زندگیوں کی طرح ایسے حالات اور مواقع پیش آتے ہیں جہاں ہمت اور عمل کے ذریعے مشکلات سے نجات کلی حاصل ہوتی ہے اور اب میرے خیال میں تاج انگلستان کو ذمہ دار وزرا کے

مشورے پر کار بند ہو کر ایک ایسا زبردست وغیر معمولی طریق عمل اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ پریشانی رفع ہو جائے جو سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے لوگ ہمیں پسند نہیں کرتے لیکن ہم انہیں چھوڑ دیں تو وہ یہ نہیں جان سکتے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ ان کی حالت ایسی بھیڑوں کی مانند ہوگی جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں آپ نے مغلوب کر لیا ہے۔ آپ پر ان کے زبردست حقوق ہیں جنہیں آپ فراموش نہیں کر سکتے اور اگر آپ ان حقوق سے بے اعتنائی برتیں تو یقین جانیے کہ افراد کی طرح اگر اقوام پر کوئی عدالت مقرر ہوا اور میرا عقیدہ ہے کہ ضرور ہوگی تو زمانۂ قریب میں ہماری آنے والی نسلیں لازماً اس کوتاہی کا خمیازہ بھگتینگی جو ہندوستان کے باشندوں سے متعلق فرائض کی انجام دہی میں ہم سے سرزد ہوئی ہے۔

اس مسئلے پر میں نے اپنے خیالات دو آراجس طریقے پر ظاہر کیے ہیں اس سے میں سمجھتا ہوں کہ مسئلے کا پورا حق ادا نہیں ہوا۔ مجھے اس کے متعلق غور کرنے میں وقت محسوس ہوئی ہے اور اب اس پر تقریر کرنے میں بھی دقت محسوس ہو رہی ہے کیونکہ یہ مسئلہ اس قدر وسیع ہے کہ ایک شخص ایک معمولی تقریر کے دوران میں اس کے تمام پہلوؤں پر خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا خواہ وہ سیاسی مسائل پر غور و خوض اور بحث و تحیص کرنے کا کتنا ہی عادی کیوں نہ ہو۔

سارے ہندوستان میں اب جو خطرناک شورش پھیلی ہوئی ہے اسے رفع کرنے کے لیے اور جو لوگ آپ کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں ان کی اطاعت حاصل کرنے کے لیے میرے نزدیک جن فوری تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے انہیں میں نے بیان کر دیا ہے۔ اب میں نہایت صدق دل کے ساتھ اپنے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ایک مزید فوج کی فراہمی کے عوض تدابیر مذکورہ کے اعلان سے امن وامان کی بحالی میں زیادہ مدد ملیگی اور انھیں تدابیر کو کامل طور پر دیانت کے ساتھ بروئے عمل لانے سے آپ ہندوستان میں اپنی قوت برقرار رکھ سکینگے۔ میں نے اس حکومت کا خاکہ پیش کر دیا ہے جس کی بنا پر میں ہندوستان کے نظم ونسق کو کامل ذمہ دار اور

ترقی پذیر بنانا چاہتا ہوں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس قسم کی حکومت صرف جزوی طور پر حاصل ہو سکتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ جس حکومت کا خاکہ میں نے پیش کیا ہے وہ اُن اغلاط اور قبائح سے بری ہو گی جو آپ کی گزشتہ حکومت ہند میں نمایاں رہی ہیں اور جن سے آپ کی بدنامی ہوئی ہے۔ میں نے اس اہم و سنجیدہ مسئلے پر بہت غور و خوض کیا ہے۔ میں ایوان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلے پر نہ صرف اب اس مسودۂ قانون کی منظوری کے دوران ہی میں غور کرے بلکہ اس اجلاس کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنے آئیندہ سال کے اجلاس تک غور کرتا رہے جبکہ اس موضوع عظیم سے متعلق مزید قوانین ضرور وضع ہونگے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اس مسئلے کے حل پر اس ملک انگلستان کی جس کے ہم باشندے ہیں اور جس سے ہم سب کو بہت محبت و اُنس ہے آئیندہ بھلائی یا بُرائی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ مشرقی میدانوں میں آپ اپنی فوجی قابلیت کی بہت دھوم مچا چکے ہیں اور اس کا کافی ثمرہ بھی آپ نے حاصل کر لیا ہے خواہ وہ قابل قدر ہو یا نہ ہو۔ اب میں اس سے بہتر بلند تر اور مقدس تر شئے کی جانب آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو اُس شان و شوکت کی طرف مدعو کرتا ہوں جو فتح و ظفر کے سُرخ بازوؤں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس کی بنیاد اُن ٹھوس اور مستقل فوائد پر قائم ہوتی ہے جن کی نسبت مجھے یقین ہے کہ اگر انگلستان کی پارلیمنٹ چاہے تو وہ ہندوستان کی بے شمار آبادی کو ان سے متمتع کر سکتی ہے۔

* ہندوستان زیر حکومت تاج

۱۔ تاج کو حکومت کی منتقلی: جو علاقے اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں ہیں یا اس کی حکومت کے تحت ہیں ان سب کی حکومت اور اس حکومت سے متعلق جملہ اختیارات جو من جانب ملکۂ معظمہ کمپنی مذکور کو حاصل ہیں یا جنہیں وہ استعمال کرتی ہے آئیندہ کمپنی

*Source.— Government of India Act, 1858.

کو حاصل رہینگے نہ وہ ان کا استعمال کر سکیگی۔

نیز وہ تمام علاقے جو کمپنی مذکور کے قبضے میں ہیں یا اس کی حکومت کے تحت ہیں اور ان علاقوں کے متعلق جملہ حقوق جو قانون ہذا کی نامنظوری کی صورت میں کمپنی مذکور کو حاصل رہتے یا جنہیں وہ کام میں لاسکتی تھی اب ملکۂ معظمہ کے تفویض کیے جاتے ہیں اور ممدوحہ کے نام سے انہیں استعمال کیا جائیگا۔

۳۔ وزیر ہند: ملکۂ معظمہ کے خاص وزیروں میں سے ایک وزیر کو بجز اس صورت کے کہ قانون ہذا میں کوئی نیا انتظام کیا جائے وہ تمام اختیارات حاصل رہینگے اور ان تمام فرائض کو وہ انجام دیگا جو ہندوستان کی حکومت یا محاصل سے کسی طرح بھی متعلق ہوں اور قانون ہذا کے تحت جو عہدہ دار مقرر ہوں یا برقرار رہیں ان سب پر اسے وہ جملہ اختیارات حاصل رہینگے جو الیسٹ انڈیا کمپنی یا مجلس نظما یا کمپنی مذکور کی مجلس سرمایہ دار ان تنہا یا مامورین برائے معاملات ہند کی ہدایت یا ان کی منظوری یا رضا مندی کے ساتھ استعمال کرتی تھی اور جن کا تعلق ہندوستان کی حکومت یا محاصل سے اور کمپنی مذکور کے عہدہ داروں اور ملازموں سے تھا نیز اسے وہ تمام اختیارات حاصل رہینگے جو محض مامورین مذکور استعمال کر سکتے تھے۔

۷۔ مجلس ہند: قانون ہذا کی اغراض کے لیے ایک مجلس کا قیام عمل میں آئیگا جو پندرہ ارکان پر مشتمل ہوگی اور اس مجلس کا نام مجلس ہند ہوگا۔ ...

۱۰۔ ارکان مجلس کی زیادہ تعداد کے لیے سکونت ہند کی لازمی شرط: جو اشخاص مجلس نظما کی طرف سے منتخب ہوں اور جو اشخاص قانون ہذا کے نفاذ کے بعد ملکۂ معظمہ کی طرف سے پہلے پہل بہ حیثیت ارکان مجلس مقرر رہوں ان کی زیادہ تعداد ایسے اشخاص کی ہوگی جو ہندوستان میں کم از کم دس سال تک ملازمت کر چکے ہوں یا سکونت پذیر رہے ہوں اور تاریخ تقرر سے قبل انہیں ہندوستان چھوڑے ہوئے دس سال سے زائد نہ گزرے ہوں۔

۱۹۔ مجلس کے فرائض: یہ مجلس وزیر ہند کی ہدایت اور قانون ہذا کی شرائط کے تحت ان امور کے اجرا کا انتظام کریگی جو سلطنت متحدہ (برطانیۂ عظمیٰ) میں ہندوستان کی حکومت اور اس کی مراسلت کے متعلق طے پائیں لیکن ہر حکم

یا مراسلے پر جو ہندوستان بھیجا جائے خاص وزیروں میں سے کسی نہ کسی کے دستخط ثبت ہونے لازم ہیں اور اس صورت کے سوا جو قانون ہذا میں صراحتاً بیان کی گئی ہو ہندوستان کی حکومت سے متعلق سلطنت متحدہ (برطانیہ عظمیٰ) کے ہر حکم پر قانون ہذا کے تحت وزیر مذکور کے دستخط لازماً ثبت ہونگے، اور ہندوستان کی حکومتوں اور احاطوں کی طرف سے جملہ مراسلات اور ہندوستان کے دیگر مراسلات جو قانون ہذا کے نافذ نہ ہونے کی صورت میں مجلس نظما یا اس کی مجلس راز کے نام موسوم ہوتے تھے اب اس وزیر کے نام موسوم ہونگے۔

۲۴۔ طریق کار: ہر حکم یا مراسلہ جسے ہندوستان بھیجنے کی تجویز کی گئی ہو اور سلطنت متحدہ کے اندر قانون ہذا کے تحت وزیر ہند کا ہر حکم جس کا جاری ہونا قرار پایا ہو اگر مجلس کے اجلاس میں پیش نہ کیا گیا ہو تو اس کی روانگی یا اجرا سے قبل تمام ارکان مجلس کے ملاحظے کے واسطے مجلس کے کمرے میں سات روز تک رکھا جائیگا بجز اُن صورتوں کے جو بعد کو مذکور ہونگی اور ہر رکن مجلس کے لیے یہ قانوناً جائز ہوگا کہ مذکورہ بالا ہر حکم یا مراسلے کے متعلق اپنی رائے ایک کتاب الرائے میں جو اسی غرض کے لیے رکھی جائیگی درج کرے اور ہر ایسی درج شدہ رائے کی ایک نقل بہت جلد وزیر ہند کے پاس بھیجی جائیگی۔

۲۵۔ وزیر ہند کے خاص اختیارات: اگر وزیر ہند کے کسی مجوزہ امر کے خلاف ارکان مجلس کی زیادہ تعداد اپنی آرا کا حسب بیان بالا اندراج کرے اور وزیر ہند کو غلبۂ آرا سے اتفاق نہ ہو تو وہ اس کے خلاف عمل کرنے کی نسبت اپنی وجوہ قلمبند کریگا۔

۲۶۔ اشد ضروری کارروائیاں: بشرطیکہ جہاں وزیر ہند کو یہ معلوم ہو کہ کسی مراسلے کی روانگی یا ایسے حکم کا اجرا جس کے لیئے مجلس کے اجلاس میں غلبۂ آرا لازم نہیں ہے فوری درکار ہے تو مراسلہ بھیجا جا سکتا ہے یا حکم نافذ کیا جا سکتا ہے بغیر اس کے کہ اس مراسلے یا حکم کو مجلس کے کسی اجلاس میں پیش کیا جائے

یا سات روز تک اسے رکھا جائے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے۔ اس مراسلے یا حکم کی روانگی یا اجرا کی ناگزیر وجوہ وزیر ہند ضبط تحریر میں لائیگا اور ہر رکن مجلس کو ان وجوہ کی اطلاع دی جائیگی بجز ان حالات کے جو آیندہ معرضِ تحریر میں آئینگے۔

۲۷۔ راز کی کارروائیاں: نیز بشرطیکہ کوئی حکم جس کے لیے مجلس کے اجلاس میں غلبۂ آرا لازم نہیں ہے اور جو قانون ہذا کے نافذ نہ ہونے کی صورت میں من جانب مامورین برائے معاملات ہند مجلس نظما کی مجلس راز کے توسط سے ہندوستان کی حکومتوں یا احاطوں یا کمپنی مذکور کے عہدہ داروں یا ملازموں کو بھیجا جا سکتا تھا قانون ہذا کے نفاذ کے بعد اُن حکومتوں یا احاطوں یا ہندوستان کے عہدہ داروں یا ملازموں کو وزیر ہند کی طرف سے بھیجا جا سکتا ہے بغیر اس کے کہ اس حکم کو مجلس کے اجلاس میں پیش کیا جائے یا ارکان مجلس کے ملاحظے کے واسطے رکھا جائے اور بغیر اس کے کہ وجوہ قلمبند کی جائیں یا حسب بیان بالا کوئی اطلاع نامہ جاری کیا جائے۔

۲۹۔ انگلستان میں تقررات: ہندوستان کے گورنر جنرل اور احاطوں کے گورنروں کا تقرر جو اب مجلس نظما کی جانب سے ملکۂ معظمہ کی منظوری کے ساتھ کیا جاتا ہے اور مختلف احاطوں کے لیے ایڈوکیٹ جنرل کا تقرر جو مامورین برائے معاملات ہند کی رضامندی سے عمل میں آتا ہے آیندہ من جانب ملکۂ معظمہ شاہی مہر و دستخط کے ساتھ ہوا کریگا۔

صوبوں یا علاقوں کے لفٹیننٹ گورنروں کا تقرر ہندوستان کا گورنر جنرل ملکۂ معظمہ کے ایما سے کریگا اور یہ تمام تقررات اُن شرائط قابلیت پر منحصر ہونگے جو اب قانون کی رُو سے اس قسم کے عہدوں کے لیے ضروری متصور ہوں۔

۳۰۔ ہندوستان میں تقررات: ہندوستان میں عہدوں، فوجی خدمتوں اور دیگر ملازمتوں کی ساری ماموریاں نیز تمام ترقیاں جو اب قانون کی رُو سے یا کسی ضابطے، عملدرآمد یا رسم و رواج کی بنا پر ہندوستان کے کسی حاکم مجاز کی طرف سے عمل میں آ رہی ہیں آیندہ بھی ہندوستان میں

ایسے ہی حاکم کے ذریعے انھیں شرائط قابلیت، قیود اور حدود کے تحت ہوتی رہینگی جواب اس قسم کے تقررات کے لیے ناگزیر ہیں۔

۳۲۔ ہندوستان کی سیول سروس میں داخلہ: قانون ہذا کے نافذ ہو جانے کے بعد حتی الامکان عجلت سے وزیر ہند باجلاس کونسل سرورست ماموریں برائے معاملات ہند کے مشورے اور مدد کے ساتھ ملکۂ معظمہ کے حکم باجلاس کونسل مصدرۂ ۲۱ مئی ۱۸۵۵ء کی تعمیل میں ضوابط اس غرض سے مرتب کریگا کہ تاج کی سیول سروس میں اشخاص کے داخلے کا باقاعدہ انتظام عمل میں آئے اور ملکۂ معظمہ کی ملک ثرۂ اور رعایا میں سے ایسے تمام اشخاص کو (ایسی عمر اور قابلیت کی بنا پر جس کا اس خصوص میں تعین ہو) تسلیم کیا جائے جنہیں ہندوستانی سیول سروس کے عہدوں کے امیدوار بننے کی خواہش ہو اور جن کا بہ حیثیت امیدوار امتحان لیا جائے نیز علوم کے وہ شعبے جن میں ان امیدواروں کا امتحان لینا ضروری ہوگا مقرر کیے جائیں اور علی العموم اس طرح کے امتحانات کا انتظام و انعقاد آخری مذکورِ بالا ماموریں یا ایسے قابل اعتماد شخص کے زیر نگرانی کیا جائے جو فی الوقت اُن ضوابط کو بروئے عمل لاتا ہو جنہیں ملکۂ معظمہ کی طرف سے تاج کی سیول سروس کی ادنیٰ خدمات کے تقررات سے متعلق امتحان، صداقت نامے یا اہلیت کی دیگر آزمائش کے بارے میں وقتاً فوقتاً نافذ کیا جائے۔ جن امیدواروں کی نسبت ماموریں مذکور یا مذکورِ بالا دیگر اشخاص یہ تصدیق کر دیں کہ اس قسم کے ضوابط کے تحت وہ مستحق خدمات ہو سکتے ہیں تو ان کے اُس معیار قابلیت کے مطابق جو امتحان سے ظاہر ہوا ہے ان کے تقرر کی سفارش کی جائیگی اور وزیر ہند باجلاس کونسل کی جانب سے صرف ایسے ہی اشخاص کا جن کی حسب بالا تصدیق ہو چکی ہو ہندوستان کی سیول سروس میں داخلہ یا تقرر ہوا کریگا۔

۴۱۔ محاصل ہند پر وزیر ہند کی نگرانی: ہند اور بیرون ہند میں محاصل ہند کا صرف وزیر ہند باجلاس کونسل کے زیر نگرانی رہے گا اور کونسل کے اجلاس میں غلبۂ آرا کے بغیر ایسے محاصل کے یا کسی اور جائداد کے جو قانون ہذا کی رُو سے وزیر ہند باجلاس کونسل کے قبضے میں آوے کسی حصے کا عطیہ یا تخصیص نہیں کی جائیگی۔

۵۳۔ پارلیمنٹ میں حساب کی سالانہ پیش کشی: ہر سال یکم مئی کے بعد

ابتدائی چودہ یوم کے اندر جبکہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا ہو وزیر ہند باجلاس کونسل پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے محاصل ہند کی سالانہ آمدنی کا حساب اُس مالی سال کی بابت پیش کریگا جو آخری ختم شدہ سال کے ماقبل ہو اور اس حساب میں مختلف احاطوں یا حکومتوں کے لحاظ سے مدات متعلقہ کی تفریق ہوگی نیز انگلستان و بیرون انگلستان میں حکومت ہند سے متعلق کل سالانہ جمع وخرچ کا حساب مدات متعلقہ کی تفریق کے ساتھ بنایا جائیگا اور اس میں گزشتہ مالی سال کے حساب کا جدید ترین موازنہ' قرضے کی رقوم جو محاصل ہند پر عائد ہوتی ہیں' ان رقوم میں سے ہر ایک کی شرح سود' اس سود کی سالانہ رقم' ہر احاطے یا حکومت کے اثاثے اور قرضے کی حالت' اسے اُن تازہ ترین ہدایات کے مطابق جو اس بارے میں وصول ہوئی ہوں انگلستان یا بیرون انگلستان میں حکومت ہند کی اغراض کے لیے کام میں لانے کی کیفیت نیز وزیر ہند باجلاس کونسل کے عملے کی فہرست اور اس عملے کے اشخاص کے مشاہرے اور بھتے جو ان کے مدارج کے لحاظ سے واجب الادا ہوں یہ سب امور مذکور ہونگے' اور اگر سالانہ پچاس پونڈ یا زائد کے جدید یا اضافہ شدہ مشاہرے یا وظیفے ایک سال کے اندر منظور یا از سرِ نو مقرر کیے گئے ہوں تو ایسے ہر سال کے حساب کے ذیل میں شرح و بسط کے ساتھ ان کی تفصیلات خاص طور پر درج کی جائینگی نیز اس حساب کے ساتھ ہندوستان کے ہر احاطے وضلع کی تفصیلی رُوداد وں سے ایک تختۂ کیفیت مرتب کرکے ایسی شکل میں رکھا جائیگا جو ہندوستان کے ہر احاطے کی اخلاقی و مادی ترقی اور عام حالت کی بہترین مظہر ہو۔

۵۵۔ محاصل ہند واقعی حملے کی مدافعت کے سوا بیرونِ ہند کی فوجی کارروائیوں کے لیے استعمال نہ ہونگے:۔ ملکۂ معظمہ کے ہندوستانی مقبوضات پر واقعی حملے کی روک تھام یا اس کی مدافعت کے سوا یا دیگر ناگہانی وشدید ضرورت کے تحت محاصل ہند پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی رضامندی کے بغیر کسی ایسی فوجی کارروائی کے عائد کردہ مصارف پورے کرنے کے لیے استعمال نہ ہونگے جو مقبوضاتِ مذکور کی سرحد سے باہر افواج ملکۂ معظمہ کی طرف سے عمل میں آئے۔

تمت